بھارت کے پہلے مسلمان چیف الیکشن کمشنر کی انتخابی عمل پر چشم کشا گفتگو...۸۲

اُردو ڈائجسٹ

مارچ 2015ء

www.urdudigest.pk • urdudigest.com

کھیلوں سے کھلواڑ
۱۳۴

قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر
پیپلز پارٹی کے راہنما
سید خورشید شاہ
کا اچھوتا انٹرویو

مڈل کلاس کے سیاست دان
کی ہوشربا کامرانی کے راز

PDFBOOKSFREE.PK

"پی کے" فلم کو کیا
چیز لے ڈوبی؟ ۳۲

انسانی دماغ
کے اسرار ۹۷

موٹاپا ختم کرنے
والی دس غذائیں ۹۷

325-G-III

Full Circulation: ALL PAKISTAN + OVERSEAS 100,000*

Back Cover Title	50,000 Monthly
Back Cover Inside	35,000 Monthly
Title Inside	35,000 Monthly
Full Page Color Inside	25,000 Monthly

Full Page	15,000 Monthly
Half Page	7,500 Monthly

Title Banner	25,000 Monthly
Side Banner	30,000 Monthly
Pop Up	20,000 Monthly

Govt Rate applied approved by PID

- Print Plus Digital

Technical Data

Full Page
18 x 14 cm
Half Page
9 x 14 cm
Column
3

Mode of Payment

Payment By Cash TT or Bank Draft in favour of Urdu Digest
Through Bank of Punjab Branch
Samnabad Branch code 0110
Account No 110-800380
or Online payment on mentioned account detail

For more Information Contact us Any time: 0300-4005579

Note: Ads Should be Delivered before18th of every month

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

داخلہ جماعت دوم تا ہشتم (انگلش میڈیم)

کیڈٹ ساز تعلیمی و تربیتی ادارہ

مثالی پبلک مڈل سکول دین پور مظفر گڑھ

"جمیل اکیڈمی ملتان" اپنے کامیاب تعارف اور شاندار تعلیمی نتائج کے بعد مثالی پبلک مڈل سکول دین پور مظفر گڑھ کی حیثیت سے اپنے سابقہ تجربات اور ماضی کی قابل فخر روایات کے ساتھ تعمیر ملت اور نسل نو کی کردار سازی کے لیے کوشاں ہے۔ تعلیم بچے کا بنیادی حق ہے اور ہم یہ حق حتی الوسع بھرپور لگن کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ کھیلوں اور نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ بچوں کی ہمہ گیر تربیت اور تعمیر سیرت کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ ادارہ اسلام کی روایات کا علمبردار، نظریہ پاکستان کا محافظ اور طلبہ کے مستقبل کا ضامن ہے۔ اپنے ہونہار بچوں کی ذہنی، جسمانی، جذباتی، اخلاقی نشوونما اور ان کی خداداد صلاحیتوں کو نکھارنے کی خاطر اپنے اس قابل اعتماد کیڈٹ ساز ادارے کا انتخاب کیجئے۔ ہمارے کیڈٹ ساز ادارے کا داخلہ طلبہ کے لیے اعزاز اور والدین کے لیے اطمینان کا باعث ہے۔ کیونکہ ہم تعمیر ملت کے لیے ہر دم کوشاں ہیں۔

پروگرام داخلہ 2015ء

داخلہ ٹیسٹ برائے جماعت دوم تا ہشتم (تیاری کیڈٹ کالجز) 12 اپریل 2015 صبح 10 بجے

نوٹ:۔ داخلہ میرٹ کی بنیاد پر ہوگا۔

پرنسپل: مثالی پبلک مڈل سکول دین پور مظفر گڑھ 0662-551126,27,28

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بنا سپتی

نعمت

Nemat@xpert.net.pk
www.salva.com.pk

ISO 9001:2000 CERTIFIED

Pakistan Standards

مارچ 2015ء

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

JOIN OUR FACEBOOK PAGE FOR MORE EXCITEMENT

Pakistan Standard

Facebook.com/KausarCookingOils

Every time you purchase our products **Kausar** will donate per kg/ltr to Shaukat Khanum Memorial Cancer Hospital & Research Centre

http://www.bookstube.net/

http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

آداب

''اے ایمان والو! تمھارے غلام، لونڈیاں اور جو بچے تم میں سے بالغ نہیں ہوئے، تین وقت تم سے اجازت لے کر (تمھارے یعنی میاں بیوی کے پاس) آئیں۔ فجر کی نماز سے پہلے اور دوپہر میں جب تم اپنے کپڑے اُتار رکھتے ہو اور نمازِ عشا کے بعد۔ یہ تین وقت تمھاری شرم کے ہیں۔ ان اوقات کے بعد تم پر یا ان پر کچھ گناہ نہیں کہ ایک دوسرے کے پاس (کام کاج کے لیے) آتے جاتے رہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔ اور جب تمھارے لڑکے بالغ ہو جائیں، تو وہ بھی (تمام اوقات میں) اسی طرح اجازت لیں جس طرح اُن سے اگلے یعنی (یعنی ان سے بڑے) اجازت لیتے رہے۔'' (سورۃ النور۔ آیت: ۵۸،۵۹)

رسول ﷺ کا فرمان

ایمان کی مٹھاس کون پائے گا؟

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص میں ۳ خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پالے گا:

(۱) وہ جسے اللہ اور رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ محبوب ہوں۔

(۲) وہ جو اگر کسی شخص سے محبت کرے، تو محض اللہ کے لیے کرے۔ (کسی اور غرض سے نہ کرے)

(۳) وہ جسے کفر کی حالت کی طرف واپس لوٹنا اتنا ناپسند اور تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔''

(صحیح بخاری کتاب: ۲۔ باب ۹: مسلم کتاب الایمان۔ باب ۱۵)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اخوت

Buy a Brick & Build a University

اخوت دنیا میں بلاسود قرضوں کا سب سے بڑا پروگرام ہے (الحمدللہ)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر قرض بلاسود ہو سکتا ہے تو تعلیم بھی بغیر فیس کے ہو سکتی ہے۔ اخوت یونی ورسٹی میں مستحق خاندانوں کے باصلاحیت بچے پڑھیں گے۔ آپ بھی ایک اینٹ خرید کر یونی ورسٹی کے بانیوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ایک اینٹ کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ آپ ایک' دو' دس' بیس' سو' ہزار یا اس سے بھی زیادہ اینٹیں خرید سکتے ہیں۔ آیئے پاکستان تعمیر کریں۔

آیئے یونی ورسٹی کے بانیوں میں اپنا نام لکھیں

- Bank Name: **Habib Bank Limited**
  Account Title: **Brotherhood Education Trust Akhuwat University**
  Account No: **50097900694355**
  IBAN No: **PK36 HABB 0050 0979 0069 4355**
  Address: Islamic Banking Branch, Al Block New Garden Town, LHR
- Bank Name: **Meezan Bank Limited**
  Account Title: **Akhuwat**
  Account No: **0100097547**
  IBAN No: **PK79MEZN0002220100097547**
  Swift Code: **MEZNPKKAXXX**
  Address: House # 6, Block -2, Sector C/1 College Road Township, LHR
- Bank Name: **Burj Bank Limited**
  Account Title: **Akhuwat**
  Account No: **7401105860000442**
  IBAN No: **PK50BURJ7401105860000442**
  Swift Code: **BURJPKKAXXX**
  Address: 6-D Main Road, Shah Alam Market, LHR

اخوت ہیڈ آفس: 19۔ سوک سنٹر بلاک اے ٹو نزد ہمدرد چوک ٹاؤن شپ لاہور

فون: +92-42-35122743, 35156382

ویب سائیٹ: www.akhuwat.org.pk   ای میل: info@akhuwat.org.pk

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

مارچ 2015ء
جمادی الاول 1436ھ
جلد نمبر 55 شمارہ نمبر 3

urdudigest.com www.urdudigest.pk

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی
سید عاصم محمود
غلام سجاد
حافظ افروغ حسن، نوید اسلام صدیقی، ہمی اعوان
فاروق اعجاز قریشی
افنان کامران قریشی
خالد محی الدین
عبدالرحمن، اشرف سکندر

ڈائریکٹر: ڈاکٹر اعجاز قریشی 0300-8460093

advertisement@urdu-digest.com
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: محمد اسلم 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد گوجرانوالہ: احسان اللہ بٹ
اسلام آباد: محمد سلیم کراچی: شاہ زیب قمر 0345-2558648

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdu-digest.com
19/21 ایف سمن آباد، لاہور فون 92 42 37589957
پاکستان 1560 روپے 1000 روپے میں
بیرون ملک (60) امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک سے خریدار اپنی رقم بذریعہ ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore)
Branch Code No. 110

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر +92-42-35290738 فیکس +92-42-35290731
ای میل editor@urdu-digest.com

حافظ الطاف حسن قریشی نے جمہوریت پریس 24 ... سے چھپوا کر ... سے شائع کیا

علم کی روشنی

لاہور کے ایکسپو سینٹر میں منعقدہ کتاب میلے میں گزرے وہ دن میری زندگی کے خوشگوار ترین لمحات میں سے تھے۔ اردو ڈائجسٹ کی ٹیم نے بھی اس میلے میں بھرپور شرکت کی۔ ہزاروں قارئین نے ہمارے اسٹال پر اپنے پسندیدہ لکھاریوں سے ملاقات کی اور گزشتہ شماروں کی خریداری کر کے اپنی لائبریری مکمل کر لی۔ اردو ڈائجسٹ کے اسٹال پر قارئین کی تین نسلوں سے ملاقات میرے لیے فخر اور خوشی کا باعث بنی۔ خصوصاً سعد جو آٹھویں جماعت کا طالب علم ہے، اپنے والد کے ہمراہ اسٹال پر آیا۔ اس سے مل کر دل خوش ہو گیا۔ وہ باقاعدگی سے پورا شمارہ خصوصاً انٹرویو ہر ماہ پڑھتا ہے۔ اس کے والد اسکول ٹیچر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے والد یعنی سعد کے دادا نے اردو ڈائجسٹ گھر میں لگوایا تھا۔ گھر کے تمام افراد باری باری اسے پڑھتے ہیں۔ اسٹال پر آنے والے سبھی خواتین و حضرات نے اردو ڈائجسٹ کا معیار بے حد پسند کیا، اس میں شائع ہونے والے مضامین اور کہانیوں کی ستائش کر کے ہماری حوصلہ افزائی کی اور مزید بہتری کے لیے قابل قدر تجاویز بھی دیں۔ پانچ دن جاری رہنے والی اس نمائش میں لاکھوں لوگوں کی اہل و عیال کے ہمراہ شرکت اس بات کا ثبوت ہے کہ آج بھی پاکستانی کتابوں کی اہمیت کو سمجھتے اور علم کی روشنی سے اپنے تمام اندھیرے دور کرنا چاہتے ہیں۔

محترم قارئین! اس بار صفحہ ۸۳ پر بھارت سے آنے والے مسلمان چیف الیکشن کمشنر جناب شہاب الدین یعقوب قریشی سے ملاقات اور ان کی زبانی بھارتی الیکشن کمیشن کی کامیابی کی داستان آپ کو حیرتوں کے نئے جہاں میں لے جائے گی۔ صفحہ ۱۳۸ پر ایک ماں کی انگلستان کے سفر کی دلچسپ اور معلومات پر مبنی داستان آپ کو چونکا دے گی۔ معروف لکھاری ڈاکٹر ایس ایم معین کی صفحہ ۱۳۵ پر باتوں باتوں میں ایک سفید پوش کو دل دینے والے مریض کی داستان آپ کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھیر دے گی۔

www.pdfbooksfree.pk

قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر
پیپلز پارٹی کے راہنما

نصف صدی کے چشم کشا سیاسی واقعات

"شریعت نے ایسی خواتین کے بارے میں سخت وعید دی ہے جو اپنے شوہروں کا خیال نہیں رکھتیں اور ان سے بے توجہی برتتی ہیں"۔ اسی حوالے سے محترم سراج دین کی "سنگدل بیویوں کے نام فریاد" کئی خاندانوں کو اجڑنے سے بچا سکتی ہے پڑھیے صفحہ ۱۹۷۔ "وہ میری بیٹی ہے اور اچھی دوست بھی۔ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گی نہ ہی چھپائے گی۔" صفحہ ۷۷ پر ممتاز ادیبہ رضیہ بٹ کی اس تحریر میں معاشرتی اور گھریلو مسائل کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ تحریر بطور خاص والدین کے لیے دلچسپی کے کئی پہلو رکھتی ہے۔ "مسلم فاتحین کا اہل مغرب سے سلوک" اسلامی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی تحریر صفحہ ۱۸۲ پر پڑھیے۔

ہاکی، اسکواش، سنوکر اور کرکٹ سمیت کئی کھیلوں میں کبھی پاکستان کا ہلالی پرچم دنیا بھر میں لہراتا تھا لیکن آہستہ آہستہ سب عالمی اعزازات چھن گئے۔ محترم محمد توفیق نے بڑی محنت اور جانفشانی سے پاکستانی اسپورٹس کو لاحق خطرات اور تکلیف دہ حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ پڑھیے صفحہ ۱۴۳۔ اب حال یہ ہے کہ کھیل "ریلٹی شوز" بن چکے۔ ہاکی کے ایک نامور کھلاڑی نے ہمیں بتایا کہ انڈین ہاکی لیگ کے معاہدے کے مطابق کھلاڑی انتظامیہ کی ہر ہدایت پر عمل کرنے کے پابند ہیں چاہے وہ میچ ہارنے سے متعلق ہی ہو۔ ہاکی سے [illegible] کھلاڑیوں کے لیے مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ وہ بخوبی [illegible] اور پیسہ کمائیں۔ یہی حال کرکٹ کا بھی ہے۔ چند ممالک میں کھیلے جانے والے لیگ کھیل کے ہدایت کار اب جواری اور اشتہار دینے والی کمپنیاں ہیں۔ آئی پی ایل کی ہوشربا کہانی آپ کے سامنے ہے۔ ہم گزشتہ شماروں میں اس کی تفصیل شائع کر چکے۔ غرض کمرشل ازم آ جانے سے کھیل صحت مند سرگرمی نہیں رہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اور دوسرے ادارے ملک میں کھیلوں کے فروغ کے لیے اسکولوں اور کالجوں میں ان کی سرپرستی کریں۔ نیز ٹی وی چینلز پر کھیلوں کے دوران دکھائے جانے والے اشتہارات کے حوالے سے ایسی پالیسی بنائیں جو منفی عناصر کی حوصلہ شکنی کر سکے۔

tayyab.aijaz@urdu-digest.com

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

پروفیسر ضوریز اختر

اللہ تعالیٰ کی عنایت بے پایاں کا شکر کرنا نہ بھولیے

محمد نعمان طیب چنگوانی

فتنہ قادیانیت کے تار و پود بکھیر دینے والے نامور عالم دین

امیر حمزہ مشتاق احمد

تاریخ اسلام کے صفحات میں بکھرے انمول موتی

افتخار حسین

احکامات قرآنی سمجھنے سمجھانے کا جدید انداز

صاف شفاف انتخابات کرائے

ہندوؤں کے چہیتے وزیراعظم

سید عاصم محمود

طیب اعجاز قریشی

بنیادی اہمیت کے کام

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بھوک، غربت اور لاچاری میں گندھی

سید قاسم محمود

مفادات کی جنگ یا انا کا ٹکراؤ

پاکستانی سپورٹس کی ترقی وترویج کے ذمہ داروں نے باہمی رقابت اور سازشوں سے اس شعبے کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا..... چشم کشا رپورٹ

محمد توفیق

دنیا بھر میں ریکارڈ بنانے والی فلم

ابو صارم

قدرت الٰہی کا حیران کن کرشمہ

کارل زمر

قراردادِ لاہور کی مخالفت میں

پروفیسر احمد سعید

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ذکیہ علی بیگ

دکھیاری لڑکی کی عجب کتھا

نیلوفر اقبال

گھر کی چار دیواری میں مقید ایک معصوم بچے کا قصہ الم

سلطان جمیل نسیم

انسان کبھی آسانی سے ایماندار نہیں بن پاتا

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

سفید پوش حسینہ کو دل دینے والے مریض عشق کی داستان

راشدہ علوی

گوروں نے اپنی خوبیوں سے حیران و پریشان کر ڈالا

فردوس عالم

سمارٹ ہونے کا دیسی نسخہ

سراج دین

خوش گوار ازدواجی زندگی میں زہر گھول دینے والے عوامل

رضیہ بٹ

ایک شکی مزاج مرد کی دلفریب کتھا

ڈاکٹر احسان احمد شیخ

ایک ڈاکٹر کا پُرفسوں افسانہ

مرزا عابد عباس

ایک انوکھی ایجاد کی خوبیوں و خامیوں کا بیان

سہراب اسلم

عجیب مشکل میں پھنسے ایک شخص کا ماجرا

جیک رچی

ایک عاقلہ کا دلچسپ قصہ

اُم احمد

"میں" کی کٹر دشمن ایک خاتون کی انقلابی باتیں

عالیہ فاطمہ

ان غذاؤں کا طبی تحفہ جو انسان کو فربہ نہیں کرتیں

نجم السحر

سب کا پالن ہار "اللہ" سے بیگانہ مت رہیے

نیئر احمد

اکیسویں صدی کا کرشماتی مادہ

توقیر عائشہ

ایک پرتجسس بچی نے سوالات پوچھ کر والدین کو زچ کر ڈالا

قدیم و جدید شعرا کی نمائندہ شاعری

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی

درخشاں اسلامی تاریخ کے زریں اوراق

قصہ کونز

تبصرہ کتب

چمن خیال

بوجھو تو جانیں

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کوہِ نور
آملہ ہیئر آئل

کوہ نور آملہ ہیئر آئل بالوں کی نشوونما کرے ان کو ریشمی، صحت مند اور چمکدار بنائے۔
اس کا مسلسل استعمال بالوں کو خشکی، گرنے کے عمل اور دو منہ کے سرے بننے سے محفوظ رکھے۔

... زندگی سے بھرپور صحت مند بال

KAHO.01.2K15

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

الطاف حسن قریشی

معاشرے میں بگاڑ اور زوال کا حقیقی سبب اساسی اور بنیادی امور سے عدم توجہی اور مجرمانہ غفلت ہے۔ آج ہم جس انتہا پسندی اور بُری حکمرانی کا شکار ہیں' اس کی بڑی بڑی وجوہات میں آئین' اسلامی تعلیمات اور سیاسی اخلاقیات سے روگردانی شامل ہیں۔ ہمارے حکمران عام انسانوں کو بھیڑ بکریوں کا درجہ دیتے اور اسی کے مطابق اُن سے نہایت بُرا سلوک روا رکھتے ہیں۔ قائداعظم نے تو یہ فرمایا تھا کہ ہم پاکستان اس لیے بنانا چاہتے ہیں کہ جاگیرداری سے نجات ملے اور عام آدمی کے بنیادی مسائل حل کر کے انھیں عزت اور وقار کا مقام دیا جائے مگر ان کے جاں نشینوں نے معاشرتی انصاف قائم کرنے کے بجائے طبقاتی معیشت' طبقاتی معاشرت اور طبقاتی تعلیم کو پروان چڑھایا اور دو فی صد پر مشتمل اشرافیہ نے اٹھانوے فی صد عوام کے وسائل پر قبضہ کر کے اقتدار کو اپنی لونڈی بنا رکھا ہے۔ یہ استحصالی طبقہ عام آدمی کے حقوق غصب کر کے اپنے لیے زندگی کی جدید سہولتوں سے آراستہ الگ بستیاں' اپنے تعلیمی ادارے اور اسپتال تعمیر کر رہا ہے اور حکومت کے زیادہ تر کارندے اُس کی سیکیورٹی پر مامور ہیں اور اسی کے مفادات کی آبیاری میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ اسی گروہ نے بعض سیاسی جماعتوں کے اندر عسکری ونگ قائم کر لیے ہیں جو بندوق کی نوک پر لوگوں سے ووٹ حاصل کرتے' بھتے بٹورتے اور اغوا برائے تاوان کا ''نفع بخش'' کاروبار کر رہے ہیں۔ سالہا سال پر محیط ان سرگرمیوں کے نتیجے میں انتخابات اپنی حقیقی معنویت کھوتے جا رہے ہیں اور منصفانہ اور آزادانہ رائے دہی کی منزل ہر آن دور سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ سینیٹ کے مارچ میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں جو صورت حال بنی جا رہی ہے' اس پر قومی حلقے کانپ اٹھے ہیں اور بدترین خدشہ فروشی پر ماتم کناں ہیں مگر اس اخلاقی پستی کے وہ تمام لوگ ذمے دار ہیں جو غلط حربوں سے برسراقتدار آتے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے رہے ہیں۔

اب یہ صدا بلند ہو رہی ہے کہ سینیٹ کے انتخابات خفیہ رائے شماری کے بجائے شو آف ہینڈز سے کیے جائیں تاکہ سیاسی ڈسپلن قائم رہے اور ایک ایک ووٹ پندرہ پندرہ کروڑ میں نہ خریدا جا سکے۔ اگر تمام سیاسی جماعتیں آئین میں ترمیم پر متفق ہو جاتی ہیں' تو شاید بگاڑ پر کچھ قابو پایا جا سکے مگر یہ سوال تو اپنی جگہ قائم رہے گا کہ سیاسی جماعتوں کی اپنی اخلاقی حالت کیا ہے اور انھوں نے کس قماش کردار کے لوگ صوبائی اسمبلیوں میں بھیجے ہیں جو دولت کی چکاچوند کے سامنے ڈھیر ہو جاتے ہیں اور اپنی سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے میں سرے سے کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ سینیٹ کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

انتخابات میں یہ دھندا سالہا سال سے چلتا آ رہا ہے اور سرمائے کے زور پر ایک خاندان کے تین تین افراد منتخب ہوتے آئے ہیں۔ اس بار وزیراعظم نواز شریف نے اس خطرناک رجحان کے خلاف آواز بلند کی ہے اور ''شو آف ہینڈز'' کے ذریعے انتخابات کرانے کی خاطر سیاسی جماعتوں سے مشاورت کے لیے کابینہ کی کمیٹیاں بنا دی ہیں۔ اُن کے اس اقدام کا عمران خاں نے خیر مقدم کیا ہے۔ امیر جماعت اسلامی جناب سراج الحق نے بھی اس میں اپنی آواز شامل کی ہے جبکہ جناب زرداری نے حمایت اور اپوزیشن لیڈر خورشید شاہ نے مخالفت میں بات کی ہے۔ میڈیا بھی اس جہاد میں شامل ہے۔ ممکن ہے کہ فوری طور پر سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکے' مگر ہمیں اصل اور بنیادی کام پر کامل سنجیدگی اور پوری یکسوئی سے توجہ دینا ہوگی۔

بنیادی کام یہ ہے کہ ہم سیاسی جماعتوں کی اخلاقی اصولوں کی بنیاد پر تنظیم سازی کریں' اُن میں جمہوریت کو پروان چڑھائیں' کارکنوں کو مرکزی اہمیت دی جائے' انھیں سیاسی تربیت کے ذریعے اس قابل بنایا جائے کہ وہ اسمبلیوں میں جا کر فیصلہ سازی میں حصہ لے سکیں۔ ہر جماعت کی اہل اور دیانتدار افراد پر مشتمل اپنی شیڈو کابینہ ہو اور اس کا ہوم ورک اس قدر مکمل ہو کہ وہ کسی وقت بھی ایک متبادل حکومت فراہم کر سکے۔ پھر یہ کہ سیاسی جماعت کی جڑیں عوام کے اندر بہت مضبوط اور گہری ہونی چاہئیں۔ عام شہری کی فلاح و بہبود اس کے منشور کا لازمی حصہ ہو اور عوامی فلاح و بہبود کی ساری تفصیلات پورے غور و خوض کے بعد تیار کر رکھی ہوں۔ اس امر کا بھی اہتمام ہونا لازم ہے کہ پارٹی کے اہم عہدے کسی ایک خاندان یا اس کے حواریوں تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں' بلکہ عام کارکن اُن کا انتخاب کریں۔ جمہوری ملکوں میں اسمبلیوں کے ٹکٹ قیادت جاری نہیں کرتی' بلکہ حلقے میں رہنے والے پارٹی کارکن اُمیدواروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ وہاں ہر جماعت کے اندر خود احتسابی کا نہایت کڑا نظام کام کرتا ہے اور بُری شہرت رکھنے والا شخص کسی عہدے تک پہنچتا ہے نہ اُسے ٹکٹ دیا جاتا ہے۔

بلدی نظم و نسق کا تعلق اختیارات کی نچلی سطح تک پہنچنے کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ امریکہ کی قوت کا راز اس کے کمیونٹی سسٹم میں ہے۔ ہر کمیونٹی بڑی حد تک خود کفیل اور بااختیار ہوتی ہے' جبکہ ہم نے مقامی اداروں میں عوام کی شمولیت کا عمل یکسر ختم کر دیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں بدترین حکمرانی اور خوفناک ترین دہشت گردی کا سامنا ہے۔ تمام سیاسی جماعتوں نے بڑی جانفشانی سے نیشنل ایکشن پلان تیار کیا' مگر حقیقت یہ ہے کہ عوام پوری طرح اس عمل میں شریک دکھائی نہیں دیتے۔ اگر نچلی سطح پر منتخب حکومتیں قائم ہوتیں' تو وہ عوام کے اندر جوش و خروش پیدا کرتیں اور اُن کی زبوں حالی پر قابو پانے کے لیے منصوبے بناتیں۔ اب تو ایک خوفناک خلا ہے اور بیشتر سیاسی جماعتوں کا دامن خالی ہے۔ مذہبی جماعتیں کسی قدر سرگرم ہیں' مگر اُن کے اور حکومت کے درمیان اعتماد کی خاصی کمی نظر آتی ہے' حالات کے بگاڑ پر قابو پانے کے لیے اربابِ اختیار اور اہلِ علم و دانش کو سیاسی جماعتوں کی اخلاقی اصولوں پر شیرازہ بندی اور مقامی اداروں کے انتخابات اور بنیادی امور کو اوّلین اہمیت دینا ہوگی۔

الطاف حسن قریشی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر
پیپلز پارٹی کے رہنما

اپنے اور قوم کے بارے میں
حیرت انگیز انکشافات

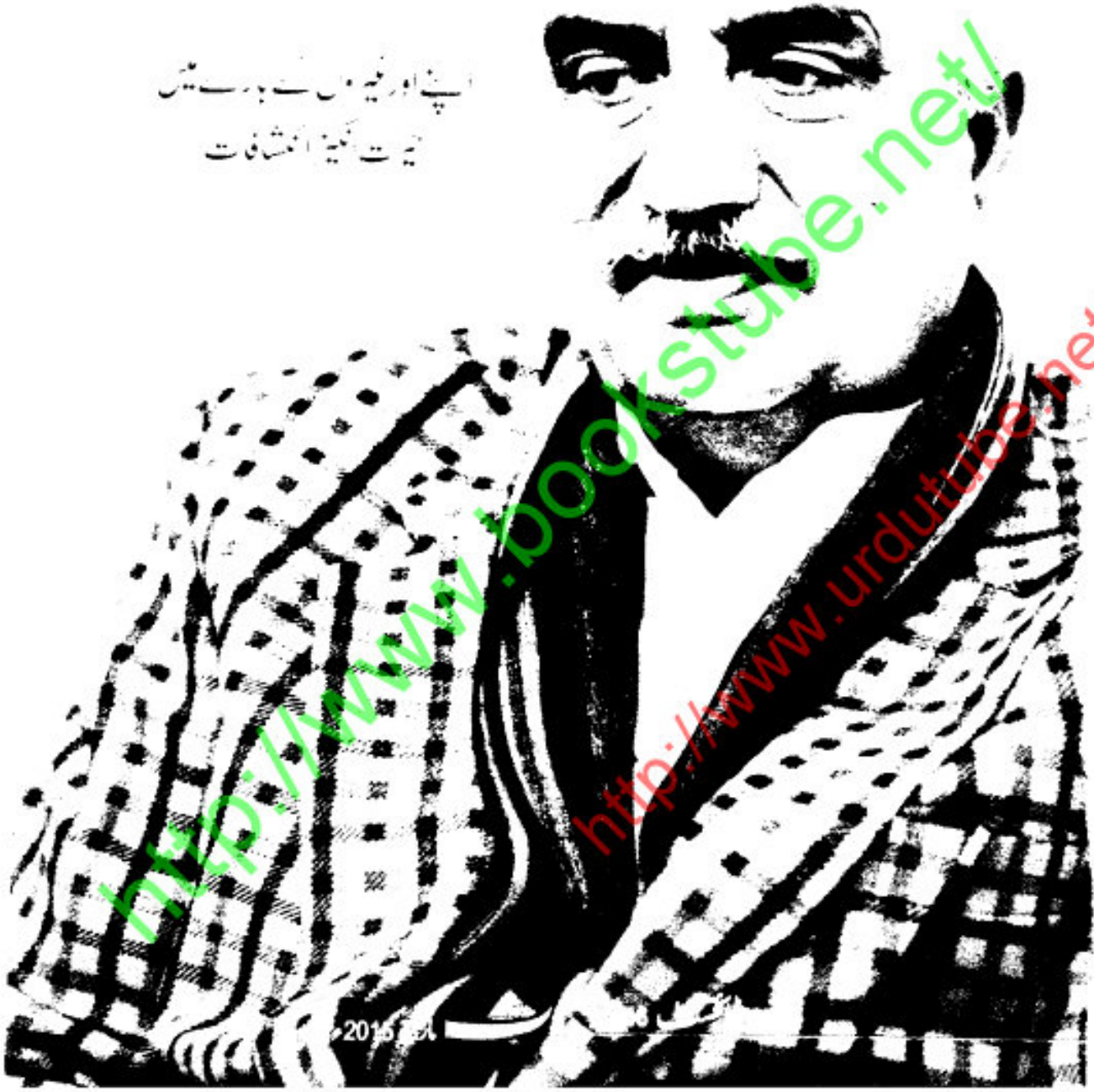

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

پارٹی کے وہ زعما جو تمام سیاسی جماعتوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے اور اعلیٰ سیاسی رویوں کے مرجع ہیں ان میں شاہ صاحب سرفہرست ہیں۔ ان میں کسی قسم کی رعونت ہے نہ دولت کا زعم۔ خاص و عام سے خوش خلقی سے پیش آتے اور زمینی حقائق سے وابستہ رہتے ہیں۔ ان سے مختلف وقتوں میں گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہی اور ہر بار ان کی باتوں کی سادگی اور پرکاری نے متاثر کیا۔ ۲۰۱۳ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی مرکز میں اقتدار سے محروم ہو گئی، تاہم قائد حزبِ اختلاف کا منصب ان کے حصے میں آیا اور ان کی شخصیت کے جوہر ایک نئے انداز سے اجاگر ہوئے اور یوں لگا کہ قدرت نے انھیں بے پایاں عملی فراست عطا کی ہے۔ اخبارات میں ہم ان کے بارے میں یہ بھی پڑھتے رہے کہ ان کی عملی زندگی کا آغاز واپڈا میں لائن مین کے طور پر ہوا تھا۔ میرے دل میں ان کی عظیم الشان کامیابی کی کہانی معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوا کہ وہ کن مرحلوں اور کن منزلوں سے گزر کر وزارتوں کی کہکشاں تک پہنچے ہیں۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال میں انھوں نے قائد حزبِ اختلاف کی حیثیت سے جو کردار ادا کیا وہ ان کی وسعتِ نگاہ، بالغ نظری اور غیر معمولی سیاسی پختگی کا مظہر تھا۔ انہی دنوں ان سے ایک مختصر ملاقات بھی ہوئی تھی جس میں ان کا انٹرویو لینے کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ انھوں نے انکشاف کیا تھا کہ میں اردو ڈائجسٹ آٹھویں جماعت سے پڑھتا آیا ہوں اور مناسب وقت پر آپ سے تفصیلی ملاقات ہو گی۔ یہ غالباً ۱۰ اگست ۲۰۱۴ء کی دوپہر تھی اور ایک سیاسی طوفان امڈا چلا آ رہا تھا۔

میں عزیزم طیب اعجاز کے ساتھ حالات کا جائزہ لینے اسلام آباد آیا تھا۔ وہ جمعے کا مبارک دن تھا اور قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ تحریک انصاف کے چیئرمین جناب عمران خاں انتخابات کو وسیع پیمانے پر دھاندلی کی پیداوار قرار دے چکے تھے اور وزیراعظم نواز شریف سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جناب وزیراعظم کا موقف تھا

www.pdfbooksfree.pk

کہ ہماری حکومت آئین اور قانون کے مطابق وجود میں آئی ہے انتخابات کے نتائج تمام سیاسی جماعتوں نے تسلیم کیے تھے جن کے مطابق صوبوں میں پیپلز پارٹی' تحریک انصاف اور قومیت پرست جماعتیں برسراقتدار ہیں۔ ایک نظام کے تحت کاروبارِ حکومت چل رہا ہے' اس لیے ان سے استعفے طلب کرنے کا مطالبہ سراسر غیرآئینی اور غیرقانونی ہے۔ ہم نے سوچا کہ قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھی جائے اور جناب سید خورشید شاہ سے ملاقات کی جائے۔ یہ حسنِ اتفاق تھا کہ جب ہم پارلیمنٹ ہاؤس کے مین گیٹ پر پہنچے تو اسی وقت اجلاس میں شرکت کے لیے مخدوم جاوید ہاشمی آ رہے تھے جو تحریک انصاف کے منتخب صدر تھے۔ انھیں میڈیا نے گھیر لیا اور ان پر تابڑ توڑ سوالات ہونے لگے۔ وہ جوابات دیتے ہوئے میری طرف بڑھے اور محبت بھرے لہجے میں کہا کہ میں تو اپنے آپ کو آپ کے خاندان کا

محترمہ بےنظیر بھٹو کی خوبصورت روغنی پینٹنگ جو جناب خورشید شاہ کے ڈرائنگ روم کی زینت ہے

ایک فرد سمجھتا ہوں کیونکہ میں نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اردو ڈائجسٹ کے دفتر سے کیا تھا اور مجیب الرحمان شامی کے ساتھ وہاں چند مہینے ٹھہرا بھی تھا۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر آ گئے۔ باہر نکلے تو وزیر اطلاعات پرویز رشید سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے مخدوم صاحب کو ایک طرف لے جا کر کچھ دیر گفتگو کی۔ اس کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس کی راہداریوں میں ہم نے ایوان کا رخ کیا۔ ادھر سے ہمارے وزیرِ خزانہ اسحاق ڈار کسی ہدف کی تلاش میں برق رفتاری سے چلتے نظر آئے۔ ہاشمی صاحب کو دیکھا تو ان کے قدموں کو بریک لگ گئے اور وہ ان کی طرف لپکے۔ ان کے درمیان پانچ سات منٹ گفتگو ہوئی۔ میرا غالب گمان یہی تھا کہ کوئی تازہ صورتِ حال زیرِبحث آئی ہوگی۔ ہاشمی صاحب کا چہرہ پہلے کی طرح پُرسکون تھا مگر باطن میں ایک حشر برپا تھا۔ وہ ہمیں اسپیکر گیلری میں لے گئے اور ایوان میں داخل ہونے سے پہلے میرے کان میں کہا کہ اگرچہ میں ان کی سیاسی پارٹی میں نہیں ہوں' میں میاں صاحب کے موقف کو درست سمجھتا ہوں۔ مجھے ان کی اس بات پر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

ایوان میں تحریک انصاف کے ارکان اسمبلی نے تند و تیز تقریریں کیں' مگر پھیلی ہوئی افواہ کے مطابق انھوں نے بائیکاٹ کرنے کا عندیہ نہیں دیا۔ جمعے کی نماز کے لیے وقفہ ہوا' تو ہم سید خورشید شاہ کے چیمبر میں چلے گئے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

جہاں پہلے سے نامور صحافی موجود تھے۔ سینیٹر رضا ربانی بھی مشورے کے لیے آئے، مگر وہ دبے دبے سے رہے جبکہ شاہ صاحب بڑی اپنائیت سے پیش آئے اور احباب کے لیے چائے پینے کا حکم صادر کیا۔ میں نے کہا، آج کل کسی کا حکم نہیں چلتا حکومت کا نہ اپوزیشن کا۔ کہنے لگے، بات آپ کی ٹھیک ہے، مگر محبت کا سکہ چلتا ہے۔ اور ہمارے بزرگوں کا تعلق صوفیائے کرام سے ہے جو صرف محبت کی زبان میں بات کرتے اور دل جیت لیتے تھے۔ میرا شیوہ بھی یہی ہے کہ کسی کا دل دکھاتا ہوں نہ کسی پر رعب جماتا ہوں کہ سب انسان برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ اسی گفتگو کے دوران چائے آ گئی اور ہمارے دوست صحافیوں نے حالات حاضرہ پر خیال آرائیاں شروع کر دیں۔ قائد حزب اختلاف نے کہا کہ اس وقت میڈیا پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ قوم کو ذہنی انتشار کا شکار نہ ہونے دے اور جمہوریت کو پٹڑی سے نہ اُترنے دے۔ عمران خاں سیاسی طور پر بہت ناپختہ اور کوتاہ نظر ہے۔ وہ جس راستے پر چل نکلا ہے، وہ پاکستان کو بدترین عدم استحکام سے دوچار کر سکتا ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ پارلیمان ایک مؤثر اور فیصلہ کن کردار ادا کرے اور طالع آزماؤں کے ارادے خاک میں ملا دے۔ اس نازک مرحلے میں پوری قوم کو پارلیمان کے ساتھ کھڑا ہونا اور ایک قابل فخر تاریخ رقم کرنا ہوگی۔ ہم شاہ صاحب سے اجازت لے کر نماز پڑھنے گراؤنڈ فلور پر واقع مسجد میں چلے آئے۔ ہمیں اندازہ ہو چلا تھا کہ آنے والے دن بہت کٹھن اور صبر آزما ہوں گے۔ ہم اسی شام لاہور کے لیے روانہ ہو گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہماری قومی زندگی کا بحر طوفان آشنا ہو گیا۔

عمران خاں نے اسلام آباد کی طرف مارچ کرنے کا اعلان کیا تو اپوزیشن لیڈر سید خورشید شاہ نے کہا کہ انھیں بلا روک ٹوک آنے دو۔ اس پر علامہ طاہر القادری جو کئی دنوں سے محاصرے میں تھے، وہ بھی ایک دوسرے راستے سے عازم

www.pdfbooksfree.pk

اسلام آباد ہوئے۔ مجھے اس بات پر حیرت اور تشویش ہوئی کہ شاہ صاحب غیر آئینی مقاصد کے لیے احتجاج کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ بعض دوسری جماعتیں بھی اس نقطۂ نظر کی حامی تھیں کہ پُرامن احتجاج ہر شہری کا حق ہے۔ عمران خاں کے ساتھ نکلنے والے ''سرفروشوں'' کی تعداد اس قدر کم تھی کہ انھیں ''کمک'' کے انتظار میں گوجرانوالہ کے مقام پر پندرہ بیس گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ دونوں راہنماؤں نے انتظامیہ سے تحریری معاہدہ کیا تھا کہ وہ شاہراہِ دستور سے ایک فاصلے پر رہیں گے اور امن و امان کا مسئلہ پیدا نہیں کریں گے مگر جب دونوں فوجیں دارالحکومت پہنچ گئیں اور شیخ الاسلام کے فدائین جوق در جوق آنے لگے تو معاہدے دھرے کے دھرے رہ گئے اور بلوائیوں نے شاہراہِ دستور کا رخ کیا اور کنٹینروں کی مدد سے ایوانِ صدر جانے کا راستہ روک دیا۔ قانون شکن لوگ پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوئے اور انھوں نے مین گیٹ پر قبضہ کر لیا۔ سپریم کورٹ کے جج صاحبان کی آمد و رفت کے راستے تنگ کر دیے گئے اور فسادیوں نے وزیراعظم ہاؤس میں طاقت کے زور پر گھس جانے کی بارہا کوشش کی۔ قانون نافذ کرنے والی فورس کو سخت احکام دیے گئے تھے کہ تشدد کا مظاہرہ ضبط اور غیر معمولی قوتِ برداشت سے کرنا ہوگا۔ حکومت کی اس حکمتِ عملی سے فائدہ اٹھا کر سیاسی مہم جوؤں نے پی ٹی وی پر دھاوا بول دیا۔ عمران خاں نیم شب اپنے کنٹینر سے تحریکِ امپائر کی اُنگلی جلد اٹھنے کا اعلان کرتے اور عدالتِ عظمیٰ کے ذریعے حکومت کی گردن زدنی کے اشارے دیتے رہے۔ پھر یہ تاثر دیا گیا کہ فوج کے پانچ کور کمانڈر جن کی پشت پر ڈی جی آئی ایس آئی بھی ہیں، وہ حکومت کا تختہ الٹ کر عمران خاں کو برسرِاقتدار لانا چاہتے ہیں۔ چار ماہ تک سانپ اور نیولے کا کھیل کھیلا جاتا رہا مگر پارلیمانی جماعتوں نے جس فقید المثال یک جہتی اور یک سوئی کا مظاہرہ کیا، اس کی طاقت کے سامنے مکر و فریب کے منفی عناصر شکست کھا گئے۔ اس شکست فاش میں جناب سید خورشید شاہ اور جناب مخدوم جاوید ہاشمی اور جناب مجیب الرحمان شامی نے زبردست کردار ادا کیا۔

قائد حزبِ اختلاف نے وزیراعظم کو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بلانے کا مشورہ دیا چنانچہ ریاستی اداروں پر یلغار کے پورے دور میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس جاری رہا جس میں تمام پارلیمانی قائدین وزیراعظم کی پشت پر کھڑے رہے۔ بعض مقررین کی طرف سے حکومت پر تنقید بھی ہوئی مگر اس امر پر سبھی کا مکمل اتفاق تھا کہ جتھوں کی یلغار سے جمہوریت کو ضعف پہنچنے نہیں دیا جائے گا اور ہر قیمت پر آئین اور قانون کی حفاظت کی جائے گی۔ مشترکہ اجلاس نے پارلیمنٹ کی بالادستی کی اس قدر ہیبت پیدا کی کہ تحریکِ انصاف کے وائس چیئرمین جناب مخدوم شاہ محمود قریشی کو پارلیمنٹ میں آ کر یہ تقریر کرنا پڑی کہ پارلیمنٹ ہی سریر آرا ہے اور یہی طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہے حالانکہ وہ دھرنوں میں قومی اسمبلی کے خلاف زہر اگل رہے تھے۔ جناب خورشید شاہ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ انھوں نے نہایت عمدہ حکمتِ عملی کے ذریعے پارلیمانی پارٹیوں کے درمیان اتحاد قائم رکھا اور پوری دنیا کو یہ پیغام دیا کہ تمام جمہوری اور پارلیمانی قوتیں حکومت کے ساتھ ہیں اور عمران خاں کے غیر آئینی مطالبے اور ہنگامہ آرائی کو مسترد کرتی ہیں۔ اُن کا دوسرا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے اسپیکر قومی اسمبلی کو بہت صائب مشورہ دیا کہ وہ تحریکِ انصاف سے وابستہ ارکانِ اسمبلی کے

www.pdfbooksfree.pk

استعفے منظور نہ کریں اور ان کا فیصلہ قانون کے مطابق بہت غور و خوض کے بعد کیا جائے۔ تیس پینتیس ارکان کے استعفے فوری طور پر قبول کرنے سے قومی اسمبلی کی حیثیت متاثر ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف جناب شاہ محمود قریشی جب پارلیمنٹ میں تقریر کرنے آئے تو انھوں نے بھی استعفے منظور کرنے پر اصرار نہیں کیا اور یوں قائد حزب اختلاف کی تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی۔ پارلیمنٹ کی اس عظیم طاقت کے سامنے پہلے علامہ طاہر القادری سرنگوں ہوئے اور بعد ازاں ۱۶ دسمبر کی صبح آرمی پبلک اسکول پشاور پر دہشت گردوں کے دل دہلا دینے والے حملے سے عمران خاں کو دھرنے ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ اس طرح یوم آزادی سے جو بداخلاقی' بے ہودگی اور قانون شکنی کا جو خوفناک طوفان اٹھا تھا' وہ پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے بعد اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا اور عوام کو معلوم ہو گیا کہ فتنہ اندازوں کے اصل مقاصد کیا تھے۔

پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں تحریک انصاف کے صدر مخدوم جاوید ہاشمی نے انکشاف کیا کہ عمران خاں کا اصل منصوبہ ملک میں ایک ہیجانی کیفیت برپا کر کے یہ تاثر دینا تھا کہ فوج اور عدلیہ اس کے ساتھ ہے اور ثالثی کے نام پر عدالت عظمیٰ حکومت کو غیر قانونی قرار دے گی اور اس کی جگہ ٹیکنوکریٹس کی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ ان ''انکشافات'' کے بعد عمران خاں کا اصل چہرہ سامنے آ گیا اور فوج اور عدلیہ محتاط ہو گئے۔ ہاشمی صاحب نے ایک طویل تقریر کرنے کے بعد قومی اسمبلی کی رکنیت سے استعفا دے دیا۔ ان کے اس جرأت مندانہ اقدام سے حکومت کو بڑی تقویت پہنچی اور جمہوریت کے خلاف ہونے والی سازش کے غبارے سے ہوا نکل گئی' مگر اندر ہی اندر کارندے سرگرم رہے اور بے یقینی کی دھند پوری طرح صاف نہیں ہوئی۔ دھند کو مکمل طور پر صاف کرنے کا تاریخ ساز فریضہ جناب مجیب الرحمان شامی نے ادا کیا۔ انھوں نے اپنے ٹی وی پروگرام ''نقطہ نظر'' میں آرمی چیف سے مطالبہ کیا کہ وہ ڈی جی آئی ایس آئی ظہیر الاسلام جو دو ماہ بعد ریٹائر ہونے والے ہیں' ان کے جانشین کا فوری طور پر اعلان کر دیا جائے کیونکہ وہ غیر آئینی سرگرمیوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ بعض حلقوں میں اس مطالبے پر سکتہ طاری ہو گیا اور جنرل راحیل شریف نے پورے غور و خوض کے بعد ان تمام کور کمانڈروں کے جانشینوں کا اعلان کر دیا جو چند ماہ میں ریٹائر ہونے والے تھے' اس دانش مندانہ اقدام سے ان ریشہ دوانیوں کا زور ٹوٹ گیا جن کے تانے بانے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اپوزیشن لیڈر جناب سید خورشید شاہ نے انتخابات کے خلاف مہم جوئی کے دنوں میں دو آئینی تجاویز بھی دی تھیں جو ان کی سیاسی بصیرت پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کی پہلی تجویز یہ تھی کہ الیکشن کمیشن میں عدلیہ کے علاوہ سول سروس یا سول سوسائٹی سے اچھی شہرت کے افراد بھی لیے جائیں۔ دوسری تجویز کا تعلق حکومت کی آئینی مدت سے تھا جو ان کے خیال میں پانچ سال کے بجائے چار سال کر دی جائے۔ مجھے ان کی پہلی تجویز اپنے دل کی آواز معلوم ہوئی کیونکہ میں سالہا سال سے لکھتا آیا ہوں کہ ریٹائرڈ جج صاحبان اس اہم ترین کام کے اہل نہیں' کیونکہ وہ کوئی انتظامی تجربہ نہیں رکھتے اور کبر سنی کے باعث فعال بھی نہیں ہوتے۔ گزشتہ انتخابات میں جسٹس فخر الدین جی ابراہیم کا تجربہ غیر معمولی طور پر ناکام رہا۔ ان کی دوسری تجویز میں بھی گہری حکمت پائی جاتی ہے۔ اگر سیاسی جماعتیں اپنی شیڈو کابینہ تشکیل دیں' ہوم ورک ساتھ ساتھ کرتی رہیں اور یکساں صلاحیت اور دیانت کی بنیاد پر تیار کرتی رہیں' تو چار سال کے دوران بھی حیرت انگیز کام کیے جا سکتے ہیں۔ ٹیکنالوجی نے کام کی رفتار پہلے کے مقابلے میں بڑی تیز کر دی ہے۔ اس کے علاوہ عوام پانچ سال تک حکمرانوں کے چہرے دیکھ کر اکتا

www.pdfbooksfree.pk

جاتے ہیں۔ یہ تمام عوامل مجھے سید خورشید شاہ کا انٹرویو لینے پر اُکساتے اور گرماتے رہے اور آخرکار میرا اُن کے اسٹاف آفیسر جناب کلیم ڈار سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم ہوا۔ اُن کی گفتگو میں بڑی اپنائیت اور شائستگی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ شاہ صاحب اِس قدر متحرک ہیں کہ اُن سے وقت لینے کے لیے بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ پھر ایک روز اُن کا فون آیا کہ شاہ صاحب ۲۷؍جنوری کی سہ پہر اسلام آباد آ رہے ہیں اور آپ کے لیے شام چھ بجے کا وقت طے ہوا ہے۔

میں عزیزم طیب اعجاز اور کامران الطاف دن کے گیارہ بجے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم وزیرداخلہ جناب چودھری نثار احمد خاں کے شہر سے گزر رہے تھے کہ کلیم ڈار صاحب کا فون آیا کہ شاہ صاحب ابھی طیارے سے باہر آئے ہیں اور وہ سیدھے محترمہ کلثوم سیف اللہ کے جنازے میں شرکت کے لیے پشاور جا رہے ہیں۔ آپ کے لیے پیغام دیا ہے کہ اب انٹرویو اگلے دن شام کے چھ بجے ہو سکے گا۔

دوسرے روز اُن کا فون آیا کہ آپ انٹرویو کے لیے چار بجے سہ پہر ۲۷ منسٹرز کالونی آ سکتے ہیں۔ میں نے چیک پوسٹ والوں کو آپ کے نام لکھوا دیے ہیں۔ ہم پونے چار بجے کالونی کی انٹرنس پر کھڑے تھے۔ گارڈ نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا اور کہا کہ ہمیں آپ کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی۔ کلیم صاحب سے رابطہ کیا تو انھوں نے گارڈ سے کہا کہ یہ اپوزیشن لیڈر کے مہمان ہیں اور میں نے اُن کے نام پہلے دے دیے تھے۔ معلوم ہوا کہ گارڈز کی ڈیوٹی تبدیل ہوگئی تھی اور انھوں نے آنے والوں کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اِسی طرح کے غیرذمےدارانہ رویے پرورش پا رہے ہیں اور نظم و نسق متاثر ہو رہا ہے۔

منسٹرز کالونی میں داخل ہوئے تو مہیب خاموشی اور دل گرفتہ ویرانی ہمارا استقبال کر رہی تھی۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اِس اُجڑی بستی میں ہمارے وزرائے کرام رہتے ہیں۔ ہمیں پندرہ بیس منٹ سید خورشید شاہ کی اقامت گاہ تلاش کرنے میں لگے۔ دور دور تک آدمی کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ ۳۴ نمبر بنگلے میں خاصی گہماگہمی تھی اور گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اندر گئے تو ڈرائنگ روم میں ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مختلف شہروں سے آئے ہوئے لوگ بیٹھے تھے جن میں سے بیشتر کا تعلق پیپلز پارٹی سے تھا۔ پھر آنے والوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ ہم بھی ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے اور ملاقاتیوں سے تبادلہ خیال کرنے لگے۔ ساڑھے چار بج گئے تھے کہ کلیم ڈار صاحب نے خبر دی کہ شاہ صاحب ایک دو منٹ میں آنے والے ہیں۔ وہ آئے تو بڑی محبت سے ملے اور باقی دوستوں سے معذرت کر کے ہمیں ایک کمرے میں لے گئے جہاں محترمہ بےنظیر کی تصویر آویزاں تھی۔ انھوں نے کہا: مجھے اچانک پشاور جانا پڑا جس کے باعث آپ کو تکلیف ہوئی، میں اُس پر معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل میرا اصول ہے کہ میں جنازے میں شامل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر آپ تعزیت کے لیے دو چار دن یا ہفتوں بعد جاتے ہیں تو غم کی گھڑی میں شرکت کا احساس نہیں ہوتا۔ مرحومہ کلثوم سیف اللہ صوبہ خیبرپختونخوا کی بہت عظیم سیاسی شخصیت تھیں اور انھوں نے ملکی سیاست پر بھی اچھے نقوش ثبت کیے ہیں۔

میں نے کہا کہ ہم آپ کے حالاتِ زندگی تفصیل سے سننا اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مڈل کلاس سے تعلق

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سید خورشید شاہ دورِ طالب علمی میں اساتذہ اور ساتھیوں کے ساتھ بائیں طرف سے دوسری کرسی پر تشریف فرما ہیں

رکھنے کے باوجود آپ نے سیاست میں کامیابی کی ایک عظیم کہانی رقم کی ہے۔ انھوں نے بڑی بے تکلفی سے کہا:

''میرا تعلق مُدل کاس سے ہے اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے والد محکمہ انہار میں انجینئر تھے۔ ہمارا اصل گاؤں امروٹ شریف ہے اور قریباً چار سو سال پہلے ہمارے بزرگ اچ شریف سے یہاں آئے تھے۔ وہاں ہماری گدی تھی جو ہمارے دادا نے چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں یہ بار نہیں اٹھا سکتا۔ ہمارے پردادا عبدالقادر شاہ کا جب چالیسواں ہوا تو میرے دادا نے اپنے مریدوں کو خیر باد کہا۔ اس کے بعد لاڑکانہ میں بھی اپنی گدی چھوڑی دی جواب اوقاف میں چلی گئی ہے۔ امروٹ شریف ضلع سکھر میں تھا لیکن اب وہ ضلع شکار پور میں ہے۔ میرے والد کی شادی سکھر میں ہوئی۔ میری والدہ کا تعلق اعوان خاندان سے تھا۔ ہم تمام بہن بھائی سکھر میں پیدا ہوئے اور میری تاریخ پیدائش ۲۱/اپریل ۱۹۵۲ء ہے۔''

وہ ایک ایک جملے میں بڑے بڑے تاریخی حقائق بیان کرتے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے اندر جو سیاسی پختگی پائی جاتی ہے یہ کسی کا فیضانِ نظر ہے یا آپ کے مزاج کا حصہ ہے۔ وہ زیرِ لب مسکرائے اور کہنے لگے کہ میں آپ کو اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ میری فطرت میں سیاست کا کتنا عمل دخل ہے۔ انھوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں نے ساتویں جماعت سے اردو ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا جس نے میری ذہنی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ مسٹر بھٹو نے ۱۹۶۷ء میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تھی اور اگلے سال ممبر سازی کی مہم شروع ہوئی۔ مہران ہوٹل سکھر میں بھٹو صاحب کے تایازاد بھائی سکندر بھٹو آئے اور انھوں نے رکنیت سازی کا سلسلہ شروع کیا۔ میں اس وقت گورنمنٹ کالج ہائی اسکول سکھر میں زیرِ تعلیم تھا اور طلبہ سیاست میں بہت فعال تھا اور ایوب خاں کی حکومت کے خلاف نعرے لگایا کرتا تھا کیونکہ بھٹو صاحب نے ایوب مردہ باد کا نعرہ بلند کیا تھا۔ مجھے ان دنوں آٹھ آنے جیب خرچ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

زمانہ طالب علمی میں، میں چار آنے میں نتھو کے چھولے کھاتا اور چار آنے میں جوس کا گلاس پیتا

ملتا تھا۔ چار آنے میں نتھو کے چھولے کھاتا اور چار آنے کا جوس کا گلاس پیتا تھا۔ جس روز میں پیپلز پارٹی کا ممبر بننے کے لیے مہران ہوٹل گیا' تو میں نے جوس کا گلاس پینے کے بجائے چار آنے ممبر شپ فیس کے لیے بچا لیے۔ مجھے سکندر بھٹو نے کم عمری کے باعث ممبر بنانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ مجھے ممبر نہیں بنائیں گے تو ہم طلبہ مل کر پتھراؤ کریں گے۔ اتنے میں کریم بخش بلوچ وہاں آ گئے جو بعد میں ڈسٹرکٹ کونسل کے ممبر بنے۔ انھوں نے کہا' یہ بچے ہیں انھیں ممبر بنالیں۔ اُنھوں نے پوچھا' پیسے ہیں۔ میں نے کہا چار آنے ہیں' تو انھوں نے مجھے ممبر بنالیا۔ تب سے پیپلز پارٹی کے ساتھ جڑا ہوا ہوں اور اسی کو میں اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتا ہوں۔''

''کیا آپ نے اس کے بعد اسٹوڈنٹس پالیٹکس کو خیر باد کہہ دیا تھا؟'' میں نے اُن کی سرگزشت میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ انھوں نے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے اسٹوڈنٹس پالیٹکس کے دلچسپ واقعات سنانا شروع کر دیے:

''یہ ایوب خان کا دورِ حکومت تھا جس میں اسٹوڈنٹس یونین پر بہت ساری پابندیاں عائد تھیں۔ یونین کا پریذیڈنٹ کالج کا پرنسپل ہوتا اور وائس پریذیڈنٹ اسٹوڈنٹ ہوتا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں یہ تبدیلی آئی کہ پرنسپل پیٹرن ان چیف ہوتا جبکہ اسٹوڈنٹ یونین کا صدر کہلانے لگا۔ میں نے فرسٹ ائیر میں وائس پریذیڈنٹ کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہو گیا۔ میری سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے مجھے پیپلز پارٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر بنا دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء کے قومی انتخابات میں منگی صاحب قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تو اُن کی جگہ مجھے پیپلز پارٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر کی ذمے داریاں سونپی گئیں۔ میں نے تاریخ میں ایم اے کرنے کے لیے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا جہاں تیرہ ہزار طالب علم تھے اور میں کالج یونین کا صدر منتخب ہوا تھا۔ ۱۹۷۴ء میں اس کالج سے تاریخ میں ماسٹرز کیا اور ۱۹۷۹ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی اور اس وقت جنرل ضیاالحق کا مارشل لا آ چکا تھا۔''

مجھے محسوس ہوا کہ شاہ صاحب کی باتوں میں جو اختصار اور حقیقت کا عنصر ہے' وہ قانون کی تعلیم سے پیدا ہوا ہے۔ وہ سیاست دان ہونے کے باوجود لچھے دار گفتگو نہیں کرتے اور مطالب کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

اُن کی داستان سادہ ہونے کے باوجود بڑی دلچسپ تھی۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ آپ نے عملی زندگی کا آغاز واپڈا میں میٹر ریڈر سے کیا تھا' مگر یہ بات آپ کی تعلیمی سرگرمیوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ انھوں نے ہم پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے جواب دیا:

''یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ میرے ایک محترم نے کہا کہ آپ بڑے اچھے نوجوان اور بڑے محنتی ہو' آؤ میں تمھیں واپڈا میں نوکری دے دیتا ہوں۔ اس وقت تنخواہ ایک سو پچیس روپے ماہوار تھی۔ میں نے نوکری کر لی۔ پھر جب کالج یونین کا صدارتی الیکشن لڑا تو نوکری چھوڑ دی۔ بس اتنی سی بات تھی جس کا افسانہ بن گیا۔ لوگ مجھے آج بھی کہتے ہیں کہ واپڈا میں نوکر تھا۔ یہ بات لوگوں کو بتانی چاہیے کہ ضروری نہیں کہ سردار ہی سیاست میں آئیں۔ محنت کرنے والے لوگ بھی آ سکتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں جب میں یونین کا صدر تھا' تو میں نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ میں جنگل خریدتا۔ درختوں کی کٹائی کر

www.pdfbooksfree.pk

کے کورس سپلائی کرتا تھا۔ اس وقت کے حساب سے درخت بھی مل جاتے تھے۔ اللہ مغفرت فرمائے میرے بڑے بھائی علی نواز شاہ کی جو ایک بہت اچھے انکم ٹیکس وکیل تھے۔ انھوں نے بی ایس سی میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی اور انھیں جامشورو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ چھوٹا بھائی عبدالقادر شاہ انٹرمیڈیٹ میں اوّل آیا۔ ہم اس قدر لوئر کلاس سے تھے کہ والد صاحب نے کہا کہ میں دو بچوں کی فیس دینے کی استطاعت نہیں رکھتا لہٰذا ایک بھائی قربانی دے۔ بڑے بھائی نے کہا کہ میں ملازمت کروں گا اور بھائی پڑھیں گے۔ عبدالقادر شاہ صاحب اس وقت پاکستان انجینئرنگ کونسل کے چیئرمین ہیں۔ یہ ہمارے خاندان کا تعارف ہے کہ ہم سب بھائیوں نے مسلسل محنت کی۔ دوسرے بھائی بھی پروفیسر بنے اور اب بورڈ آف انٹرمیڈیٹ سکھر کے چیئرمین ہیں۔ میرے ایک بھائی کیپٹن ریٹائرڈ ہیں اور اپنی کنسٹرکشن کمپنی میں کام کر رہے ہیں۔ ایک بھائی ڈاکٹر اور محمد سوئی گیس میں ملازم ہے۔

مجھے شاہ صاحب اور ان کے خاندان پر فخر محسوس ہونے لگا کہ انھوں نے محدود مالی وسائل کے باوجود علم کی دولت حاصل کرنے کا سفر جاری رکھا اور معاشرے میں اپنے لیے ایک مقام پیدا کیا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ سید خورشید شاہ کی زندگی حرکت اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے نمایاں طور پر فعال رہے اور سیاسی میدان میں بھی ایک ارتعاش پیدا کرتے رہے۔ میں نے اس تناظر میں ان سے پوچھا

"آپ کی بھٹو صاحب سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی اور ان کی شخصیت کے کس پہلو نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا؟

انھوں نے کسی قدر پرجوش انداز میں جواب دینا شروع کیا:

"۱۹۷۶ء میں میری پہلی مرتبہ بھٹو صاحب سے براہ راست ملاقات ہوئی۔ سکھر میں جب سیلاب آیا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں بھٹو صاحب کی گرفتاری ہوئی تو میں اور میرے چند ساتھی جن میں امداد اللہ اور عبدالحلیم پیرزادہ شامل تھے لاڑکانہ گئے اور ہم نے رات ایک بجے بھٹو صاحب سے ملاقات کی۔ میں جب پہلے بھٹو سے ملا تب طالب علم تھا۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور پوچھا کہ آپ ابھی اسٹوڈنٹ پالیٹکس کر رہے ہیں یا مین اسٹریم کے اندر آ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اب پیپلز پارٹی میں آ چکا ہوں۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کراچی چلے گئے تو مجھے پیغام بھجوایا کہ ڈی آئی جی پولیس سے کہو کہ کیس کے نام پر مجھ سے ملاقات کرے۔ وہ ڈی آئی جی اب مر چکا ہے۔ میرے پاس مزدا گاڑی تھی اس پر میں ڈی آئی جی کو لے کر بھٹو صاحب کے پاس گیا۔ ملاقات ہو جانے کے بعد اسے ریلوے اسٹیشن پر چھوڑا۔ اگلی دفعہ جب بھٹو صاحب لاڑکانہ آئے تو وہ گرفتار کر لیے گئے۔ یہ عید کا دن تھا اور جیل میں ڈاکٹر ہمارے ساتھی تھے۔ انھیں بھٹو صاحب نے ایک کاغذ پر پیغام لکھا کہ خورشید شاہ پارٹی کے کارکن ہیں انھیں یہ پیغام دے دیں۔ پیغام یہ تھا کہ میرے لیے ایک چادر، ایک درجن فولاد بلیڈ لے کے بھیج دو۔ اس وقت خوف کا یہ عالم تھا کہ کوئی بھی شخص لاڑکانہ جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میرے ایک دوست لیاقت علی شاہ نے ساتھ چلنے کی ہامی بھری۔ ہم وہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ بھٹو صاحب کراچی چلے گئے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں وہ شہید کر دیے گئے۔ اس وقت سکھر میں سیاسی طور پر میں سب سے زیادہ فعال تھا۔ اس وقت منگی صاحب بھی تھے منور خان، عبدالحلیم پیرزادہ اور کچھ لوگ بھی۔ ان کے مقابلے میں پارٹی کے بڑے بڑے سینئر لوگ تھے۔ میں چھوٹا تھا، مگر بے حد سرگرم تھا۔ بھاگ دوڑ کرنا، سب کو ملانا، میٹنگ کرنا، لائحہ عمل ترتیب دینا، یہ سب کچھ میں کرتا تھا۔ میں

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نے دیکھا ہے کہ سیاست میں جو شخص لوگوں کے کام آتا ہے وہ جگہ بھی لیتا ہے۔''

ان کی روداد میں عملیت پسندی کا پہلو بہت نمایاں اور زمینی حقائق سے تعلق بہت گہرا تھا۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ انتخابی سیاست میں کب آئے اور کیا کیا تجربات حاصل کیے؟'' انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا:

''حیرت انگیز تجربات ہوئے مخالفوں اور اپنے لوگوں کے ہاتھوں سے مگر یہ سیاست کا حصہ ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ مجھے پارٹی نے عوام دوست کے نام سے ٹکٹ دیا۔ میرے خلاف مسلم لیگ کا صابر چھالیہ والا کھڑا ہوا۔ یہ ضیاالحق کا دور تھا۔ میں جس علاقے میں تھا وہاں ۷۵ فیصد اردو بولنے والے رہتے تھے اور صابر چھالیہ والا بھی اردو بولنے والا تھا۔ خیر میں الیکشن جیت گیا اور چیئرمین کا امیدوار بن گیا۔ میرے ۱۷ اور مخالف کے ۱۳ ووٹ تھے۔ میں جب چیئرمین کا امیدوار بنا تو میرے ہی لوگوں نے جو ایم پی اے ایم این اے کے امیدوار ہوتے تھے یہ سوچا کہ یہ ۲۶ سال کا جوان اگر چیئرمین بن جاتا ہے تو سب پیچھے رہ جائیں گے لہٰذا اسے پیچھے کرو۔ میری ہی پارٹی کے تین چار لوگوں کو وڈیروں نے کہا کہ امام الدین شیخ کی طرف ہو جاؤ جو میرا مخالف تھا۔ تب میں نے سوچا کہ اپنا امیج کیوں خراب کروں اور اکٹھے ہی ہار جاؤں۔ میں دستبردار ہو گیا۔ دیکھا جائے تو میں نے سیاست میں جست ۱۹۸۳ء میں لگائی جب سندھ کے بھی بڑے لوگ میرے ساتھ تھے اور میں ان کی جیل میں دیکھ بھال کرتا تھا۔''

شاہ صاحب کی صاف گوئی سے گلدستے کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ کمال ہنرمندی سے تاریخِ سیاست کے اوراق پلٹتے جا رہے تھے اور ہم بڑے شوق سے ان کی داستان سن رہے تھے۔ ان سے پوچھا کہ ۱۹۸۳ء میں کیا واقعات رونما ہوئے اور ان کے کیا کیا اثرات مرتب ہوئے۔ انھوں نے تاریخ کے ملبے سے حقائق کا سراغ لگاتے ہوئے کہا:

''مجھے یاد ہے سیاست دانوں نے ان دنوں تحریک چلائی تھی۔ اس کے بعد صحافیوں کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا میں نے ساتھ دیا۔ میں جیل میں انھیں چادریں رضائیاں اور دوسری استعمال کی اشیا بھیجتا تھا۔ یہ ضیاالحق کے دور میں پی ایف یو جے تحریک چلی تھی جس میں انھوں نے منہاج برنا کو اندر کر دیا تھا۔ میری گرمجوشی کی وجہ سے مجھے اہمیت اور پہچان ملی۔ بےنظیر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ ہم کراچی سے چلے تو نوشہرو فیروز میں ہمیں روک دیا گیا کہ آگے آپ نہیں جا سکتے تو ہم رات کو جتوئی صاحب کے گھر چلے گئے۔ وہاں میری بےنظیر سے پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھ سے بی بی نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ۱۹۸۸ء کے الیکشن میں مجھے شہر سے ایم پی اے کا ٹکٹ ملا اور وہ سیٹ میں نے الحمدللہ ۷ ہزار ووٹوں سے جیتی۔

''ایم پی اے بننے کے بعد مجھے وزیر بنا دیا گیا۔ پہلے ٹرانسپورٹ اور اطلاعات کی وزارتیں ملیں اور تین چار مہینے بعد تعلیم اور اسپورٹس کے قلمدان بھی میرے حصے میں آئے۔ جب قائم علی شاہ ہٹ گئے اور آفتاب شعبان آئے تو بی بی نے مجھے پلاننگ کا وزیر بنا دیا۔ میں نے تجربہ حاصل کیا اور عام آدمی کے مسائل پر توجہ دی۔ کارکردگی کی بنیاد پر بی بی نے میری

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

تحسین بھی کی۔ پھر ۱۹۹۰ء میں مجھے وہاں سے ایم این اے کا ٹکٹ ملا۔ اسلام الدین شیخ میرے مخالف تھا اور الحمدللہ میں نے وہ نشست بھی جیت لی۔ اس طرح میں مرکزی وزیر بنا۔ ۱۹۹۷ء میں الیکشن پوزیشن بڑی سخت تھی۔ تب بھی میں نے سیٹ جیتی تو بی بی نے مجھے ڈپٹی لیڈر آف اپوزیشن بنایا۔ تب ہماری جماعت کو شدید آزمائش کا سامنا تھا۔''

اُن کی گفتگو میں کوئی جھول تھا نہ کوئی ہچکچاہٹ۔ تاریخ' قانون اور سیاسی نکات سے پوری شناسائی نے اُن کے اظہار اور محاسن میں ایک روانی پیدا کر دی تھی۔ قدرتی طور پر میں نے سوال کیا کہ آپ کی جماعت کو درپیش آزمائش کی نوعیت کیا تھی اور اس نے ہماری قومی سیاست میں کس انداز کے اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں انکشافات کا ایک انبار لگا دیا۔ کہنے لگے:

''مجھے یاد ہے کہ میں' افتخار گیلانی اور بی بی صاحبہ ہم لوگ سکھر ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ہم نے بی بی سے کہا کہ آپ کی موجودگی میں ہم میں سے کوئی شخص بھی لیڈر آف اپوزیشن نہیں بنے گا۔ میں نے تجویز دی کہ آپ اپوزیشن لیڈر بن جائیں اور میں ڈپٹی لیڈر بن جانا پسند کروں گا۔ وہ رضامند ہو گئیں اور اپوزیشن لیڈر بن گئیں' وہ جب جلا وطن ہوئیں تو میں نے قائم مقام لیڈر آف دی اپوزیشن کا بار اُٹھایا۔

''۲۰۰۲ء کے انتخابات سے پہلے ایک اور نازک مسئلے نے سر اُٹھایا۔ جب مجیب پیرزادہ پارٹی چھوڑ چکا تھا' مگر اس نے انتخابات سے پہلے دوبارہ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور روہڑی سے الیکشن لڑنے پر اصرار کیا۔ میں نے اس پر اعتراض کیا' کیونکہ میں نے اس نشست سے الیکشن لڑنے کا پہلے سے فیصلہ کر لیا تھا۔ بی بی نے رضا ربانی اور ناہید خان کو میرے پاس بھیجا اور انھوں نے پیغام دیا کہ بی بی کہہ رہی ہیں کہ تم سکھر شہر سے لڑو' اگر ہار گئے تو میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمھیں سینیٹر بناؤں گی۔ میں نے کہا' بی بی کا حکم ہے' مگر میری بھی ایک شرط ہے۔ اگر میں ہار گیا' تو سینیٹر نہیں بنوں گا' کیونکہ ہار جانے والے امیدوار کو ایوان بالا کا رکن بنا دینا اس کی عظمت کو پامال کر دینے کے مترادف ہے۔ یہ میری شرط قبول ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ آپ کی مرضی۔ بی بی نے کہا کہ ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ میں الیکشن جیت گیا۔ اس کے بعد ۲۰۰۸ء کے انتخابات آئے۔ تب اسلام الدین شیخ نے پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس نے کہا کہ میں اندرون سندھ نہیں جاؤں گا۔ مجیب کی سیٹ پر مجھے سکھر شہر چاہیے۔ بی بی نے کہا کہ میں خورشید شاہ کو اب اِدھر اُدھر جانے کے لیے نہیں کہوں گی۔ زرداری صاحب نے لندن سے فون کیا اور کہا' یار میری بات مان لو۔ میں نے اُن کی بات مان لی۔ پھر بی بی شہید کر دی گئیں اور پیپلز پارٹی کو ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔''

ہمیں شاہ صاحب کے اس اصولی موقف نے بہت متاثر کیا کہ شکست خوردہ امیدوار کو سینیٹ کا ٹکٹ نہیں دینا چاہیے' مگر بیشتر سیاسی جماعتیں اس اصول کی پاسداری نہیں کرتیں۔ اب تو انھوں نے صوبوں کی نمائندگی سے بھی کھیلنا شروع کر دیا ہے اور ووٹ سربازار نیلام کیے جا رہے ہیں اور یوں سینیٹ کا معزز اور معتبر ادارہ اپنی افادیت کھوتا جا رہا ہے۔ شاہ صاحب کی عظمت کردار کو سلام کرتے ہوئے میں نے سوال کیا کہ اخبارات میں آپ کے خلاف کرپشن کے الزام لگتے رہتے ہیں اور نیب میں مقدمات زیرسماعت ہیں۔ اُن کی کیا حقیقت ہے؟ انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا:

''اللہ تعالیٰ میرے ''غرور'' کو قائم رکھے کہ میں نے کبھی کسی سے بے ایمانی کی نہ کرپشن سے اپنا دامن آلودہ کیا نہ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کسی کی دولت دیکھ کر میرا جی للچایا۔ میں نے رات دن محنت کی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں میرپورخاص میں سندھڑی ایئرپورٹ بنا۔ اس کام میں نے کنٹریکٹ لیا اور بنایا اور "جے وی کے" کے نام سے کنسٹرکشن کمپنی بنائی اور اسے ۱۹۸۷ء تک چلاتا رہا۔ "کے" کا مطلب تھا خورشید شاہ' "جے" کا مطلب تھا جاناں ملک' وہ پارٹنر تھا۔ "وی" کا مطلب تھا ولی محمد' وہ ڈائریکٹر جنرل اے ڈی اے میں رہے تھے۔ ہم تین پارٹنر تھے۔ وہاں ریت ہی ریت تھی اور منہ میں مٹی چلی جاتی تھی۔ وہاں میں نے تین سال گزارے۔ بعدازاں ہالا، حیدرآباد اور سکھر میں کنسٹرکشن کے کام کیے اور ہمیشہ کام کی خود نگرانی کی۔ اس دوران ایک ناقابل فراموش واقعہ رونما ہوا۔"

ہم سب اس ناقابل فراموش واقعے کو سننے کے لیے ہمہ تن گوش بر آواز ہو گئے۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک پرخطر اور کٹھن راستے سے گزر کر ساحل مراد تک پہنچے تھے۔ انھوں نے کسی تامل کے بغیر اپنی بپتا سنانا شروع کی:

"یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے۔ ہائی کورٹ سکھر کا میں نے ایک ٹینڈر لیا جو ڈھائی کروڑ کا تھا۔ ۱۹۸۶ء کے ڈھائی کروڑ آج کے ۵۰ کروڑ کے برابر ہیں۔ وہاں پر دروازے کھڑکیاں ازسرنو درست کرنا تھیں۔ میں نے ہائی کورٹ کے وقار اور عظمت کے مطابق جی لگا کر کام کیا۔ اعلیٰ معیار کی چیزیں ڈھونڈنے خود جاتا۔ عام طور پر زمین کے اندر پائپ کنکشن سیمنٹ کے ذریعے بند کیے جاتے ہیں۔ میں اس کی جگہ کنکریٹ ڈالتا کہ وہ ٹھیک طور پر سیل ہو جائیں۔ میں نے پوری جانفشانی سے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے بعد جام صادق کا زمانہ آ گیا۔ یہ تین سال کا ٹھیکہ تھا' ۱۹۸۶ء میں لیا اور ۱۹۸۹ء میں ختم ہوا۔ جب پیپلز پارٹی کی حکومت آئی' تو میں نے ٹھیکے لینا بند کر دیے کہ اب وہ بدعنوانی کے زمرے میں آتے تھے۔ میں پچھلے ٹھیکے داروں سے خرید چکا تھا۔ پھر میں نے اپنے برادر نسبتی سے کہا کہ آپ بقیہ کام مکمل کر دو۔ حیدرآباد ہائی کورٹ کا بھی ٹھیکہ سکھر ہائی کورٹ کے ساتھ ٹھیک ہوا تھا۔ وہاں کے ٹھیکے دار نے دروازوں پہ ٹیپ پلائی کی تھی۔ ۱۹۹۱ء میں بارشیں بہت ہوئیں تو وہ ٹیپ کھل گئی۔ جام صادق کو کسی نے کہا کہ خورشید شاہ نے تعمیراتی کام کیا ہے۔ اس نے میری گرفتاری اور کام کی جانچ پڑتال کے احکام جاری کر دیے۔ عبدالقادر شیخ انجینئر تھا۔ اس نے میرے بھائی کو پیغام بھجوایا کہ شاہ صاحب سے کہو کہ اگر کوئی مسئلہ ہے تو اسے درست کر دو' ہم ہفتہ دس دن بعد معائنے کے لیے جائیں گے۔ میں نے کہا' وہ خوشی سے کام چیک کریں۔ وہ ہمارے کام کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ کنٹریکٹ میں جو چیزیں شامل نہیں تھیں وہ عمارت کی پائیداری کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ جام صادق مجھے ملا تو سندھی میں کہا کہ "سیدا! تیرے بھاگ بڑے اچھے ہیں۔" میں آج بھی کہتا ہوں کہ اگر میں نے کہیں بھی ہاتھ ڈالا' تو وہ محنت اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے سونا ہو گئی۔"

اس واقعے نے ہم پر شاہ صاحب کی بے پایاں احساس ذمے داری کا تاثر قائم کیا' لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے میری صحافتی رگ مسلسل پھڑک رہی تھی کہ نیب کے اندر چلنے والے مقدمات کا کیا فیصلہ ہوا۔ انھوں نے میرے شوق تجسس کی پیاس بجھانے کے لیے کہنا شروع کیا:

http://www.booksube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بہ حیثیت قائد حزبِ اختلاف وزیراعظم پاکستان، میاں نواز شریف سے مصافحہ کرتے ہوئے

''نیب میں کوئی کیس نہیں، سب ختم ہو گئے ہیں۔ میرے خلاف کرپشن کا کوئی کیس تھا ہی نہیں۔ کیس یہ تھا کہ بینکوں میں پیسے کہاں سے آئے؟ کنسٹرکشن کے کام کے دوران چیک آتے رہتے تھے۔ اب ایک پچاس لاکھ کا چیک آیا تو میں پریشان ہو گیا کہ یہ کہاں سے آیا تھا۔ بعد میں مجھے یاد آیا کہ میرے ایک دوست غضنفر نے فیصل آباد میں ٹیکسٹائل مل لگائی جو خلاف ہو گئی۔ لوگوں نے اس سے فراڈ کیے۔ اس کا بہت سامان آیا جسے وہ کسٹم سے چھڑا نہ سکا۔ رانا زاہد توصیف نے مجھ سے کہا کہ شاہ صاحب! وہ مل بیچ رہا ہے، بندہ بڑا تیز ہے، آپ کا بڑا دوست ہے۔ اگر تم درمیان میں آجاؤ تو ہم ان لوگوں کو ایڈوانس پیسے دے دیتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، وہ بیچارہ مجبور ہو رہا ہے تو میں اس کی ضمانت دے دیتا ہوں۔ ان لوگوں نے ایڈوانس ادائیگی کے طور پر ۵۰ لاکھ روپے کا چیک مجھے بھیجا۔ میں نے ان لوگوں کو بی اے ایل فیڈرل برانچ کا نمبر دیا اور انھوں نے پیسے بھیج دیے۔ وہاں سے رقم نکال کر میں نے رانا غضنفر کو دے دی۔ پھر میں نے اسی دن اپنے بھائی علی نواز شاہ انکم ٹیکس آفیسر کو پیغام بھیجا اور کہا کہ پچاس لاکھ کے چیک کا سراغ مل گیا ہے اور ناموں کا پتہ چل گیا ہے۔ تب رانا زاہد کو بلا کر اس سے بیان لیا گیا۔ اس کے بعد پوچھا گیا۔ یہ سات لاکھ روپے کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے کہا یار، یہ کوئی رقم ہے کہ میں وفاقی وزیر رہا ہوں' کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ میں نے ۱۹۸۱ء سے حسابات دیے تو وہ کیس بھی ختم ہو گیا۔''

خورشید شاہ کے بازو بار بار حرکت میں آ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میرا خدا مجھ پر بہت مہربان ہے اور میرے لیے امکانات کے دروازے کھولتا رہا ہے۔ میں اس ضمن میں آپ کے قارئین کی دلچسپی کے لیے ایک عجیب و غریب واقعہ سناتا ہوں:

''میں وزیر تعلیم تھا' تو مجھے پرائیویٹ سیکرٹری نے بتایا کہ ایک جج صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ

www.pdfbooksfree.pk

میں نے بی بی کو کہلوایا، اگر الیکشن میں ہار گیا تو سینیٹر نہیں بنوں گا

بھیج دو۔ وہ نوشہرو فیروز سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے سادہ مزاج تھے۔ وہ کہنے لگے: میرے بیٹے نے اکنامکس میں ایم اے کیا ہے۔ یہی بات ہے کہ میرا گزارہ نہیں ہوتا۔ آپ اس کو کہیں لگوا دیں۔ میں نے آپ کی اچھی شہرت سنی ہے اسی لیے چلا آیا۔ میں نے داؤد انجینئرنگ کالج کراچی کے پرنسپل کو فون کیا۔ اس وقت نئی نئی فیکس مشین آئی تھی۔ میں نے کہا اس کی ایڈہاک تقرری کا خط مجھے فیکس کر دیں۔ کہنے لگے انٹرویو لینے کے بعد بھیجوں گا۔ پرنسپل نے مجھے تقرری کا خط بھیج دیا۔ جج صاحب اسے لے کر چلے گئے۔ وہ جہاں بیٹھتے میری تعریف کرتے اور کہتے کہ ایک انسان دوست وزیر ہے جس نے چشم زدن میں میرا مسئلہ حل کر دیا۔

ایک بار میرے ایک دوست شیخ صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کھارو میں زمین مل رہی ہے۔ وہ دھوکے باز لوگوں سے ڈیل کرتا تھا اس کی زمین ضبط ہوئی تھی جو اب نیلام ہو رہی ہے۔ سنا ہے جو جج زمین الاٹ کر رہا ہے وہ آپ کی بڑی تعریف کرتا ہے اور اس کا نام عزیز میمن ہے۔ میں نے کہا ان سے بات کر لیتے ہیں۔ میرے دوست نے نمبر ملا دیا۔ میں نے ان سے بات کی تو میرا نام سنتے ہی کہنے لگے سائیں کوئی حکم؟ میں نے کہا کہ ایک ضروری کام سے آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگے میں خود آپ کے پاس آتا ہوں۔ وہ آ گئے اور پوچھا کیا حکم ہے؟ میں نے کہا حکم نہیں ایک عرض ہے۔ یہ زمین جو آپ نیلامی کر رہے ہیں میں اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں۔ کہنے لگے کل آدمی بھیج دیں ڈرافٹ لے آئے چار قسطیں کر دیتا ہوں۔ انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا کہ سر آج ہی میرے پاس ایک کاغذ آیا ہے۔ آپ کی اسٹیٹ اے میں ایک پلاٹ نیلامی کے لیے بینک کی طرف سے آیا ہے آپ وہ لے لیں۔ میں نے پوچھا کتنے میں دیں گے۔ جواب دیا جو رقم آپ کے پاس ہے وہ دے دیں۔ میں نے حساب لگاتے ہوئے کہا کہ میرا پلاٹ ۵۰۰ گز کا ہے وہ میں نے ۴۸ لاکھ میں لیا تھا۔ میں نے مذاق مذاق میں ۵۰ لاکھ کہا وہ مان گئے۔ تیسرے دن میں نے ۲۵ فیصد رقم کا چیک بھیج دیا اور سارے کاغذات بن گئے۔ اس اثنا میں ایک پارٹی پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ایک کروڑ میں سودا ہو گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی دین تھی۔

"پھر اسی طرح ایک فلور مل بھی ۹۸ لاکھ میں مل گئی۔ کچھ عرصے بعد یعقوب ٹیکسٹائل فیکٹری ہائی کورٹ نے فروخت کی۔ میں نے وہ دو کروڑ ۴۰ لاکھ میں خرید لی۔ میرے خدا نے کرم کیا تو میں نے جھنگ شریف میں ۳۵ ہزار روپے فی ایکڑ کے حساب سے زمین لی اور وہ بھی چھے قسطوں میں۔ کبھی ۴۰ لاکھ دیا کبھی ۱۵ لاکھ۔ اگر آج وہ زمین بیچوں تو کم سے کم ۱۰ لاکھ روپے ایکڑ کے حساب سے بکے گی۔ میں اکثر کہتا ہوں کہ اگر آپ ایمانداری سے چلیں، تو اللہ تعالیٰ آپ کا ساتھ دیتا ہے۔ میرے پاس بڑی بڑی وزارتیں تھیں۔ میری وزارت تھی جس کا اب کتنا اسکینڈل چل رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کتنے کتنے بڑے آدمی گرفتار ہوئے ہیں۔ جب تک میں تھا کچھ نہیں ہوا۔ میرے جانے کے بعد چودھری صاحبان آئے۔ انھوں نے ۱۳۳ ارب کا دھاوا بول دیا۔ وزارت تعلیم کا بھی میں انچارج رہا اور دوسری بہت سی وزارتیں میرے پاس تھیں۔ الحمدللہ کسی وزارت میں میرا کوئی اسکینڈل نہیں۔"

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

خورشید شاہ کے آہنگ میں جو سرخوشی تھی' وہ بیان سے باہر تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور سینیٹر روبینہ خالد اجازت لے کر داخل ہوئیں۔ میں نے اُن کی گفتگو بار ہا پی ٹی وی پر سنی تھی اور اُن کی متانت اور میانہ روی نے مجھ پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑا تھا۔ عجب اتفاق ہے کہ عزیزم طیب اعجاز نے اسی لمحے ایک چلبلا سوال پوچھ لیا:

''آپ کا ایک بیان پڑھا ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ میں نے سیاست میں توازن اپنے گھر سے سیکھا ہے۔ ذرا اس راز سے پردہ اُٹھائیے۔''

انھوں نے ہنستے ہوئے کہا' نہیں وہ گُر سیاست سے سیکھا اور گھر میں استعمال کیا ہے' ان کے حقوق دیے ہیں اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ اس اختصار کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہنے لگے:

''دیکھیے' سب سے پہلے تو آپ میں برداشت کا مادہ ہونا چاہیے۔ اگر پہلی بیوی آپ کے ساتھ لڑائی کرتی ہے' تو اسے برداشت کیجیے کہ یہ اُس کا حق ہے۔ پہلے وہ اکیلی بادشاہ تھی' اب اس کی بادشاہت میں ایک شراکت دار آ گیا ہے، تو اسے ردعمل ظاہر کرنے اور پھٹنے دیں۔ پھر آپ کا حسنِ سلوک زخم پر مرہم رکھتا جائے گا اور آخرکار ایک توازن پیدا ہو جائے گا۔''

''کیا بچے دونوں سے ہیں؟'' طیب اعجاز نے ایک اور نفسیاتی اہمیت کا سوال کیا۔

''دوسری بیوی سے اولاد نہیں۔''

اس مرحلے پر محترمہ روبینہ خالد نے گواہی دی کہ شاہ صاحب کی دونوں بیگمات بڑی خوش ہیں اور ایک دوسرے سے بہت اچھا برتاؤ کرتی ہیں' وہ اپنے شوہر کی خوش مزاجی اور انصاف پسندی پر پوری طرح بڑی مطمئن ہیں۔ اُن کے گھر کا ماحول بڑی حد تک پرسکون اور مفاہمت کے جذبات پر مبنی ہے۔

''آپ کی اولاد سیاست میں آئی ہے یا آنے کا ارادہ رکھتی ہے؟''

''میرے بیٹے ابھی نہیں آئے' البتہ ساتھ چلتے ہیں۔ دراصل سکھر میں میرا کوئی ذاتی گھر نہیں۔ پہلے بڑے بیٹے کے گھر میں رہتا تھا' بعد میں عبدالخالق بھائی کے ہاں رہتا ہوں۔ میں اپنا گھر سکھر ہی میں چار پانچ سال سے بنا رہا ہوں۔ ابھی کچھ عرصے میں مکمل ہو جائے گا۔''

''کیا آپ کی اولاد سیاست میں آئے گی؟''

''ہاں ان شاء اللہ وہ آئیں گے۔ میرا بھتیجا اس وقت ایم پی اے ہے۔ جب میں ریٹائر ہوں گا، تو اپنے بیٹے کو بھی لاؤں گا۔ میں کسی اور کی سیٹ نہیں چھینوں گا' اپنے گھر ہی سے آغاز کروں گا۔ لوگ مجھ سے لڑتے تھے کہ اپنے داماد کو ناظم کیوں نہیں بناتے؟ میں نے کہا' بھئی! پھر یون میرے ساتھ چلے گا' سارے لوگ بھاگ جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ناظم بھی خود، ایم پی اے بھی خود، ایم این اے بھی خود تو اس طرح بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ لوگوں میں امید پیدا رہے گی' تو میرے ساتھ چلیں گے کہ میری باری پر مجھے بھی اپنا حق ملے گا۔''

قائد حزب اختلاف باتوں باتوں میں اس بگاڑ کی نشاندہی کرتے جا رہے تھے جس نے قیادت اور کارکنوں کے درمیان بڑے فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی مثال دیتے ہوئے یہ سنہرا اصول بیان کیا کہ ایک ہی خاندان میں ڈسٹرکٹ کونسل' صوبائی اور قومی اسمبلی کے مناصب جمع ہو جانے سے سیاسی جماعت کے اندر محرومی کا احساس پیدا ہوتا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہے اور سیاسی کارکن یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ عمر بھر لیڈروں کی خدمت کرتے رہیں گے اور انھیں کبھی نمائندگی کا منصب ملے گا نہ وہ کبھی فیصلہ سازی میں شامل ہو سکیں گے۔

سیاست جو امورِ مملکت چلانے کا سب سے خوبصورت فن ہے اس پر بات چل نکلی تو شاہ صاحب سے دریافت کیا:

''جس پیپلز پارٹی نے سالہا سال پورے ملک پر حکومت کی وہ اب صرف سندھ بلکہ اس کے دیہی علاقوں تک محدود ہو کے رہ گئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟''

انھوں نے کسی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیے بغیر ہموار لہجے میں کہا: ''دیکھیں یہ سانحہ ہمارے ساتھ ایک مرتبہ پہلے ۱۹۹۷ء میں بھی پیش آ چکا ہے۔ ابھی تو ہم پنجاب سے چار اور دس سیٹیں لے کر آ گئے ہیں۔ اس وقت تو ایک سیٹ بھی نہیں تھی۔ دراصل قیادت کا بہت بڑا گیپ ہے۔ وہ بی بی تھی جس نے جدوجہد ترک نہیں کی اور انتہائی کڑے حالات کا مقابلہ کرتی رہی۔ ہم بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پرامید ہیں کیونکہ لوگ اب یہ تو کہہ رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی ایک سیاسی جماعت ہے اور اسے حکومت کرنا آتی ہے۔ آپ نواز شریف اور عمران خان دونوں کو دیکھ لیں۔ انھوں نے ناپختگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدانخواستہ عمران خان اس ملک کا وزیراعظم بن جائے، تو پتہ نہیں وہ وطن کا کیا حشر کرے گا۔ اس کے پاس سرے سے ویژن ہی نہیں۔ صرف ایک دو باتیں وہ دہراتا رہتا ہے۔ اسے سیاسی شعور ہے نہ ٹائمنگ کا ادراک۔ ذرا سوچیے کنٹینر پر کھڑے ہو کر اس نے جو گھٹیا اور فضول باتیں کی ہیں، کیا وہ کوئی سیاستدان کر سکتا ہے۔ پھر سب سے بڑی ذالت یہ ہوئی کہ اس کے صوبے میں بچوں کی شہادتیں ہوئیں اور وہ چہلم میں شمولیت کرنے کے بجائے عمرے پر چلا گیا اور شادی رچائی۔ وہ بندہ جو صرف اپنی ذات تک محدود ہے لوگوں کی کیا خدمت کر سکے گا؟''

''ان کو کنٹینر تک پہنچانے میں بھی تو آپ کا ہاتھ کارفرما تھا۔ آپ حکومت سے کہتے رہے کہ ان کو اسلام آباد آنے دیں کیونکہ انھیں احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے۔'' طیب اعجاز نے ایک چبھتا ہوا سوال داغ دیا۔

''دیکھیے ہم نے یہ ضرور کہا تھا مگر یہ بھی اشارہ دیا تھا کہ مولانا کو نہ آنے دیں۔ اگر مولانا نہ آتا، تو یہ گوجرانوالہ ہی سے واپس چلا جاتا۔''

''اچھا! شاہ صاحب یہ بتائیں کہ عمران خان صاحب جب اسلام آباد آ رہے تھے، تو آپ کے خیال میں کیا انھیں فوج میں کسی طاقتور طبقے کی آشیرباد حاصل تھی؟'' میں ان کے تجزیے کے پیچ و خم سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

''پہلے ہی وہ لوگ مجھ سے خفا ہیں۔ مجھے کیوں مرواتے ہیں؟ دیکھیں جو کچھ انھیں چاہیے تھا، وہ انھوں نے لے لیا، اب باقی سوالات کیوں کرتے ہیں آپ؟''

''آپ نے ۲۱ فروری ۲۰۱۴ء کو بیان دیا کہ مجھے لگتا ہے فوج بڑی سخت ناراض ہے مذاکرات کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ وزیراعظم کو لیڈر بن کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ ایسے اقدامات کرنے پڑیں گے کہ یہ پیغام جائے کہ حکومت بھی موجود ہے اور اس کی رٹ بھی۔'' طیب اعجاز نے دریافت کیا کہ آپ اس بیان سے قوم کو کیا پیغام دینا چاہتے تھے؟

www.pdfbooksfree.pk

شاہ صاحب نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے جواب دیا:

''دونوں راہنما، یعنی میاں صاحب اور عمران خاں آپریشن کے حق میں نہیں تھے اور ڈائیلاگ کرتے جا رہے تھے۔ کمیٹیاں بھی بنی تھیں حالانکہ فوج ان کے ساتھ نہیں تھی' چنانچہ مذاکرات ناکام ہوئے۔ اگر فوج کا تعاون ہوتا' تو مذاکرات ناکام ہرگز نہ ہوتے۔ آخر میں ہوا وہی جو لوگوں نے چاہا۔ ہمیں پہلے ہی درست فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ اس طرح مسائل مزید سنگین اور گمبھیر نہ ہوتے۔''

میں نے اسی موضوع کے ساتھ جڑا ہوا سوال اُٹھایا:

''فوج اور سول حکومت کے درمیان جو نشیب و فراز پیش آتے رہے' آپ کے خیال میں ایک سیاسی پارٹی کا مناسب رویہ کیا ہونا چاہیے؟''

''ابھی تو ایسا کچھ بھی نہیں۔'' خورشید شاہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ کے پاس اب رہ کیا گیا ہے؟'' میں نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت کچھ ہے پارلیمنٹ میں۔'' انھوں نے اپنی ساری قوت ارادی کو مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

''پارلیمنٹ میں تو لوگ آتے ہی نہیں۔ آپ تقریر کر رہے ہوتے ہیں تو پانچ سات عوام کے نمائندے بیٹھے ہوتے ہیں۔'' میں مسلسل ان کی طاقت کے تعاقب میں رہا۔

''خورشید شاہ صاحب نے چند ساعتوں کے لیے توقف کیا اور بسکٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کھا لینے کے بعد کہا:

''قریشی صاحب! میں ایک بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہے اسے چلنے دیا جائے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ کو پختہ کار اور طاقتور ہونے میں وقت لگا تھا۔ وہاں تو بادشاہ کے سر کاٹے جاتے تھے۔ ظاہر ہے یہاں بھی وقت لگے گا۔''

جناب خورشید شاہ نے ایک فقرے میں تاریخ کا ایک طویل اور خونخوار عہد سمٹ لیا تھا۔ ان کی اس بات میں بڑا وزن تھا کہ ایک نظام کے تسلسل سے بہتری کے امکانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ فرانس اور برطانیہ نے ایک دوسرے کے خلاف صد سالہ جنگ لڑی تھی اور وہ امریکہ جو آج مغربی تہذیب کا امام بنا ہوا ہے' چند صدیوں پہلے وحشیوں کی سرزمین تھی۔ ان تمام تاریخی حقائق کے باوجود میرے شعور کے اندر یہ احساس موجود ہے کہ تاریخ کے تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نسبتاً کم وقت میں اپنے معاملات درست کر سکتے ہیں' چنانچہ میں نے ایک بنیادی نکتہ اُٹھایا:

''یہ تو ٹھیک ہے' لیکن ایک سیاسی جماعت کو اپنے اندر جمہوریت لانا' پڑھے لکھے لوگوں کو ٹکٹ دینا، قابل اور معاملہ فہم لوگوں کے ذریعے فیصلہ سازی کے ادارے مضبوط اور عوام کو بااختیار بنانا پڑے گا۔ آج تو حال یہ ہے کہ جس کے پاس دولت ہے' وہ اختیارات کا مالک بن بیٹھتا ہے اور مخلص کارکن منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔''

خورشید شاہ نے اپنی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا:

''جناب! آپ ان چیزوں کو چلنے تو دیں۔ یہ بڑے بڑے طرم خاں خود ہی اڑ جائیں گے اور محض دولت کام نہیں آئے گی۔ عوام بیدار ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے حکمرانوں پر حالات کا سخت دباؤ ہے۔''

میں نے گفتگو کا رخ تبدیل کرنے کے لیے ایک مختلف نوعیت کا موضوع چھیڑ دیا:

www.pdfbooksfree.pk

''چلیے، باقی باتیں چھوڑیے۔ آپ نے دو اچھی تجاویز دی تھیں جن میں کہا تھا کہ الیکشن کمیشن میں جج صاحبان کے بجائے اعلیٰ منتظمین کو لانا چاہیے کیونکہ وہ انتخابات کرانے کی انتظامی صلاحیت نہیں رکھتے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس تجویز کو جدید آئین کا حصہ بنایا جا سکے گا؟''

خورشید شاہ نے جواب میں کہا: ''انتخابی اصلاحات کمیٹی کی طرف سے یہ تجویز آنی چاہیے اور تمام سیاسی جماعتوں پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کی تائید کریں۔''

''میں گزشتہ عشروں سے یہ بات لکھتا آ رہا ہوں کہ جج صاحبان اتنا بڑا کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، اسی لیے انڈیا اور سری لنکا میں وہ الیکشن کمیشن کا حصہ نہیں بنائے گئے۔''

''دیکھیے، اب تو وقت آ گیا ہے تاہم ہماری کوشش ہے کہ الیکشن کمیشن کے ممبران ججوں سے نہ لیے جائیں۔''

طیب اعجاز نے پیپلز پارٹی کے داخلی معاملات کو موضوعِ گفتگو بناتے ہوئے پوچھا:

''بظاہر یہ لگ رہا ہے کہ بلاول بھٹو پارٹی میں نہیں آ رہے۔ وہ بیمار بھی ہیں۔ ایسے میں پارٹی کے مستقبل کی صورت گری کس انداز کی ہو گی؟''

جناب سید خورشید شاہ نے ایک قلق پرور سی نظر ڈالتے ہوئے کہا:

''اس وقت پارٹی کو ان کی بڑی ضرورت ہے۔ وہ بیمار ہیں، اللہ کرے جلد صحت یاب ہو جائیں۔ پیپلز پارٹی کے کارکن اور عوام چاہتے ہیں کہ بلاول بھٹو آئیں کیونکہ نیا چہرہ ہو گا اور سوچ بھی نئی ہو گی۔ اس میں بی بی کا چہرہ بھی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ لوگ اسے قبول کریں گے اور ان شاء اللہ تین چار ماہ کے اندر وہ آ جائیں گے۔''

میں نے تکلف برطرف اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''ہم آپ کو ایک فعال اپوزیشن لیڈر کا کردار ادا کرنے پر مبارکباد پیش کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہماری یہ بھی گزارش ہو گی کہ پارلیمنٹ کو فعال رکھنے اور اسے بااختیار بنانے کے لیے کوئی تدابیر اختیار کریں۔ اسی ایوان میں قومی پالیسیاں وضع کی جائیں اور عوامی مسائل پر بامعنی اور بارآور بحث ہونی چاہیے۔''

انھوں نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا: ''الطاف صاحب! میں نے آج ہی پارلیمنٹ میں بات کی ہے۔ جب حکومت پھنستی ہے تو پھر سب کو بلا لیتی ہے۔ عالمی تناظر میں خارجہ پالیسی کے اندر جو بڑی بڑی تبدیلیاں آ رہی ہیں، ان کے پیشِ نظر تمام سیاسی جماعتوں کو سر جوڑ کے بیٹھنا چاہیے کہ ہماری خارجہ پالیسی کی سمت کیا ہونی چاہیے۔ اوباما نے ہمارے سامنے انڈیا میں تین دن گزارے اور ان کے ساتھ نیوکلیئر ڈیل کر کے چلے گئے جو کہ ہمارے لیے کسی بڑے خطرے سے کم نہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ہم روس یا چین کی طرف تیزی سے قدم بڑھائیں یا ایران سے تعلقات میں بحالی پیدا کریں؟ کیا ہم Do more, do more میں پھنسے رہیں گے؟ حکومت کو چاہیے کہ یہ سارے امکانات پارلیمنٹ میں زیرِ بحث لائے اور ایک اتفاقِ رائے پیدا کرے۔ اس نے اگر ایسا نہ کیا تو اس کے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔''

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

طیب اعجاز نے دریافت کیا کہ آپ خاں صاحب اور حکومت کے درمیان معاہدہ کرانے کی پیشکش کر چکے ہیں۔ کیا اس میں کوئی پیش رفت ہوئی ہے؟

انھوں نے کسی توقف کے بغیر کہا:

''میں نے شاہ محمود قریشی سے بات کی تھی مگر جس روز اُن سے بات ہوئی وہ دوسرے دن عمرے پر چلے گئے۔ جب یہ بات اخبار میں اسحاق ڈار نے پڑھی تو انھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور کہا کہ ہمیں آپ کی پیشکش منظور ہے۔ ہم اپنے سینئر اراکین رضا ربانی اور اعتزاز احسن کو بٹھائیں گے اور دیکھیں گے کہ کون سچ کہہ رہا ہے اور کون جھوٹ بول رہا ہے۔''

میں نے شاہ صاحب کے سیاسی حصے کے بارے میں سوال کیا ''آپ سندھ کے حالات کیسے دیکھ رہے ہیں؟''

''سندھ میں گورننس کا مسئلہ آ رہا ہے۔ وہ ملٹی نیشنل صوبہ ہے جہاں سندھی بھی ہے، پنجابی بھی، پٹھان بھی، گجراتی بھی اور بلوچی بھی۔ یہ پنجاب، بلوچستان یا خیبر پختونخوا سے مختلف ایک ملٹی کلچر صوبہ ہے۔ مسائل آ رہے ہیں مگر ہم کوشش کر رہے ہیں کہ وہ جلد از جلد حل کر لیے جائیں۔''

''کیا وہاں کوئی لیڈر شپ موجود ہے جو بگڑتے ہوئے حالات میں بہتری لانے کی صلاحیت رکھتی ہو؟''

''ہاں لیڈر لوگ ہیں وہ سسٹم کو چلا رہے ہیں۔''

''آپ نجکاری کے حوالے سے بڑے سخت بیان دے رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حکومت ادارے چلا سکتی ہے؟'' طیب اعجاز نے ایک اہم قومی مسئلے کو موضوع بحث بنایا۔

''ہم یہ نہیں ہونے دیں گے کہ حکومت کسی کی منشا پر جسے کسی کی منشا پوری کرے۔ اب تک جو نجکاری ہوئی ہے اس میں شفافیت نظر نہیں آتی۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایم سی بی کی نجکاری شفاف ہوئی ہے، یا یو بی ایل ڈیل میں شفافیت تھی۔ یہ تیسری دنیا کا ملک ہے جو یورپ یا امریکہ نہیں ہے۔ آپ آہستہ آہستہ پرائیویٹ سیکٹر کو جگہ دیتے جائیں، مطلب یہ نہیں کہ آپ سارا کچھ پرائیویٹ کر دیں کہ یہ ممکن اور مناسب نہیں ہو گا۔ بھٹو صاحب نے سارا کچھ قومیا لیا تھا اور ملکی معیشت کو نقصان پہنچایا تھا۔''

ان سے ہمارا آخری سوال یہ تھا:

''انڈیا میں مودی جیسی طاقتور لیڈر شپ آ چکی ہے مگر ہماری لیڈر شپ ان کے ہم پلہ نظر نہیں آ رہی؟''

شاہ صاحب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا:

''ہمارے ہاں بھی لیڈر شپ اچھی ہونی چاہیے۔ کم از کم وزیراعظم نواز شریف کو خوف زدہ ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ انھیں آگے بڑھنا ہو گا کہ ساری اپوزیشن ان کے ساتھ ہے۔ ان کے آگے نہ بڑھنے سے میرے خیال میں ہمارا پورا سسٹم کنفیوژن کا شکار ہے اور یہ کنفیوژن جلد ختم ہونا چاہیے۔ میں اپنی سیاسی برادری اور اپنی نئی نسل سے اچھی توقعات رکھتا ہوں۔''

شاہ صاحب کراچی جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ ہم ان کی دلآویز شخصیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔ سرمئی شام کے ملگجے اندھیروں میں خنک ہوا کے نرم نرم جھونکے ہمارے مشام جاں کو تازگی اور فرحت بخش رہے تھے اور ایسی بہار کا مژدہ سنا رہے تھے جسے اندیشۂ زوال نہ ہو۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

رب کی بخشی عظیم دولت

حُسنِ قناعت

مصائب اور مشکلات کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عنایات بے پایاں کا شکر کرنا کبھی نہ بھولیے

پروفیسر ضوریز اختر

۲۰۰۳ء میں میرپور خاص سکھر جانے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد سے ریل بدلنا تھی۔ میرپور خاص سے کوئی ریل براہ راست سکھر نہیں جاتی۔ حیدرآباد اسٹیشن پر اترا تو سکھر کی ریل آنے میں تھوڑی دیر تھی۔ اہل خانہ ہمراہ تھے۔ ہم نے انتظارگاہ جانے کے بجائے پلیٹ فارم پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ پھر سوچا راستے کے لیے کچھ پھل وغیرہ لے لوں۔ یہ تمنا پوری کرنے دوسرے پلیٹ فارم پر جانا پڑا۔

جب پھل لیے پل پر سے اتر رہا تھا، تو پیچھے سے دھپ دھپ کی نامانوس آواز سنائی دی، جیسے کوئی چیز سیڑھیوں پر سے لڑھکتی آ رہی ہو۔ میں تھوڑا سا ایک طرف ہو گیا۔ پھر حیرت سے دیکھا پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی سیڑھیوں سے لڑھکتی نیچے جا رہی تھی۔ وہ مجھ سے پہلے نیچے پہنچ گئی۔ لڑکی کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھیں اور ایک ہاتھ بھی نہیں تھا۔ بدن پر کپڑے بھی پھٹے پرانے تھے۔

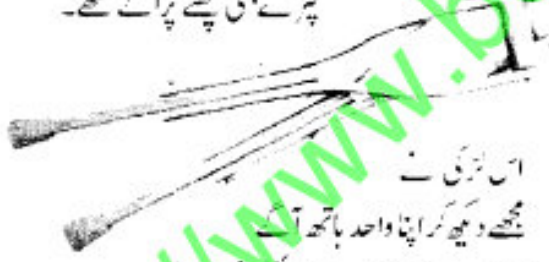

اس لڑکی نے مجھے دیکھ کر اپنا واحد ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ میری جیب میں پھل خریدنے کے بعد جو کھلے پیسے بچے تھے، شاید آٹھ دس روپے ہوں گے، میں نے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ لڑکی کے چہرے پر تب جو خوبصورت مسکراہٹ میں نے دیکھی زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ معصوم سادہ چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور وہ حسین مسکراہٹ اس کے چہرے ہی نہیں

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

روش روش سے روشنی کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ اس کی معصوم اور بے ساختہ مسکراہٹ دیکھ کر میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ احساسِ پشیمانی نے میرا سارا جسم پسینے سے شرابور کر دیا۔

اس لڑکی کے پاس مکمل بدن نہیں تھا۔ دنیا میں اسے کچھ بھی ملا نہیں تھا۔ اللہ بے نیاز ہے، اس کی قدرت کے راز وہ خود ہی جانتا ہے۔ مگر اس لڑکی کو چند سکے کیا ملے کہ جیسے ساری دنیا مل گئی۔ ایک ہم ہیں' جنھیں اللہ نے کتنا نوازا ہے پھر بھی ہم اس رب کائنات کے شکر گزار ہونے کے بجائے شکوہ و شکایت سے بھرے رہتے ہیں۔ جس سے ملیں گلہ کرتا ہے کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔ کوئی نہیں جو یہ کہے کہ اس خالق دو جہاں نے ہمیں جو کچھ جتنا کچھ دیا ہے، اس کا ہم نے کتنا حق ادا کیا!؟

لڑکی کے حسنِ قناعت نے میری آنکھیں جھنجھوڑ دیں۔ میں پھل لے کر اہلِ خانہ کے پاس پہنچا۔ وہ لڑکی بھی زمین پر رینگتی وہاں پہنچ گئی۔ مگر اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا، اپنے واحد ہاتھ سے سلام کرتی آگے چل دی۔ ظاہر ہے اسے ہم سے مدد مل چکی تھی۔ اس نے مجھے ایک بار پھر دیکھ لیا۔ تاہم میری والدہ نے اسے واپس بلا کر اس کی تھوڑی بہت مدد کر دی۔ اس کے چہرے پر وہی معصوم اجالا پھیل گیا۔ وہی روشنی جیسی مسکراہٹ جو میری یادوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

پچھلے سال مجھے پھر حیدرآباد کے ریلوے اسٹیشن پر رکنا پڑا۔ آنکھیں ہر طرف اس معصوم لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اور خوبصورت مسکراہٹ میں پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ اچانک کسی نے پانچ روپے کا سکہ زور سے پلیٹ فارم کے فرش پر پھینکا۔ پھر ایک پھنکارتی کرخت آواز میرے کانوں سے ٹکرائی: ”یہ پانچ روپے کا سکہ بھی تو ہی رکھ لے۔ برے وقت میں کام آئے گا۔“

صاحبِ مضمون

پروفیسر ضوریز اختر میرپور خاص کے ایک کالج میں نئی نسل کو تعلیم و تربیت دینے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ معاشرتی موضوعات کو زیرِ قلم بھی لاتے ہیں۔ یہ اردو ڈائجسٹ کے لیے آپ کی پہلی تحریر ہے۔

میں نے گھوم کر دیکھا، ایک موٹی سی عورت وہیل چیئر پر بیٹھی تھی۔ کپڑے صاف ستھرے تھے، لیکن چہرے پر مکروہ خشونت پھیلی ہوئی تھی۔ اسی نے بھیک میں ملا پانچ روپے کا وہ سکہ فرش پر پھینکا تھا۔ مجھ سے وہ مکروہ چہرہ زیادہ دیر دیکھا نہ جا سکا اور میں نے منہ پھیر لیا۔ ایک بار پھر میرے تصور میں اس لڑکی کا جگمگاتا چہرہ روشن ہو گیا۔ کتنا تضاد تھا ان دو چہروں، رویوں اور ان کے برتاؤ میں!

اللہ بڑا کارساز ہے۔ اپنی مصلحت وہی جانتا ہے۔ اگر ہم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں، تو ہمیں قدم قدم پر عبرت کے سامان نظر آتے ہیں۔ تتلی کے رنگوں، صبح کے اجالے، پھولوں کی مہک اور بہتے چشموں کے ٹھنڈے میٹھے پانی میں کئی سبق پوشیدہ ہیں۔ مجبوروں اور معذوروں کی زندگی میں بھی خوشیاں اور مسکراہٹیں ہیں، لیکن ان کے انداز الگ ہیں۔ کسی کو جو کچھ بھی قدرت کی طرف سے ملا، اس نے قناعت کرنا سیکھ لیا۔ جبکہ بعض محرومی کی اندوہناک تصویر بنے ہوتے ہیں۔

حسنِ قناعت ہی ہے جو ان کے چہروں پر معصوم مسکراہٹیں سجاتا ہے۔ کاش ہم بھی قناعت کرنا سیکھ لیں۔ آگے بڑھنے اور اوپر اٹھنے اور تیز چلنے کی کوشش ضرور کیجیے کہ اسی کا نام زندگی ہے۔ لیکن شکوہ، شکایت اور حرص و حسد نہ کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہے، اتنا نوازا ہے کہ ہم اس کی عنایات بے پایاں کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ملت اسلامیہ کے عظیم مجاہد

مولانا ثناء اللہ امرتسری

فتنہ قادیانیت کے تار و پود بکھیر دینے
والے نامور عالم دین کا قصۂ حیات

محمد نعمان طیب چنگوانی

ہمارا دین اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس کی اساس نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے پر ہے۔ خالق کائنات نے نیکی کا حکم دینے کی خاطر کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کو مبعوث فرمایا اور یہ سلسلہ خاتم النبیین حضور نبی کریم ﷺ پر آ کر تکمیل کو پہنچا۔ لیکن جوں جوں ملت اسلامیہ تفریق کے کلیے میں بٹتی گئی، اسلام اور ہمارے عقائد پر اغیار کی یورش برپا ہونے لگی۔

کبھی دین اسلام کی بنیاد پہ مغربی مفکرین نے ضرب لگائی، تو کبھی شدت پسند یہود و نصاریٰ نے اس کے خلاف دشنام طرازیاں کیں۔ کبھی متعصب ہندوؤں نے مخالفانہ پروپیگنڈا کیا، تو کبھی سکھوں نے دین اسلام کو فطرت کے منافی قرار دیا۔ یہ نہ تھمنے والا طوفان بدتمیزی جاری تھا کہ بیسویں صدی عیسوی میں ایک ملعون، مرزا غلام احمد قادیانی نے مار آستین کا کام کیا۔

جنوری ۱۸۹۱ء میں اس نے دعویٰ مسیحیت کر دیا۔ اسلام دشمن قوتوں نے اس کو بھرپور تقویت دینے کی ٹھانی اور فتنہ قادیانیت بڑی تیزی پھیلنے لگا۔

www.pdfbooksfree.pk

اب یہ وقت مسلمان علما کرام کے گھر اور مسجد میں بیٹھنے نہیں بلکہ میدان میں اتر کر طاغوت سے نبرد آزما ہونے کا تھا۔ اسی وقت مولانا محمد حسین بٹالوی تن تنہا اسلام مخالف قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہوئے۔ ان کے استغاثہ پر سید نذیر حسین دہلوی نے مرزا قادیانی پر سب سے پہلا فتویٰ تکفیر جاری کیا۔ یہی نہیں بلکہ برصغیر کے نامور علما کرام کے دستخط کروا کر قادیانیوں کے کفر پر مہر ثبت کر دی۔ اسی دوران ملت اسلامیہ کے ایک اور عظیم سپوت نے مرزا قادیانی کے چیلنج پر اس کے گھر جا کر اسے للکارا۔ تاریخ اس مرد حق کو فاتح قادیان' شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام سے جانتی ہے۔

ع مائیں جنتی ہیں ایسے بہادر خال خال

مولانا ثناء اللہ امرتسری وسیع المطالعہ، وسیع النظر، وسیع المعلومات اور باہمت عالم دین ہی نہیں دین اسلام کے داعی، محقق، متکلم، متعلم، مناظر، مصنف، مفسر اور نامور صحافی بھی تھے۔ آباؤ اجداد اصلاً کشمیر کے رہنے والے تھے۔ منٹو خاندان سے تعلق تھا۔ والد محترم کا نام خضر تھا جو ۱۸۶۰ء میں ڈوگرا حکمران رانا رنبیر سنگھ کی ستم رانیوں سے تنگ آ کر امرتسر میں سکونت پذیر ہوئے۔ وہیں ۱۸۷۰ء میں مولانا ثناء اللہ نے جنم لیا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم امرتسر میں پائی۔ سات سال کی عمر میں والد اور چودہ برس کی عمر تک پہنچتے والدہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ اس سے پہلے کہ احساس یتیمی متاثر کرتا، تقدیر آپ کو تاریخ میں امر کرنے کا عزم کر چکی تھی۔ بنیادی تعلیم مولانا احمد اللہ امرتسر سے حاصل کرنے کے بعد استاد پنجاب، مولانا حافظ عبدالمنان وزیرآبادی سے علم حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ ۱۸۸۹ء میں سند فراغت حاصل کر صحیحین پڑھنے دہلی سید نذیر حسین دہلوی کے پاس پہنچے۔

طلب علم کی پیاس ہی کچھ ایسی ہے جو بجھ نہیں پاتی۔ چناں چہ وہاں سے علمی و عملی طور پر بہرہ مند ہونے کے بعد مدرسہ مظاہرالعلوم سہارن پور سے مستفید ہوئے۔ انہی دنوں دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر مولانا محمود حسنؒ فائز تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری باقاعدہ ان کے حلقہ شاگردی میں بھی شامل ہوئے۔ آپ ہمیشہ دیوبند کی سند فراغت کو اپنے لیے باعث افتخار قرار دیتے تھے۔

ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

کے مصداق علم کی پیاس بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ آپ پھر فیض عام مدرسہ، کانپور پہنچے۔ ۱۸۹۶ء میں مدرسہ فیض عام میں ایک جلسہ ہوا اور آٹھ طلبہ کو سند فراغت دی گئی۔ ان آٹھ طلبہ میں ایک مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا۔

مولانا کے پیش نگاہ دفاع اسلام اور پیغمبر اعظم جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی عزت و ناموس کی حفاظت کا کام تھا۔ یہود و نصاریٰ کی طرح ہندو بھی اسلام کے درپے آزار تھے۔ مولانا کی اسلامی حمیت نے یہود و نصاریٰ، ہندو اور قادیانیوں کو دندان شکن جواب دیے۔ عیسائیت کے رد میں آپ نے درج ذیل کتب لکھیں:

۱۔ تقابل ثلاثہ: ۱۹۰۴ء میں پادری ٹھاکر دت کی کتاب ''عدم ضرورت قرآن'' کے جواب میں۔

۲۔ جوابات نصاریٰ: ۱۹۳۰ء میں پادری سلطان پال کے جواب میں تحریر کی گئی۔

۳۔ توحید تثلیث اور راہ نجات: ۱۹۱۴ء میں شائع

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہوئی۔

۴۔ اسلام اور مسیحیت: اس میں عیسائیوں کی تین کتابوں کا بخوبی جواب دیا۔

۵۔ تفسیر سورۂ یوسف اور تحریفات بائبل: اس میں ثابت کیا کہ عیسائیوں نے ہر دور میں بائبل میں تحریفات کی ہیں۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہندو بھی اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔ آپ نے درج ذیل کتب ہندوؤں کو جواب دینے کی خاطر لکھیں:

۱۔ حق پرکاش: ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی۔ ستیارتھ پرکاش نے قرآن مجید پر جو ۱۵۹ اعتراضات کیے تھے، مولانا نے ان کا منہ توڑ عالمانہ جواب لکھا۔

۲۔ کتاب الرحمن: پنڈت دھرم کی کتاب ''کتاب اللہ وید ہے یا قرآن'' کا مسکت جواب تحریر کیا۔

۳۔ ترک اسلام: غازی محمود المعروف دھرم پال ۱۹۰۳ء میں ہندو ہو کر آریہ سماج چلے گئے اور ایک زہریلی کتاب ''ترک اسلام'' لکھی۔ اس سے مسلم حلقوں میں کافی بے چینی پھیل گئی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس کا جواب ''ترک اسلام'' کی شکل میں لکھا۔ اسی کتاب کو پڑھ کر دھرم پال دوبارہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

۴۔ مقدس رسول: یہ نام رسالہ ''رنگیلا رسول'' کے جواب میں لکھی گئی۔ مولانا روم ''مقدس رسول'' اور ''اسلام اور مسیحیت'' کو اپنے لیے باعث نجات سمجھتے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ آپ نے جس سرگرمی و تندہی سے عقیدہ ختم نبوت ﷺ کا دفاع کیا، ایسی سعادت کم ہی مسلمانوں کے حصے میں آئی ہے۔ آپ نے اسلام کی حقانیت کو ہر موڑ پر ہر حوالے سے ثابت کیا۔ ۱۸۹۱ء میں جب مرزا قادیانی نے دعوی مسیحیت کیا' آپ اس وقت طالب علم تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں آپ نے ردِ قادیانیت کو اختیار کر لیا۔ آپ نے پھر قادیانیت کے خلاف اتنا جوش و خروش دکھایا کہ مرزا قادیانی اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گیا۔

ردِ قادیانیت میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے درج ذیل تصانیف لکھیں:

''تاریخ مرزا، فیصلہ مرزا، الہامات مرزا، نکات مرزا، عجائبات مرزا، علم کلام مرزا، شہادت مرزا، شاہ انگلستان اور مرزا، تحفہ احمدیہ، مباحثہ قادیانی، مکالمہ احمدیہ، فتح ربانی، فاتح قادیان اور بہاءاللہ اور مرزا۔''

درج بالا تصانیف کے علاوہ آپ نے لاتعداد مناظرے کیے اور ہر جگہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا۔ آپ بھی مولانا کی حاضر جوابی اور برجستہ گوئی پڑھیے اور سر دھنیے۔

اردو ادب کے نامور ادیب اور مفسر قرآن، مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں، ایک جگہ معروف آریہ سماجی مناظر نے شروع میں ہی خم ٹھونک کر مولانا سے کہا ''آپ مسلمان ہی کب ہیں جو اسلام کی طرف سے وکیل بن کر آ گئے؟ یہ دیکھیے، مسلمان علما کے فتاوی، یہ سب آپ کی تکفیر میں ہیں۔'' یہ کہا اور میز پر فتووں کا ڈھیر لگا دیا۔

جب وہ اپنی کہہ چکا تو مولانا مڑ کر بولے ''اچھا صاحب! میں ابھی مسلمان ہوتا ہوں اور آپ تمام حاضرین مجلس گواہ رہیں۔'' یہ کہہ کر بآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا اور بولے ''فرمائیے اب تو کوئی خرابی نہ رہی؟''

مسلمان خوشی سے باغ باغ ہو گئے اور آریہ سماجی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

ایک اور جگہ عیسائی مناظر نے دوران مناظرہ کہا ''اگر آپ کے رسول کریم ﷺ کے اتنے ہی مقبول تھے، تو اپنے لختِ جگر حسینؓ کو کربلا میں شہید ہوتے دیکھ کر ان کی سفارش کیوں نہ کی؟''

مولانا مرحومؒ نے نہایت متانت سے جواب دیا ''کہا تو تھا مگر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا، ظالم عیسائیوں نے میرے اکلوتے بیٹے مسیحؑ کو صلیب پر لٹکا دیا اور میں کچھ نہ کر سکا، حسینؓ تو پھر بھی تیرا نواسہ ہے۔''

یہ جواب سن کر عیسائی مناظر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ خوبیوں سے نوازا تھا بقول اقبالؒ

ع وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

عقیدہ ختم نبوت کا دفاع کرنے کی تاریخ جب بھی لکھی گئی، اس میں مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کا ذکر سنہرے حروف میں آئے گا۔ آپ ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ جب تک روئے کائنات پر ایک بھی مسلمان باقی ہے، عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ اور دفاع جاری رہے گا۔

نہ جب تھا نہ اب ہے نہ ہو گا میسر
شریک خدا اور جواب محمدؐ

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

طرزِ حکمرانی میں بے مثال خلیفہ دوم

حضرت عمر فاروقؓ اور ایک عیسائی بھکاری

راہِ ہدایت کی روشنی سے زندگی منور کرنے والے زریں اسلامی واقعات

امیر حمزہ مشتاق احمد

ایک روز امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب کہیں سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک نابینا بوڑھا ہاتھ میں کشکول لیے بھیک مانگ رہا ہے۔ شکل و صورت سے ذمی معلوم ہوتا تھا۔

حضرت عمر بن خطاب نے اس کے بازو پر تھپکی دی اور پوچھا "اہل کتاب کی کس قوم سے تمھارا تعلق ہے؟"

نابینا بھکاری: "یہودی ہوں۔"

امیر المومنین: "میں تجھے کشکول اٹھائے دیکھتا ہوں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟"

نابینا بھکاری: "ایک تو جزیہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا میری زندگی کی ضروریات بھی ہیں۔ تیسرا میں بوڑھا ہوں اس لیے مانگتا ہوں تاکہ میری ضروریات زندگی کا مسئلہ بھی حل ہو اور جزیہ بھی ادا کروں؟ لہٰذا بھیک مانگ رہا ہوں۔"

امیر المومنین نے جب اس کی بات سنی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور کچھ نقدی عطا فرمائی۔ پھر بیت المال کے خازن کو یہ پیغام دیا:

"اس نابینا بوڑھے یہودی اور اسی طرح کے دوسرے اہل کتاب کا خوب خیال رکھو! اللہ کی قسم! ہم

www.pdfbooksfree.pk

نے اس بوڑھے یہودی کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس کی جوانی میں تو ہم اس سے ٹیکس لیتے رہے، اب بڑھاپے میں اس کو ذلیل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: ''یقیناً صدقات و خیرات فقراء، مساکین کے لیے ہیں۔'' (التوبہ: ۶۰) لہٰذا یہ بوڑھا نابینا اہل کتاب کے مسکینوں میں سے ہے۔'' امیر المومنینؓ نے پھر بوڑھے اور اس کے مانند دوسرے ضعیف و غریب اہل کتاب پر سے جزیہ ساقط کر دیا۔

حکمران اور رعایا

حجاج بن یوسف، اموی گورنر کے زمانے میں جب لوگ صبح کو بیدار ہوتے اور ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی، تو باہم پوچھتے: گزشتہ رات کون قتل کیا گیا؟ کس کو پھانسی ہوئی؟ کس کو کوڑے لگے؟

اموی خلیفہ، ولید بن عبدالملک کثیر مال و جائداد رکھنے والا اور عمارتیں بنانے کا شوقین تھا۔ چناں چہ اس کے زمانے میں لوگ ایک دوسرے سے مکانات کی تعمیرات، نہروں کی کھدائی اور درختوں کی افزائش کے متعلق پوچھا کرتے۔

جب اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے حکومت کی کرسی سنبھالی، تو وہ کھانے پینے اور گانے بجانے کا شوقین بھی نکلا۔ چناں چہ لوگ اچھے کھانوں، گانے والیوں اور لونڈیوں کے متعلق ایک دوسرے سے پوچھتے اور ان کا یہی موضوعِ سخن ہوتا۔

جب عمر بن عبدالعزیزؒ منصب خلافت پر فائز ہوئے، تو لوگوں کی آپس میں اس قسم کی گفتگو ہوتی: قرآن کتنا یاد کیا؟ ہر رات کتنا ورد کرتے ہو؟ رات کو کتنے نوافل پڑھتے ہو؟ فلاں شخص مہینے میں کتنے دن روزے سے رکھتا ہے؟ کسی نے سچ کہا ہے:

''عام لوگ بالعموم اپنے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کر لیتے ہیں۔''

اینٹ اور شراب

شرابی ایک عالم دین سے: جناب مجھے بتائیے کہ اگر میں کھجوریں کھاؤں، تو آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

عالم: بالکل کوئی اعتراض نہیں۔

شرابی: اگر اس کے ساتھ کچھ جڑی بوٹیاں کھالوں؟

عالم: کوئی رکاوٹ نہیں۔

شرابی: اگر میں ان میں پانی شامل کرلوں؟

عالم: بڑے شوق سے۔

شرابی: جب یہ ساری چیزیں جائز اور حلال ہیں، تو پھر آپ شراب کو کیوں حرام کہتے ہیں؟ حالانکہ اس میں بھی یہی چیزیں شامل ہیں جن کے کھانے پینے کی اجازت آپ دے چکے۔

عالم: اگر تمھارے اوپر پانی پھینکا جائے، تو اس پر تمھیں کوئی اعتراض ہوگا؟

شرابی: ہرگز نہیں، پانی سے کیا فرق پڑتا ہے۔

عالم: اگر اس پانی میں مٹی گھول دی جائے تو تم مر جاؤ گے؟

شرابی: جناب! اس سے میں نے کسی کو مرتے نہیں دیکھا۔

عالم: اگر میں مٹی اور پانی لوں، انھیں گوندھ کر ایک اینٹ بنالوں اور اسے خشک کر کے تمھیں دے ماروں، تو کیا تمھیں کوئی اعتراض ہے؟

شرابی: اس سے تو آپ مجھے قتل کر دیں گے۔

عالم: شراب کا بھی یہی حال ہے۔ وہ آخرکار انسان

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کو مار ڈالتی ہے۔

بہن بھائی

ایک صاحب کا بیان ہے، ایک مرتبہ سفر کے دوران راستہ بھٹک گیا۔ چلتے چلتے بیاباں میں مجھے ایک گھر نظر آیا۔ میں قریب پہنچا، تو ایک اعرابیہ گھر کے اندر تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا ''تم کون ہو؟''

میں نے جواب دیا ''مہمان۔''

اعرابیہ نے میرے لیے کھانا حاضر کیا۔ میں کھانا تناول کرنے لگا۔ ابھی پانی پی رہا تھا کہ اتنے میں اس کا شوہر آیا اور پوچھا ''یہ کون ہے؟''

عورت نے جواب دیا ''مہمان۔''

شوہر نے کہا ''مہمان کا آنا مبارک ہے۔ ہمیں مہمان نوازی سے کیا واسطہ؟''

میں نے یہ بات سنی، تو اسی وقت اپنا راستہ لیا اور آگے چل پڑا۔ دوسرے دن بیاباں ہی میں ایک بار دوسرا گھر نظر آیا۔ میں نے اس کا رخ کیا۔ دروازے پر پہنچا، تو وہاں ایک اعرابیہ کھڑی نظر آئی۔ اس نے پوچھا ''تم کون ہو؟''

جواب دیا ''مہمان۔''

اس نے کہا ''مہمان کے لیے ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اس کی آمد نامبارک ہے۔''

اس دوران اعرابیہ کا شوہر پہنچا۔ اس نے مجھے دیکھا، تو پوچھا ''یہ کون ہے؟''

عورت نے جواب دیا ''مہمان ہے۔''

شوہر نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور کہا ''مہمان کا آنا مبارک ہے۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔''

اس نے پھر میرے لیے عمدہ اور لذیذ کھانا حاضر کیا۔ مزے سے کھانا تناول کرتے ہوئے مجھے کل کا واقعہ یاد آ گیا۔ چناں چہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔

میزبان مجھے ہی تک رہا تھا۔ دریافت کیا ''کیوں مسکرا رہے ہو؟''

میں نے جواباً سارا قصہ اس کے گوش گزار کیا۔ اعرابیہ اور اس کے شوہر کی جو گفتگو سنی تھی، وہ بتائی۔ میزبان نے کہا ''بھئی تعجب مت کرو! جس عورت کو کل تم نے دیکھا وہ میری بہن تھی اور اس کا شوہر میری بیوی کا بھائی ہے۔ چونکہ دونوں ایک ہی مٹی سے بنائے گئے لہٰذا یکساں فطرت رکھتے ہیں۔''

انجامِ تکبّر

ایک مالدار شخص صفا اور مروہ کے درمیان گھوڑے پر سوار سعی کر رہا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سعی مسجد حرام کے احاطے سے باہر تھی۔ اس کے اردگرد چھوٹے بڑے غلاموں اور نوکروں کا ہجوم تھا جس سے راستہ تنگ پڑ گیا۔ یہ دیکھ کر سعی کرنے والے دیگر لوگوں کو سخت غصہ آیا۔ وہ گھور گھور کر اس آدمی کو دیکھنے لگے جو خاصا مغرور لگتا تھا۔

اسی سال حج کرنے والوں میں سے کسی کی ملاقات چند برس بعد اس مالدار سے ہوئی۔ وہ اب بغداد کے پل پر بیٹھا بھیک مانگ رہا تھا۔ حاجی نے اس مالدار سے (جو اب بھکاری بن چکا تھا) کہا ''تو وہی آدمی تو نہیں جس نے فلاں سال حج کیا اور تیرے اردگرد غلاموں اور نوکروں کا اس قدر ہجوم تھا کہ دیگر لوگوں کے لیے تل دھرنے کی جگہ کم پڑ رہی تھی۔''

بھکاری نے جواب دیا ''ہاں میں وہی ہوں۔''

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

حاجی نے پوچھا "مگر تمھاری یہ حالت کیسے ہوئی؟"

وہ بولا "میں نے اس جگہ کبر و نخوت کو اختیار کیا جہاں متقی و پرہیز گار لوگ تواضع و انکسار اختیار کرتے ہیں۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس جگہ ذلیل خوار کر دیا جہاں گناہ گار معافی پا کر اعلیٰ مقام پاتے ہیں۔"

دندان شکن جواب

حجاج بن یوسف ثقفی نے ایک عرب سردار، ابن فجاۃ کے بھائی کو گرفتار کرایا اور کہا "میں تجھے ضرور قتل کروں گا۔"

قیدی نے کہا "آخر سبب کیا ہے؟"

حجاج نے کہا "تیرے بھائی نے میرے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا۔"

قیدی نے جواب دیا "میرے پاس امیر المومنین کی جانب سے لکھا ہوا یہ حکم موجود ہے کہ میرے بھائی کی غلطی کی سزا مجھے نہیں دے گی۔"

حجاج بولا "لاؤ مجھے دکھاؤ۔"

قیدی نے کہا "میرے پاس امیر المومنین کے خط سے زیادہ اہم آسمانی خط ہے۔" پھر کہنے لگا "میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔" (الانعام: ۱۶۴)

حجاج یہ دندان شکن جواب سن کر تعجب میں پڑ گیا اور آخر کار اس کو چھوڑ دیا۔

مقروض بری ہوا

ایک دفعہ شہر قاضی کے پاس چند لوگ ایک شخص کو پکڑے داخل ہوئے۔ قاضی نے پوچھا "کیا ماجرا ہے؟"

وہ کہنے لگے "یہ ہمارا مقروض ہے۔ ہم اس سے قرض کی ادائی کے لیے کہہ رہے ہیں اور یہ ادا نہیں کرتا۔"

قاضی نے مقروض کو حکم دیا کہ وہ قرض خواہوں کا قرض ادا کر دے۔

مقروض نے کہا "قاضی صاحب کی خیر ہو۔ میں نے ایک عمارت کرائے پر دے رکھی ہے۔ کچھ عرصے کی بات ہے مجھے کرایہ ملنے والا ہے۔ جیسے ہی کرایہ ملا میں سب کا قرض ادا کر دوں گا۔"

قاضی نے قرض خواہوں کی طرف استفسار بھری نگاہ سے دیکھا کہ وہ کیا کہتے ہیں؟

قرض خواہ کہنے لگے "اللہ کی قسم! ہمارے علم میں تو اس کی کوئی عمارت یا جائداد نہیں۔ یہ ہمیں ٹالنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ حقیقت میں یہ مفلس اور قلاش ہے۔"

قرض خواہوں کی بات سن کر قاضی مقروض کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "آپ تم جا سکتے ہو۔ لیکن اسی شہر میں رہنا ورنہ قید ہو جانے کا اندیشہ ہے۔"

یہ فیصلہ سن کر قرض خواہ چونک اٹھے اور کہنے لگے "قاضی صاحب! آپ نے یہ کیا فیصلہ کر دیا؟"

قاضی نے کہا "تم لوگوں نے خود ہی مقروض سے متعلق یہ گواہی دی ہے کہ اس کے پاس کوئی عمارت نہیں اور یہ مفلس اور قلاش ہے۔ خدا نے جب کوئی مفلس ہو تو وہ قرض کی رقم کہاں سے ادا کرے گا؟ ہم حال سے مہلت دی ہے۔ شاید وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر قرض ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔ اسے قید میں ڈالا تو تمھیں بھی رقم واپس نہ ملے گی۔"

فرض شناسی

پہلے عباسی خلیفہ ابوالعباس سفاح کا ایک بھائی ابو جعفر منصور تھا۔ جب وہ طلب علم کے لیے ادھر ادھر پھرا کرتا تھا، تو ایک دن اسی منزل پر اترا جہاں ہر

www.pdfbooksfree.pk

آدمی سے دو درہم محصول لیا جاتا۔ چوکیدار نے کہا "آپ محصول ادا کیے بغیر یہاں قیام پذیر نہیں ہو سکتے۔"

منصور نے کہا "میں بنو ہاشم میں سے اور ابوالعباس کا بھائی ہوں۔ محصول سے درگزر کرو۔"

چوکیدار نے کہا "میں حکم حاکم سے مجبور ہوں۔"

منصور نے کہا "میں رسول اللہ ﷺ کے چچا کے بیٹوں میں سے ہوں۔"

چوکیدار نے کہا "جو آئین ہے، اس کے خلاف کس طرح عمل کر سکتا ہوں؟"

منصور نے کہا "میں قرآن مجید جانتا ہوں۔ عالم، فقیہ اور عالم فرائض ہوں۔ دو درہم کیا، میں ہزار درہم کا ایک نکتہ بیان کروں گا۔"

چوکیدار نے کہا "یہ سب صحیح، لیکن آئین سلطنت میں کسی کے ساتھ رواداری جائز نہیں۔ لہٰذا مجھے اس معاملے میں معذور سمجھو۔"

اس تاریخی واقعے سے عیاں ہے کہ ایک ادنیٰ چوکیدار اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس شخص کا کوئی لحاظ نہیں کرتا جو بنو ہاشم میں سے ہے، عالم اور فقیہ ہے اور کچھ عرصے بعد خلیفہ بننے والا ہے۔ پاکستان میں کیا سرکاری و نجی ملازمین اپنے فرائض کی بجا آوری میں ایسی ہی مستعدی کے ساتھ قانون پسندی اور حریت کا اظہار کرتے ہیں؟

◆◆◆

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز ناول نگار گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: "لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔"

اردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اصلاحی موضوع پر قلم اٹھائیے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قارئین کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنائے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

"ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔"

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

www.pdfbooksfree.pk

روزمرہ کام کاج میں راہنما

اللہ کی کتاب سے انٹرویو

احکاماتِ قرآنی سمجھنے سمجھانے کا جدید انداز

افتخار حسین

انسان کا بنیادی حق ہے۔ آج کے دور میں صحیح معلومات تک رسائی بے حد ضروری ہے۔ **جاننا** کیوں نہ ہم اپنے من میں اٹھنے والے ایسے سوالات جو زندگی بسر کرنے کے لیے بے حد اہم ہیں' انسانوں کے بجائے اللہ کی کتاب سے دریافت کریں؟ قرآن پاک میں رہتی دنیا تک کے واسطے ہدایت اور راہنمائی موجود ہے۔

س: کیا انسان کے علاوہ مخلوقات بھی رب کائنات کی تسبیح کرتی ہیں؟

ج: ''کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے اور اللہ کو ان کے اعمال کا بخوبی علم ہے۔''

(سورۂ نور۔۴۱)

س: کیا دوسری مخلوقات کی تسبیح کو ہم سمجھ سکتے ہیں؟

ج: ''اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی ثنا میں تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔''

(سورۂ احقاف:۳۹،۳۸)

س: ہمیں اپنی نماز کس طرح پڑھنی چاہیے؟

ج: ''اور آپ اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھیں، نہ بہت آہستہ بلکہ درمیانی راستہ اختیار کریں۔''

(سورۂ بنی اسرائیل:۱۱۰)

س: کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی معبود ہے؟

ج: ''وہ مشرق اور مغرب کا رب ہے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا اسی کو اپنا ضامن بنائیے۔''

(سورۂ مزمل:۹)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

س: ہمیں کس کی اطاعت کرنی چاہیے؟

ج: ''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

(سورۂ محمد: ۳۳)

س: نبی اکرم ﷺ کو کن لوگوں کے لیے بشارت دینے کا حکم ہوا؟

ج: ''اے رسول ﷺ! میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجیے جو ہر بات سنتے ہیں لیکن ان میں سے بہترین اور احسن کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور یہی صاحبانِ عقل۔''

(سورۂ الزمر: ۱۸،۱۷)

س: ہمارا نام مسلمان کس نے رکھا؟

ج: ''یہ تمھارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔ اسی نے تمھارا نام مسلمان رکھا ہے۔'' (سورۂ حج: ۷۸)

س: قرآن مجید کن لوگوں کے لیے ہدایت ہے؟

ج: ''یہ (قرآن) ہدایت ہے۔ پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' (سورۂ البقرہ: ۲۔۱)

س: ہماری سرپرستی اور مدد کے لیے کون کافی ہے؟

ج: ''اور تمھاری سرپرستی کے لیے اللہ کافی ہے اور تمھاری مدد کے لیے بھی اللہ کافی ہے۔''

(سورۂ النساء: ۴۵)

س: قیامت کا علم کس کے پاس ہے؟

ج: ''قیامت کا علم یقیناً اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ارحام میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ کس سرزمین پر اسے موت آئے گی۔ یقیناً اللہ خوب جاننے والا، بڑا باخبر ہے۔''

(سورۂ لقمان: ۳۴)

قارئین میری اس کوشش سے اگر ایک مسلمان بھی استعفادہ کر لے، تو خود کو کامیاب سمجھوں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس عظیم کتاب سے ہدایت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

◆◆◆

مشورہ حاضر ہے

قارئین کے لیے خوش خبری

ماہ اپریل سے اردو ڈائجسٹ میں ''مشورہ حاضر ہے'' کا مقبول سلسلہ دوبارہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اب اسے رخسانہ فضل صاحبہ تحریر کریں گی۔ رخسانہ صاحبہ کا تعلق تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ لاہور کی ایک فلاحی تنظیم، خدمت النساء سے منسلک ہیں۔ تنظیم کے زیراہتمام ایک اسکول میں غریب بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اس اسکول سے بھی وابستہ ہیں۔

خواتین وحضرات رخسانہ صاحبہ سے کسی بھی طبی، گھریلو، نفسیاتی وغیرہ مسئلے کا حل دریافت کر سکتے ہیں۔ ان کی سعی ہوگی کہ شافی رہنمائی کی جائے۔

مسئلہ بھیجنا اب پہلے کی نسبت بہت آسان ہو چکا۔ موبائل نمبر 0303-4480814 پہ اپنا مسئلہ میسج کیجیے۔ (فی الحال یہ نمبر صرف پیغام بھیجنے کے لیے ہے) یا فون نمبر 042-35290738 پہ مسئلہ لکھوائیے۔ یا اردو ڈائجسٹ کے پتے پر خط ارسال کیجیے۔ ہمارا شعار ہے ''بھلائی کیجیے، بھلائی پائیے''۔ (ادارہ)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

دنیا بھر میں ریکارڈ بنانے والی فلم

"پی کے" کو کیا چیز لے ڈوبی؟

اس معاشرتی فلم میں "مسالے" کی شمولیت نے سارا مزا غارت کر ڈالا

ابو سارم

فلمیں بہت کم دیکھتا ہوں۔ لیکن پچھلے دنوں میں دوستوں نے باصرار "پی کے" نامی فلم دکھا دی۔ ہر فلم کی طرح یہ بھی خامیاں اور خوبیاں رکھنے والی تخلیق ثابت ہوئی۔ گو اس نے نئی ریکارڈ قائم کیے۔ مثلاً یہ کہ سب سے زیادہ کمائی کرنے والی فلم بن گئی۔ یہ اب تک پوری دنیا میں ۱۰ کروڑ ڈالر سے زائد رقم کما چکی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم دس ارب روپے سے زیادہ بنتی ہے۔

یہ فلم مذہبی توہمات اور ان انسانوں کے خلاف ہے جو مذہب کے نام پر کاروبار کرتے ہیں۔ فلم کا پیغام یہ ہے کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق پیدا کرنا چاہیے۔ اللہ پاک تک پہنچنے کے لیے کسی انسان کا سہارا لینا بے فائدہ اور کارزیاں ہے۔

فلم کا بنیادی موضوع ہندومت کی توہمات ہیں۔ ظاہر ہے، جس مذہب

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

میں لاکھوں دیوی دیوتا ہوں، اس میں سیکڑوں رسوم و رواج رائج ہو جاتی ہیں۔ ان رسوم نے بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ اسی لیے بعض اسلامی رسوم کی بھی اصل ہندوانہ ہے۔

مذہب کا اصل کردار انسان کو نیک و متقی بنانا ہے۔ اسی لیے اخلاقیات اور مذہب لازم و ملزوم حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام وہ دین ہے جس میں انسان کا اخلاقی کردار سنوارنے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس سچائی کا اندازہ یوں لگائیے کہ تمام مسلمانوں میں متقی مسلمان ہی بلند ترین درجہ رکھتا ہے۔

بعض لوگ مذہب کو بنی نوع انسان کی تمام تکالیف کا منبع قرار دیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط نظریہ ہے۔ یہی دیکھیے کہ جنگ اول اور جنگ دوم مذہب کی وجہ سے انجام نہیں پائیں جن میں کروڑوں انسان مارے گئے۔ سچا مذہب تو انسانوں کو خیر و فلاح کی طرف بلاتا اور ظلم مٹانے کی تلقین کرتا ہے۔

مذہب کی مخالفت نے مادہ پرستی کے بطن سے جنم لیا کہ مذہب زر، زمین اور زن کی ہوس کے آگے بند باندھتا اور پابندیاں لگاتا ہے۔ اسی لیے مادہ پرستی کے رسیا مذہب کو پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے دنیائے مغرب میں تو مذہب کو بہت محدود کر دیا۔ اب وہ عالم اسلام میں بھی اس کا کردار کم سے کم بلکہ نعوذ باللہ ختم کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے دراصل انسان کو خود مختار بنایا ہے..... وہ چاہے تو نیکی و محبت کی طرف راغب ہو جائے یا پھر ظلم اور نفرت کا فرستادہ بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض انسان ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر مذہب کا نام لے کر دہشت گردی کرتے اور دنگا فساد مچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں ہی کا ٹھکانا جہنم بنتا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارت میں مذہبی کاروبار بہت منافع بخش بن چکا۔ اسی لیے آئے دن وہاں نت نئے ''سوامی''، ''گرو''، ''مہاراج'' وغیرہ سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ نام نہاد مذہبی راہنما خدا کے نام پہ عام ہندوؤں سے سالانہ کروڑوں روپے کماتے ہیں۔ انھوں نے بھارت میں جا بجا مندر، آشرم اور دیگر مذہبی عمارتیں کھول رکھی ہیں۔ وہاں ''بھگوان'' کے نام پر چندہ لیا جاتا اور رقم لے کر ''پرشاد'' بٹتے ہیں۔ ''پی کے'' فلم میں ہندو مذہب کی اسی تجارت کو نشانہ بنایا گیا۔ یہ جوگی، سوامی اور گرو وغیرہ ہر قسم کی فحش حرکات اور مکروہ دھندوں میں بھی ملوث ہیں۔

لیکن جیسا کہ درج بالا لکھا گیا، پی کے فلم دیکھ کر مذہب ہی کو عصبیت کی جڑ سمجھنا انتہائی غلط سوچ ہے۔ یہ مذہبی احکامات اور قوانین ہی ہیں جو معاشرے میں نظم و ضبط پیدا کرتے اور انسانی مزاج میں اعتدال لاتے ہیں۔ فرانسیسی مدبر، نپولین بونا پارٹ کا قول ہے: ''اگر مذہب نہ ہوتا، تو امیر لوگ غریبوں کو کچا چبا جاتے۔''

پی کے فلم کی ایک خرابی یہ ہے کہ اس میں بعض فحش مناظر نہ ہوتے، تو کہانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان مناظر کو شاید اس لیے فلمایا گیا کہ عام لوگوں کو کچھ ''مسالا'' مل جائے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ کم از کم پاکستان میں ایک شائستہ اور مذہبی گھرانے میں والدین ان فضول اور بے محل مناظر کی وجہ سے بچوں کے ساتھ یہ فلم نہیں دیکھ سکتے۔

دراصل اس فلم کے ڈائریکٹر، راج کمار ہیرانی اپنی فلموں میں ناشائستہ مناظر ضرور ڈالتے اور یوں اچھی خاصی فلم کا بیڑا غرق کر دیتے ہیں۔ منا بھائی ایم بی بی ایس، لگے رہو منا بھائی اور تھری ایڈیٹ جیسی فلمیں انھی کی ہدایت کاری میں بنیں۔ یہ بھی معاشرتی و اصلاحی فلمیں ہیں۔ مگر ہر فلم میں دو تین ایسے مناظر ضرور ملتے ہیں جو اہل خانہ کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھے جا سکتے۔

ہمارے مذہب میں شرم و حیا ایمان کا ایک جزو ہے۔ افسوس کہ ہندومت میں حیا کی عظیم روایات تابناک نظر نہیں آتیں بلکہ فحاشی کو آزادی رائے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk
http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

دلچسپ بات یہ ہے کہ پی کے فلم کے ڈائریکٹر اور پروڈیوسر، دونوں کے اجداد کا تعلق بھارت سے نہیں۔ راج کمار ہیرانی کے والدین سندھی الاصل ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل وہ پاکستانی صوبہ سندھ کے شہر محراب پور میں مقیم تھے۔ ۱۹۴۷ء میں سریش ہیرانی ناگ پور ہجرت کر گئے۔ وہاں انھوں نے ٹائپنگ سکھانے والا ادارہ کھولا اور روزی کمانے لگے۔

پروڈیوسر، ودھو ونود چوپڑا تو افغانستان کے دارالحکومت کابل میں پیدا ہوئے۔ پھر ان کے والد ذکی این چوپڑا سری نگر، کشمیر چلے گئے۔ ونود وہیں پلے بڑھے اور ہندی فلموں سے عشق کرنے کے باعث بالی وڈ آ نکلے۔

راج کمار ہیرانی کی طرح فلم کا ہیرو عامر خان بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے والد طاہر حسین ناکام فلم ساز (پروڈیوسر) تھے۔ انھوں نے ۱۲ فلمیں بنائیں اور کوئی بھی اچھی کمائی نہیں کر سکی۔ عامر خان بتاتا ہے:

''میرے والد کی فلمیں طویل عرصے بنتی تھیں۔ اداکار اور اداکارائیں انھیں بہت تنگ کرتے۔ وہ وقت پر سیٹ پر نہ آتے۔ ابو کو ان کے پیچھے جوتے چٹخانے پڑتے۔ اکثر فلم پر سرمایہ لگانے والے لوگ ان کے پیچھے پڑے ہوتے۔ یوں وہ دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جاتے۔

''مجھے یاد ہے، ایک فلم آٹھ سال میں مکمل ہوئی۔ اسی طرح ''خون کی پکار'' فلم کے مکمل ہونے میں تین سال لگا دیے۔ اس دوران ہم پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے۔ ایک بار چھے ماہ تک ابو اسکول کی فیس نہ دے سکے۔ ہم پر یہی تلوار لٹکتی رہی کہ کسی بھی وقت ہم بچوں کو اسکول سے نکالا جا سکتا ہے۔

''امی جب بھی ہم بچوں کے کپڑے خریدنی جاتیں تو وہ ہمارے سائز سے تین گنا بڑے ہوتے۔ مدعا یہی ہوتا کہ وہ تین چار سال تک چل جائیں۔''

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیے کہ انھوں نے بعد ازاں عامر خان کو دنیاوی کامیابیوں سے سرفراز کیا اور آج وہ ارب پتی ہے۔ غربت کا مزا چکھنے والا عامر خان شاید اسی لیے انکسار پسند ہے اور اس میں امرا جیسی اکڑفوں نہیں پائی جاتی۔

چند دلچسپ حقائق

☆ فلم کے ہیرو کو پان پسند ہیں۔ اسی لیے ہر منظر میں عامر خان کے ہونٹ سرخ نظر آتے ہیں۔ لیکن عامر نے ہونٹ لال رنگ سے نہیں رنگے، بلکہ وہ فلم بندی کے دوران مسلسل پان کھاتا رہا تاکہ مناظر میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔ ایک اندازے کے مطابق فلم فلماتے ہوئے عامر تقریباً ایک ہزار پان چٹ کر گیا۔ بعض دنوں میں تو اسے روزانہ ایک سو پان کھانے پڑتے۔

☆ عامر خان فلم میں بھوج پوری زبان بولتا ہے۔ بھوج پور ہندوستان کا قدیم علاقہ ہے۔ یہ علاقہ اب بھارتی ریاستوں بہار، اتر پردیش اور نیپال کے بعض اضلاع میں تقسیم ہو چکا۔ بھارت اور پاکستان کی دیگر زبانوں کے مانند بھوج پوری بھی ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

پورے دو سال لگا کر عامر نے بھوج پوری زبان سیکھی۔ اس ضمن میں اسے بھوج پوری ادیب، شانتی بھوشن کی مدد حاصل رہی۔

خلائی مخلوق کے کردار کا تقاضا تھا کہ وہ فلم میں پرانے کپڑے زیب تن کرے۔ چناں چہ راج کمار ہیرانی نے فیصلہ کیا کہ جس علاقے میں بھی شوٹنگ ہو، وہاں گلیوں اور سڑکوں پر چلتے پھرتے لوگوں سے کپڑے مستعار لیں یا خرید لیے جائیں۔

چناں چہ دوران شوٹنگ عامر خان کے لیے کوئی بھی لباس نہیں خریدا گیا۔ عامر نے راہ چلتے لوگوں سے کپڑے لے کر زیب تن کیے۔ راج کمار ہیرانی کا کہنا ہے کہ ہر جگہ لوگوں نے بہت تعاون کیا اور اپنے لباس بخوشی دے دیے۔ ◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

عمران خان۔ فسانہ یا حقیقت
بچپن سے راہنمائی تک
فرینک حضور
قیمت 680 روپ

’’ترکی ہی ترکی‘‘ تاریخ، تہذیب، ثقافت، سیاحت اور سیاست
ترکی پر ایک منفرد اور شاندار کتاب
مصنف: فرخ سہیل گوئندی
قیمت 400 روپ

اتاترک۔ نئی قوم اور جمہوریہ کا ظہور	[illegible]	2200	سندھ ساگر اور قیام پاکستان		[illegible]	600
پاکستان میں جمہوریت کے تضادات	[illegible]	490	قانون دان اقبال		[illegible]	860
اسلام کا معاشی نظام اور تحریک پاکستان	شیخ محمد رشید	125	حیات قائد اعظم		[illegible]	580
غیر مقدس جنگیں (Unholy Wars)	[illegible]	490	اگرتلہ کے دوران (مشرقی پاکستان کے آخری ۹۰ ماہ)		[illegible]	500
پاکستان سے بنگلہ دیش۔ ان کہی جدوجہد	[illegible]	580	میر البحو۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ سیاست و شہادت		فرخ سہیل گوئندی	500
پاکستان کا مستقبل	[illegible]	200	جو میں نے دیکھا		راؤ رشید	320
ورلڈ آرڈر کی حقیقت	[illegible]	450	انسانی منظر نامہ	منظوم ناول	[illegible]	650
سرکش ریاستیں	[illegible]	450	کم سخن یوسف	ناول	[illegible]	450
ریاستی دہشت گردی	[illegible]	450	ناموس	ناول	ایلف شفق	580
عالمی بیکاروں کی دہشت گردی۔ سرمائے کے آقا	فرخ سہیل گوئندی	100	سرخ میرا نام	ناول	اورحان پاموک	780
اسلام کا معاشی نظام اور تحریک پاکستان	شیخ محمد رشید	125	شہر العشاق	ناول	[illegible]	650
لاہور۔ تاریخ و تعمیر	[illegible]	280	جنگل میں منگل	ناول	انیس احمد	460
کالی کازی ڈائری۔ جاپانی حربی طلبا کے تاثرات	[illegible]	450	ایک ترک خاندان		[illegible]	400
سلیمان عالیشان۔ تاریخ سلطنت عثمانیہ	[illegible]	520	کنیز۔ عثمانی سلطان کی حقیقی داستان عشق	ناول	[illegible]	390
تاریخ سلطنت مغلیہ۔ ظہیر الدین بابر	[illegible]	385	سرزمین		[illegible]	300
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	[illegible]	500	سمرقند	ناول	[illegible]	425
تاریخ سلطنت منگولیا۔ چنگیز خان	[illegible]	250	بوئے گل	ناول	[illegible]	480
ٹیپو سلطان، مزاحمت اور جدیدیت کی داستان	[illegible]	200	انجام بہاراں	ناول	[illegible]	450
استنبول (تاریخی و رومانی شہر)	[illegible]	450	فاطمہ گل۔ آخر میرا قصور کیا؟	ناول	[illegible]	250

Free Delivery ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

جمہوری پبلیکیشنز، 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

ایک پشیمان کو مل ہی گیا

زادِ راہ

زندگی بھر گناہ سمیٹنے والے کا دردانگیز ماجرا'

وہ بے تابی سے بخشش کے کسی سہارے کی تلاش میں تھا

شاہدہ ناز قریشی

سیڑھیوں پر آہستہ آہستہ کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازہ ہولے سے چرچرایا۔ بوڑھے کی پشت دروازے کی سمت تھی لیکن اس کے حواس چوکنا تھے۔ وہ بستر پر ایسے ساکت پڑا تھا جیسے گہری نیند میں ڈوبا ہو۔ اس کی کمزور ٹانگوں پر کمبل لپٹا ہوا تھا جس کا کچھ حصہ زمین پر لٹک رہا تھا۔ کمرے میں دواؤں اور پیشاب کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

بوڑھا اپنی میلی گدلی آنکھیں کھولے بظاہر دیوار پر کسی نامعلوم نکتے کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی پشت پر آنے والے نووارد سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس کے سامنے دیوار پر آنے والے کے جسم کا سایہ لرز رہا تھا۔

یہ اس کا تیرہ سالہ پوتا تھا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں کھڑا رہا۔ اس کے جسم سے پھوٹتی خوشبو نے جیسے سارا کمرا معطر کر دیا۔ بوڑھے کو لگا جیسے یہ مہک محبت کی خوشبو کی ہے جسے اس کی روح محسوس کر رہی ہے۔ محبت کا سیل رواں بوڑھے کے سینے میں شعلے کی طرح لپکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اپنی بے بسی کا احساس اس کی گدلی آنکھ کا آنسو بن کر گال پر بہ نکلا۔

کاش وہ اپنی لڑکھڑاتی زبان سے اسے آواز دے سکتا۔ اپنے [illegible] ہاتھوں سے اسے چھو پاتا۔ کاش وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ جاتا اور اپنے لاڈلے پوتے کا سر سینے سے لگا لیتا۔ بوڑھے کے دل میں شدید خواہش ابھری کہ کاش وہ خود ہی قریب آ جائے، بستر کے قریب! اس کے ننھے ہاتھ دادا کے [illegible] چہرے [illegible] میں۔ وہ اس کے خوبصورت ہاتھوں کا لمس [illegible] کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پوتا چند منٹ خاموش کھڑا رہا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اور پھر خاموشی سے پلٹ گیا۔

بوڑھے نے سوچا شاید سوچتا ہوگا دادا ابو سو رہے ہیں۔ کاش وہ میرے قریب آ کر مجھے دیکھ لیتا۔ میری آنکھیں اس کے معصوم چہرے کو چوم لیتیں [illegible] آہ! اس دنیا میں ایک وہی ہے جس کا دل اپنے بیمار اور کمزور دادا کے لیے دھڑکتا ہے۔ ورنہ مجھ بدنصیب بوڑھے کے مقدر میں اللہ نے اولاد تو لکھ دی مگر اولاد کا سکھ نہیں لکھا۔ بوڑھے کا ذہن سوچوں کے گرداب میں الجھ گیا۔ ماضی، حال اور مستقبل آپس میں ریشمی دھاگوں کی طرح الجھ گئے۔

آہ میں موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہا ہوں [illegible] مجھے واضح موت کے بارے میں بھی معلوم ہے [illegible] میرے دماغ کی کمزوری روز بروز بڑھ رہی ہے [illegible] میں موت سے خوفزدہ نہیں ہوں لیکن موت کے اس انتظار نے مجھے تین سال سے [illegible] جلا رکھا ہے۔ کبھی کبھی جب مجھے رات [illegible] آتی تو مجھے اپنا آپ اس قیدی کی طرح لگتا ہے جسے پھانسی کا حکم سنایا جا چکا ہو [illegible] اور وہ اپنی باری کا منتظر ہو۔ میرے دادا اور [illegible] لگتا ہے کہ موت کے انتظار نے مجھے کتنے کرب ناک عذاب و اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ میں پل پل اندر سے کٹتا جا رہا ہوں۔

میرا گزرا ہوا زمانہ [illegible] آج میرے سامنے کھڑا ہے۔ آہ! میں نے عمر بھر کبھی موت کا تصور بھی نہیں کیا تھا مگر آج [illegible] آج مجھے موت کے سوا اس دنیا کی کوئی حقیقت نظر ہی نہیں آتی۔ اب جبکہ میری زندگی کے دن ایک ایک کر کے گنے جا رہے ہیں، تو میرے مرنے کی گھڑی تک تک کرتے مجھے وقت کے گزرنے کا احساس اور بھی زیادہ شدت سے دلانے لگی ہے۔ میں جو عمر بھر اثاثے اکٹھے کرتا اور [illegible] سمجھتا رہا، آج وہی مال و دولت اور اثاثہ میرے لیے باعث آزار ہو چکا۔

کچھ اپنے بارے میں

میرے آبا کا تعلق گجرات سے ہے۔ کہانیاں لکھتے ہوئے تقریباً تیس پینتیس برس گزر چکے۔ اب تک تین سو سے زائد افسانے لکھ چکی ہوں۔ جو ملک کے مختلف جرائد اور اخبارات میں شائع ہوئے۔ افسانے لکھنے کا آغاز فرنٹیئر کالج فار ویمن، پشاور کے ادبی رسالے سے ہوا۔ میرے اندر کی افسانہ نگار کو کھوجنے کا سہرا میری میڈم فہمیدہ کو جاتا ہے جو خود بھی پشاور کے ادبی حلقے کی جانی پہچانی ادیبہ تھیں۔ میں مرحوم والدین اور مرحوم شوہر کی شکرگزار ہوں جنھوں نے میری تحریروں کی ہمیشہ پذیرائی کی۔ میں افسانوں میں کئی ایوارڈ جیت چکی۔ اس کے علاوہ حمد و نعت اور شاعری کے مجموعے تیار ہیں جو ابھی شائع نہیں ہوئے۔ میری تین کتابیں مارکیٹ میں آ چکی ہیں: ''ذوالجلال والاکرام، سراجاً منیرا، اور رگ جاں سے بھی قریب'' تیسری کتاب کو صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا۔ میں نے جو بھی لکھا، اپنے دل کی پوری سچائی سے لکھا۔ میرا ایمان ہے۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

میری دعا ہے، جب تک میری جان میں جان ہے، اللہ تعالیٰ میرے قلم سے فلاح و بھلائی کے کام لیتا رہے۔ (آمین)

www.pdfbooksfree.pk

میں نے اولاد کی خاطر بہت کچھ کمایا، بنایا اور حلال حرام کی تمیز تک مٹا دی۔ اللہ بخشے میری بیوی مجھے منع ہی کرتی رہتی...... وہ کتنی سچی تھی۔ آہ! اب وہی اولاد جائداد کے پیچھے کتوں کی طرح آپس میں لڑ رہی ہے۔ وہ ان کوٹھیوں، پلاٹوں اور زرعی زمین پر جھگڑ رہے ہیں جس کے لیے میں نے دن رات محنت کی، چکر چلائے، رشوت لی اور ہیرا پھیری کی۔ جہاں جہاں سے اور جس جس طریقے سے دولت مل سکتی تھی، اکٹھی کی۔ آہ! میں نے سرکاری عہدے کا جی بھر کے فائدہ اٹھایا، کیسے تھے وہ دن؟ آہ! میں عمر بھر ان لوگوں کو بے وقوف، نکما، بزدل اور پرلے درجے کا احمق سمجھتا رہا جو حق حلال، حق حلال کی گردان کیے سخت تنگی ترشی میں بھی گزارا کیے جاتے تھے۔ لیکن کیا آج اس لمحے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور تنگی ترشی ہو سکتی ہے؟

یہ جائداد، یہ مال و دولت میرے دل و دماغ اور ضمیر کا بوجھ بن کر کچوکے دے رہی ہے۔ میں نے اپنی جائداد پانچوں بیٹوں اور تینوں بیٹیوں میں بڑے حساب سے تقسیم کر دی تھی۔ لیکن یہ تقسیم انھیں گوارا نہیں۔ وہ جب بھی اکٹھے ہوں، جائداد پر جھگڑتے ہیں۔ ان کے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں مجھے اوپر کمرے تک پہنچتی ہیں۔ سوچتا ہوں، کاش میں غریب ہی ہوتا۔ میرا کوئی پلاٹ، زمین جائداد نہ ہوتی اور بیٹے متوسط درجے کے عام سے شہری ہوتے۔ تب یہ جب اکٹھے بیٹھتے، تو آپس میں دکھ سکھ کی باتیں کرتے۔ مجھ بوڑھے بیمار باپ کی خیریت طلب کرتے۔ ان کے دل آپس میں جڑے ہوتے۔

آہ! میں ان اونچی، تیز، تلخ اور جھگڑتی آوازوں کو اس وقت بھی سن رہا ہوں جو میرے کانوں میں تیر کی طرح گھسی چلی آ رہی ہیں۔

''نہیں، تم آم کے باغات نہیں لے سکتے، وہاں میں نے محنت کی ہے، اس پر میرا حق ہے۔''

''تم پہلے ہی ڈھیر ساری زمین لے چکے...... اب بھی پیٹ نہیں بھرا تمھارا۔''

''یہ جو تم ماڈل ٹاؤن والی بڑی سی کوٹھی میں بیٹھے ہو اس کی قیمت معلوم ہے کتنی ہے؟''

''اچھا! تو تمھاری آنکھوں میں یہ کوٹھی بھی کانٹا بنی ہوئی ہے۔ خبردار! تم نے آئندہ اس کا ذکر بھی کیا تو......''

''تم دھمکیاں دے رہے ہو...... اور تم بڑے بھائی، ہوش کرو...... پٹرول پمپ اور یہ کوٹھی۔ اس پر پہلا حق میرا ہے۔ وہ میں کسی کو نہیں دوں گا۔ اگر کسی نے جرأت کی، تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

''ابا جی نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ صرف ایک کوٹھی؟''

''تمھیں پتا ہے کتنے کنال پر ہے...... پھر وہ جگہ کمرشل ہو کر کتنی مہنگی ہو چکی۔''

ملی جلی آوازوں کا شور اس کے اعصاب کچلنے اور روندنے لگا۔ وہ تو اپنے کان بند کر لینے پر بھی قادر نہ تھا۔ بیٹوں کے ساتھ بہوؤں کے تیز تیز بولنے اور جھگڑنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

''شہریار تو بڑے ہیں۔ آپ کو تو جائداد کی اتنی ضرورت ہی نہیں! آپ کا ایک ہی بیٹا ہے جو امریکا چلا گیا۔ ہمیں دیکھو تین تین بیٹیوں کا بوجھ سر پر پڑا ہے۔''

''اور جو امریکا گیا ہے اس کے تعلیمی اخراجات کا تمھیں اندازہ ہے، کتنا خرچ ہو رہا ہے ہمارا اس پر۔''

''ابا جی نے ناانصافی کی ہے...... سراسر ناانصافی۔ ہماری مرضی کے بغیر جائداد بانٹ کر انھوں نے اچھا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نہیں کیا۔"

"تو پھر پھاڑ دو اباجی کی وصیت...... ابھی وہ زندہ ہیں، نئی لکھوا لو......"

"وہ ہوش و حواس میں کب ہیں...... جو کرنا ہے ہمیں ہی مل جل کر کرنا ہے۔"

"نہ مل جل کر یہاں کون رہنا چاہ رہا ہے؟ یہاں تو سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ اب اگر کوئی فیصلہ نہ کیا گیا، تو کورٹ میں لے جاؤں گا سارا معاملہ!"

"اور اگر تم نے جائداد بیچنے کی کوشش کی، تو میں حق شفعہ کر دوں گا۔" منجھلا بیٹا غراتے ہوئے بول رہا تھا۔

آوازیں شور شرابے میں بدل گئیں۔ وہ سب ایک دوسرے سے شاکی ہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کا حصہ زیادہ لگ رہا ہے۔ ان کے طمع والے پیٹ بہت پھول چکے۔

آہ! میں نے اپنی اولاد کو ناز و نعم سے پالا۔ مگر آج انھیں میرے پاس بیٹھنے اور میری خیریت معلوم کرنے کے بجائے جائداد کے جھگڑوں ہی سے فرصت نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ ان کا اکیلا بوڑھا باپ ان کی شکلیں دیکھنے اور آوازیں سننے کو ترس رہا ہے۔ اپنے پوتے پوتیوں سے محبت کرنے کو بلک رہا ہے۔ بیٹیاں ماں کی طرح صابر ہیں ورنہ اس جھگڑے میں وہ بھی موجود ہوں۔ ناشکرے تدیدے اتنا کچھ حاصل کر کے بھی شکر گزار نہیں۔ حل من مزید کی ہوس نے انھیں آپس کی محبت سے بھی محروم کر دیا۔ آہ! ایک مرتے ہوئے بوڑھے کے لیے اس سے بڑھ کر اذیت کیا ہو گی کہ اولاد باپ کی چھوڑی جائداد پر خوش ہونے کے بجائے آپس میں دشمنی، کینہ، بغض، حسد اور لالچ میں ڈوب گئی۔

آہ! میں عمر بھر ان لوگوں کو بے وقوف، نکما، بزدل اور پرلے درجے کا احمق سمجھتا رہا جو حق حلال، حق حلال کی گردان کیے۔ سخت تنگی ترشی میں بھی گزارا کیے جاتے تھے۔

وہ بچے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اداروں کے پروردہ ہیں، آج ان کی چیختی چلاتی آوازیں میرے لیے سوہان روح بن چکی۔ میں ان کی دہاڑتی، گرجتی، برستی، غصیلی آوازیں سنوں، تو میرے دماغ کی رگیں چٹخنے لگتی ہیں۔ ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگتے ہیں۔

لڑنے جھگڑنے سے فرصت پا کر کبھی کبھار میرے بیٹے سرسری انداز میں میری خیریت پوچھنے آئیں بھی، تو اچانک انھیں اپنے کئی کام یاد آجاتے ہیں...... اور پھر وہ ایک ایک کر کے شدید مصروفیت کا بہانہ بنا کر چل دیتے۔ میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی آئیں، تو میری ہکاہٹ، بے بسی اور میرے کمرے سے اٹھتی بساند سے گھبرا کر جلد پلٹ جاتے ہیں...... اور میں در و دیوار سے لپٹی اداسی کو سینے سے لگائے، دکھ کے اندھے غار میں پاتال تک گرتا چلا جاتا ہوں...... میرا سانس گھٹنے لگتا ہے۔ سینے کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ تبھی ماضی کی یادیں آ کر مجھے تھام لیتی ہیں۔ میرے بچھڑے ہوئے لمحات، دوست احباب، والدین، بہن بھائی، میرا بچپن اور میری جوانی، سب یادوں کے موتی بن کر آنسوؤں کی دھند میں اترتے چلے جاتے ہیں۔

آہ! اب میں اپنے بچوں کو اپنی مرضی سے روک بھی نہیں سکتا۔ انھیں اپنے پاس بیٹھنے پر مجبور بھی نہیں کر پاتا۔ اب خاموش رہنا میرا مقدر بن چکا۔ میں جو کبھی شیر کی طرح دہاڑا کرتا تھا۔ اپنے محلے میں جس کی دھوم تھی، جس نے کبھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی تھی۔ جس کے کلف شدہ لباس ہر وقت الماری میں تیار لٹکے رہتے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

تھے…… اب گندگی کی پوٹ بن چکا، نوکر صفائی کرتے ہوئے ناک بھوں چڑھاتے ہیں…… اور نوکر چھٹی پر چلا جائے تو ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے…… آہ اولاد سے کیسی کیسی باتیں سنتا ہوں۔ بہوؤں کے تبصرے میرے کانوں میں انگارے کی طرح گرتے ہیں۔

"پتا نہیں اباجی نے کون سے گناہ کیے تھے جن کی سزا انھیں ایسی صورت میں بھگتنا پڑ رہی ہے…… اٹھ کر پانی بھی نہیں پی سکتے۔"

"سنا ہے اباجی بڑے غصے والے تھے۔ پتا نہیں کس کی آہ لگ گئی۔ توبہ توبہ…… ایک تو بڑھاپا، اوپر سے معذوری۔ اللہ کسی کا یہ حال نہ کرے…… ورنہ اس عمر میں تو بوڑھے اللہ سے لو لگا لیتے اور نماز روزہ کرتے ہیں۔"

"نماز روزہ کبھی جوانی میں یاد نہیں آیا…… تبھی تو اللہ نے بڑھاپے میں بھی اس کی توفیق نہیں دی۔"

"توبہ استغفار۔ اللہ بڑھاپا دے تو عزت کی موت دے، عزت کی۔"

"اپنی بیوی کو سخت تنگ رکھا……"

"بس چپ کرو، پتا اور بھی داستانیں مجھے معلوم ہیں…… بس تو چپ ہی رہو۔"

ایسے دکھ دینے والے جملے میں روز ہی سے سنتا۔ نوکر چاکر جو مجھے صاف کرنے آتے ان کے کھردرے ہاتھوں اور چلتی زبانوں پر بھی یہی ذکر ہوتا۔

"اللہ ایسی زندگی سے تو موت بھلی، کیسے ہو گئے بابا جی…… آٹھ برس ہی سے اور جانے کتنے جئیں گے۔"

میرے دل سے ہوک اٹھ کر میرا احاطہ کر لیتی۔ آہ! یہ کیسا وقت ہے! یہ کیسا لمحہ آن لگا؟ اگر یہ وہی آسمان اور زمین ہے، تو پھر یہ انقلاب، یہ گردشیں کہاں سے عمد

آور ہو گئیں! یہ دولت جب بارش کی طرح برس رہی تھی تب لوگ کہتے تھے: "فراز بہت سیانا ہے…… فراز بہت خوش قسمت ہے…… وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالے تو سونا بن جاتی ہے۔"

آہ! تب امارت تھی اور دولت، رعب، دبدبہ اور شان تھی، چہل پہل تھی…… لوگوں سے مراسم اور رتبے کو سلام تھے! دوستیاں تھیں، مگر…… اب سب چکنا چور ہو چکا۔

آج وہی فراز نشیب بن چکا۔ اب نہ دوستیاں رہی ہیں نہ شان و شوکت۔ اب بیٹوں کے اپنے دوست اور حوالے ہیں اور ان حوالوں میں میرا کہیں گزر نہیں…… سارا کروفر ماضی کی گرد بن کر اڑ چکا۔ آہ! اس تنہائی اور کرب انگیز حالت میں صرف میرا پوتا ہی مجھے دیکھنے چلا آتا ہے۔ وہ کتنی کتنی دیر چپ چاپ کھڑا رہتا ہے۔ شاید اس کا ننھا سا دل میری محبت سے بھرا اور میری بیماری کے سانحے سے دکھ میں ڈوبا ہوا ہے…… وہ آنکھوں کے سامنے اپنے دادا کو مرتے دیکھ رہا ہے۔

آہ! کبھی میں بھی اس عمر کا تھا، تب میرے دادا جان بھی مرض سے جا لگے۔ میں بہت دکھ سے سوچا کرتا کہ اگر دادا جان ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے، تو مجھے کون پچکارے گا؟ "بیٹا" کون پکارے گا؟ کون مجھے مزے مزے کی کہانیاں اور زندگی کے قصے سنائے گا؟ کون قدم قدم پر میری انگلی پکڑے گا؟ میرا بچپن ان کے شفیق سینے سے لگ کر کہانیاں سنتے گزرا تھا…… میری ان سے بڑی دوستی تھی…… وہ مجھے دعائیں دیتے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کام کر کے مجھے بہت خوشی ہوتی۔

میرا پوتا احسن شاید میری طرح بہت حساس ہے۔ شاید وہ بھی میرے بارے میں اسی طرح سوچتا ہے۔ بس

www.pdfbooksfree.pk

طرح میں اپنے دادا کے لیے سوچا کرتا تھا۔ میرے مرنے کے بعد شاید اس بے وفا اپنچی گھرانے میں وہ واحد ایسا فرد ہوگا جس کے آنسو بے ریا ہوں۔ وہ میری مغفرت کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گا، تو اس میں دنیاداری اور دکھاوا نہیں ہوگا۔ اس کی سچی محبت میری قبر کو روشن رکھے گی۔

زندگی بھر انسان بھاگ دوڑ کرتا، کماتا اور کماتا ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن جو اصل کمائی ہے اس کا اسے خیال ہی نہیں آتا۔ لیکن آج جب زندگی کی شام کی دہلیز پر بیٹھا گنتی کی گھڑیاں گزار رہا ہوں، تو مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے... کاش میں نے نیکی کا کوئی کام ایسا کیا ہوتا، جو اپنے ساتھ لے جا سکتا۔ کاش میری عمر اس طرح نہ گزرتی جیسے گزر گئی۔

لیکن شاید میرا پوتا میرے لیے بخشش کا ذریعہ بن جائے۔ اس کے سچے دل سے کی گئی دعائیں مجھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخرو کر دیں۔ میں نے کبھی اس بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ لیکن اب میری سوچیں صرف اسی نقطے کے گرد گھومتی ہیں۔ مجھے دنیا چھوڑنے سے پہلے [illegible] گزرا رہا ہے۔ [illegible] میری عمر بھر کی کمائی، رشوت، جائیداد، بیوی بچے سب میرے لیے زہر یا سودا [illegible] ہیں۔ میں نے خسارے کا سودا خوب کیا اور [illegible] غم سے پچھتا جا رہا ہے۔ اپنے والدین کی باتیں اور [illegible] صاحب کی نصیحتیں، دل میں تاسف اور پچھتاوے کے [illegible] ناگ بن کر ڈس رہی ہیں۔

آہ، میرا آخرت بدبودار اور [illegible] ہو چکا لیکن مجھے آج تک ملازم کے آنے تک اسے برداشت کرتے

یااللہ میں تیری عبادت اور تیرے حضور توبہ کرنا چاہتا ہوں... میرے ذہن میں آج پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں... میرا ذہن زندہ ہے، مرنے سے پہلے تو مجھے معاف فرما دے۔

٭٭٭

آج پھر مجھے اپنے پوتے کے قدموں کی خوبصورت آہٹ سنائی دی۔ وہ مجھے دیکھنے آ رہا ہے... آج میرا چہرہ دروازے کی سمت سے موڑ کر جاتے ہوئے مجھے اس طرف کروٹ دلوا گیا تھا۔

شکر ہے کہ آج میں جی بھر کے اپنے پوتے کو دیکھ سکوں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری آنکھیں کھلی دیکھ کر وہ بے تابی سے آ کر مجھ سے لپٹ جائے۔ میرے پاس بیٹھے مجھ سے باتیں کرے... تب میں اشاروں سے اسے اپنی محبت کا یقین دلاؤں گا۔ اس سے کہوں گا، وہ میری بخشش کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ میرے بیٹے تو جائیداد کے جھگڑوں میں بدنصیب باپ کو بھی فراموش کر چکے۔

آہ، میں ان سے کس قدر مایوس ہوں۔ مگر میرے پیارے پوتے، میری جان، میرے جگر کے ٹکڑے، میں ابھی زندہ ہوں... میں تم سے مایوس نہیں۔ بڈھے کی منتظر اور پیاسی آنکھیں دروازے کی سمت تھیں۔ [illegible] آنے والے کو دیکھنے کے لیے شدید بے چین تھا۔ [illegible] پوتا جو ذہن و دوڑ سے اپنے پیے محبت کے [illegible] تھی۔ تبھی دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا... اور پندرہ سالہ لڑکے نے اندر جھانکا... اس کے ساتھ [illegible] ایک لڑکا بھی تھا۔ [illegible]

"اچھا تو یہ ہے تمہارے دادا جان کا [illegible] خوب..."

بڈھے دادا کی التجا بھری نظریں پوتے کے چہرے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کو حسرت و یاس سے دیکھ رہی تھیں۔ دادا کی آنکھوں میں امید کے جگنو چمک رہے تھے..... جھریوں کے اندر زبان کانپ رہی تھی۔ وہ اسے دل میں پکار رہا تھا:

"میرے پاس آؤ... آؤ میرے پاس بیٹھو۔ مجھے اپنے نرم نرم ہاتھوں کا لمس دے دو۔"

بوڑھے کے چہرے کی جھریوں میں اداسی مسکراہٹ اور خوشی کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔ مگر اس کا پوتا اپنے دوست کے ساتھ باتوں میں مگن تھا... اس نے سرسری نگاہ سے دادا کو دیکھا، لیکن شاید وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ نیم وا آنکھوں کے اندر سے جھانکتی روح کس کرن اسے بہت پیار، شفقت، محبت و بےبسی اور حسرت سے دیکھ کر اس کی بلائیں لے رہی ہے۔

ان آنکھوں میں حسرت بھری پکار ہے۔ ایک عجیب پکار اپنی طرف متوجہ کرنے کی پکار۔ ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی پکار... ایک مرتے ہوئے بوڑھے کی پکار۔

"یہاں کمرا ٹھیک ٹھاک ہے۔ کافی بڑا ہے۔" انجم بڑے شوق سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پوتے نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردے ہٹا دیے۔ پھر بولا "اور دیکھو، یہاں سے باہر کا منظر کتنا خوبصورت نظر آتا ہے۔"

"اوہ بہت خوب... ریلی ویری نائس..."

"میں کئی روز سے اس کمرے کا جائزہ لے رہا ہوں۔ ماما نے کہا ہے، دادا کی "ڈیتھ" کے بعد میں یہ اس کمرے میں شفٹ کر لینا۔ میرا خیال ہے، میں اسے اپنا "اسٹڈی روم" بنا لوں۔ ماما نے کہا ہے اس کمرے کے لیے وہ مجھے نیا فرنیچر اور نئے پردے لگوا دیں گی۔"

"اوہ ویری گڈ... پھر تو ہم سب دوست تمھارے اس کمرے میں خوب مزے کیا کریں گے۔"

"وائے ناٹ" (کیوں نہیں۔)

وہ دونوں اس کی طرف دیکھے بغیر نیچے اترتے چلے گئے۔ بوڑھے کو لگا جیسے چاروں طرف اچانک گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ جیسے ساری عمر رائیگاں چلی گئی... جیسے سب حاصل، لاحاصل ہو چکا۔

ذہن کی سلیٹ پر لفظ کسی بھٹکی روح کی طرح نمودار ہوئے اور قبرستانوں میں سرسراتی ہواؤں اور سوکھے پتوں کے ساتھ مل کر بین کرنے لگے۔

میری قبر کے راستے پر گھاس اگنے لگے گی
تو میں یہ سمجھوں گا
اس شہر میں میرا کوئی نہیں... کوئی نہیں
میری قبر پر اندھیری رات کو جب کوئی ستارہ ٹمٹمائے گا
اور مجھ سے پوچھے گا،
کیا کوئی ہاتھ ایسا نہ تھا جو چراغ ہی جلا دیتا
تو میں کہوں گا
نہیں، اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں، کوئی نہیں
میرا کتبہ بھی کسی جھکڑ سے ٹوٹ کر گر جائے گا
تو اس بے نشان قبر کو دیکھنے کوئی نہیں آئے گا
تو میں سمجھوں گا، میرا کوئی نہیں... میرا کوئی نہیں

دکھ بادلوں کی طرح چاروں طرف سے امڈ آیا۔ غم بارش کی طرح دل کے آس پاس برسنے لگا۔ آنسوؤں کے بے وقعت قطرے آنکھوں سے بہہ کر کانوں کی لو تک چلے گئے۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے آنسوؤں کی دھند کے پار دیکھا، دو سائے پلنگ کے قریب آتے محسوس ہوئے۔

"سلام صاحب جی۔"

"السلام علیکم صاحب" دونوں آوازیں اجنبی سی تھیں۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

پھر کسی نے بہت پیار سے اس کے لرزتے رعشہ زدہ ہاتھوں کو تھاما اور اس کی ابھری رگوں والے ہاتھ کی پشت پر پیار سے بوسہ ثبت کیا۔ اس بوسے میں عقیدت اور محبت کے سارے جذبے پوشیدہ تھے۔ اس کی خشک زبان تیزی سے گردش کرنے لگی۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے؟ جو اتنا مہربان ہے...... جس کے ہاتھوں میں محبت کی گرمجوشی ہے۔ تبھی آنے والے نے خود ہی تعارف کروا دیا۔

''صاحب جی، میں ہوں آپ کا ملازم خادم حسین۔''

''خ...... خ...... ش......'' اس نے بولنے کی کوشش کی۔

''صاحب جی، یہ میرا بیٹا ہے ڈاکٹر میرے ساتھ، نذیر حسین، نذیر حسین سلام کر صاحب کو۔''

بوڑھے نے کئی آنکھیں جھپک جھپک آنسوؤں کی دھند صاف کر کے دیکھا۔ اس کا پرانا ملازم اپنی تمام تر تابعداری، وفاداری، عقیدت اور محبت کے جذبوں کے ساتھ پلنگ کے ساتھ زمین پر بیٹھا تھا۔

''صاحب جی! آپ کی بیماری کا پتا ہی بہت دیر سے لگا۔ وہ سے نا جی ہمارے گاؤں کا حاکم دین جو ڈرائیوری کرتا تھا آپ کی کار کی...... وہ آج کل دبئی گیا ہوا ہے۔ اس کے جاننے والے سے پتا چلا ورنہ ہم آپ کی خدمت میں بہت پہلے حاضر ہو جاتے جی۔''

بوڑھے کے کمزور کانپتے ہوئے ہاتھ گرمجوشی اور محبت بھرے ہاتھوں کے حصار میں عجیب سکون محسوس کر رہے تھے۔ اور یہ گرمجوشی عہد رفتہ کی یاد دلا رہی تھی...... وہ عہد رفتہ جو اب کھنڈر ہو چکا۔ اس نے اپنے ملازم کو پہچان لیا جس نے پندرہ برس گھر کام کیا تھا۔ ''صاحب جی جس دن سے آپ کی بیماری کا پتا چلا ہے، میری بیوی، بچیاں اور بہو آپ کی صحت کے لیے قرآن شریف کا ختم کر کے دعائیں مانگ رہی ہیں۔ اللہ آپ کو حیاتی دے۔''

خادم حسین نے بوڑھے مالک کے سر کے نیچے دوسرا تکیہ رکھ کر سر اٹھا دیا تاکہ وہ انھیں صاف طور پر دیکھ سکے۔

''آپ کے تو ہم پر بہت احسان ہیں جی۔ آپ کی نیکی کون بھلا سکتا ہے۔ نذیر حسین کی فیس کے پیسے جب بھی کم پڑ جاتے، تو صاحب آپ ہی سے مانگتے۔ آپ نے کبھی انکار نہیں کیا۔ آج یہ اللہ کے فضل سے ڈاکٹر بن گیا ہے۔ آپ کی یہ نیکی ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔ پھر صاحب جی میری بیٹی کی شادی آپ نے اپنے خرچے پر کروائی...... بیوی کے آپریشن کے لیے رقم آپ نے دی۔ میرا سارا کنبہ آپ کو دعائیں دیتا ہے۔ آپ کے لیے ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں سب کے۔''

وہ بول رہا تھا۔ اس کی آواز مالک کے احسانات یاد کرتے ہوئے بھرا گئی۔ تبھی وہ بولتے بولتے سسکا:

''صاحب جی، صاحب جی۔''

بوڑھے کی آنکھیں اپنے ملازم کے چہرے پر یوں جمی تھیں جیسے ابلتے ہوئے صحرا میں کسی انسان کو اچانک ٹھنڈا میٹھا چشمہ نظر آ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر الوہی سکون آ کر ٹھہر گیا تھا۔

خادم حسین اپنے مالک کی حالت اور آنکھیں دیکھ کر چونکا، پریشان ہوا اور پھر بے اختیار اسے آوازیں دینے لگا۔ لیکن اس کے مالک کی تاسف بھری روح اسی ایک نیکی کی منتظر تھی جو ابد کے راستوں کا زادِ راہ بن سکے۔ ملازم تڑپتا رہا اور بوڑھا اپنی ہتھیلی پہ نیکی کا یہ چھوٹا سا دیا رکھے ابد کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

ہندوؤں کے چہیتے وزیراعظم

نریندر مودی نے بھارت بیچ ڈالا

امریکی کمپنیوں کی شرائط کے سامنے مودی سرکار جھک گئی..... چشم کشا رپورٹ

سید [illegible] محمود

۲۶ جنوری ۲۰۱۵ء کو بھارتی وزیراعظم، نریندر مودی نے فاتحانہ اعلان کیا کہ "سول ایٹمی معاہدے" کے سلسلے میں بھارت اور امریکا نے رکاوٹیں دور کر لی ہیں۔ چناں چہ جلد معاہدے پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔ جب یہ اعلان ہوا، تو امریکی صدر، بارک اوباما دورے پر بھارت آئے ہوئے تھے۔

بھارت اور امریکا کے مابین "سول ایٹمی معاہدہ" جولائی ۲۰۰۸ء میں ہوا تھا۔ تب صدر بش امریکا اور من موہن سنگھ بھارت میں حکمرانی کر رہے تھے۔ معاہدے کے تحت امریکی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بھارت میں ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنے ہیں۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بھارتی حکومت نے امریکی ویسٹنگ ہاؤس الیکٹرک کمپنی کو ریاست گجرات میں کئی ایکڑوں پر مشتمل زمین الاٹ کی۔ امریکی کمپنی وہاں چھے ایٹمی ری ایکٹر لگانا چاہتی ہے۔ ہر ری ایکٹر ۱۱۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کرے گا۔ یوں کل ۶۶۰۰ میگاواٹ بجلی بنتی ہے۔

دوسری امریکی کمپنی، جنرل الیکٹرک کو آندھرا پردیش میں وسیع و عریض زمین دی گئی۔ وہ بھی وہاں چھے ایٹمی ری ایکٹر نصب کرنا چاہتی ہے۔ ہر ری ایکٹر ۱۵۹۴ میگاواٹ بجلی بنائے گا۔ گویا یہ بھی ری ایکٹر ۹۵۶۴ میگاواٹ بجلی بنائیں گے۔

غرض ان ایٹمی بجلی گھروں کی تعمیر سے بھارت کو پندرہ ہزار میگاواٹ سے زائد بجلی مل سکے گی۔ بھارتی معیشت ترقی کر رہی ہے۔ لہٰذا بھارتیوں کو زائد بجلی کی ضرورت ہے۔ ایسے میں یہ ایٹمی بجلی گھر بھارتی حکومت کو بڑا سہارا دیں گے۔

لیکن دو رکاوٹوں کے باعث امریکی، بھارتی سول ایٹمی معاہدہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پہلی رکاوٹ یہ کہ امریکی کمپنیوں نے کوئی ایٹمی حادثہ جنم لینے کی صورت ہرجانہ دینے سے انکار کر دیا۔ دوسری رکاوٹ یہ کہ امریکی قانون کی رو سے جن ممالک مثلاً بھارت نے این پی ٹی (جوہری عدم پھیلاؤ) معاہدے پر دستخط نہیں کیے، انھیں ایٹمی ایندھن فروخت کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ وہاں اس کا استعمال کیسے ہو رہا ہے۔ اس قانون کو بھارتی حکومت نے اپنی خودمختاری کے خلاف تصور کیا۔

بھارتی عوام غیر ملکی کمپنیوں کے معاملے میں خاصے حساس ہیں۔ سبب ۱۹۸۴ء کا سانحہ بھوپال ہے۔ اس سانحے میں امریکی کمپنی، یونین کاربائڈ کارپوریشن کے پلانٹ سے زہریلی گیس کا اخراج ہوا جس نے کم از کم چار ہزار بھارتی ہلاک کر ڈالے۔ جبکہ پانچ لاکھ بھارتی مختلف انداز میں متاثر ہوئے۔ تاہم بیشتر بھارتیوں کو امریکی کمپنی نے ہرجانہ ادا نہیں کیا۔

اسی لیے امریکی بھارتی سول ایٹمی معاہدہ انجام پایا، تو حزب اختلاف کے دباؤ پر بھارتی حکومت نے ۲۰۱۰ء میں ہرجانے کے سلسلے میں ایک قانون، ''دی سول لائبلٹی فار نیوکلیئر ڈیمج ایکٹ'' (Nuclear Liability Act) بنا ڈالا۔ قانون کی رو سے ایٹمی بجلی گھر میں کسی حادثے کی صورت پلانٹ چلانے والی (امریکی یا غیر ملکی) کمپنیاں ۲۹۷ ملین ڈالر ادا کریں گی۔

امریکی حکومت چاہتی ہے کہ ہرجانے کے معاملے میں امریکی کمپنیوں کو باہر ہی رکھا جائے مگر خصوصاً بھارتی اپوزیشن پارٹیوں کو یہ بات منظور نہیں۔

امریکی حکومت چاہتی ہے کہ ہرجانے کے معاملے میں امریکی کمپنیوں کو باہر ہی رکھا جائے مگر خصوصاً بھارتی اپوزیشن پارٹیوں کو یہ بات منظور نہیں۔ وہ درج بالا ایکٹ کو زیادہ سے زیادہ سخت بنانا چاہتی ہیں تاکہ غیر ملکی کمپنیاں ذمے داری سے اپنا کام انجام دیں۔

بھارتی حزب اختلاف کا کہنا ہے کہ ۲۹۷ ملین ڈالر ہرجانہ بہت کم ہے۔ ایٹمی حادثے کے نتیجے میں متاثرین کی مدد، بحالی اور پلانٹ کی صفائی پر اربوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سوویت یونین میں ظہور پذیر ہونے والے مشہور چرنوبل ایٹمی حادثے کے باعث سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک بیلاروس پچھلے ۳۰ برس سے اپنے شہریوں کی مدد و بحالی پر ''۲۳۵'' ارب ڈالر خرچ کر چکا۔ اسی طرح ۲۰۱۱ء میں فوکوشیما ایٹمی حادثے کے بعد

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سے جاپانی حکومت کے ۱۰۵ ارب ڈالر خرچ ہو چکے۔ ان اخراجات کے سامنے ۲۹ ملین ڈالر کی رقم تو آٹے میں نمک برابر لگتی ہے۔

لیکن یہ اشارے مل رہے ہیں کہ بی جے پی کے وزیروں مشیروں کو "مالی فائدہ" پہنچانے کی خاطر مودی حکومت نے اپنی عزت و وقار امریکیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دراصل ۲۶ جنوری کو نریندر مودی اور بارک اوباما کے درمیان ایک خفیہ ملاقات ہوئی۔ اسی ملاقات کے بعد یہ اعلان ہوا کہ بسلسلہ ایٹمی معاہدہ دونوں رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں۔

امریکی صدر نے اعلان کیا کہ انھوں نے ایسا طریقہ کار دریافت کر لیا ہے جس کے ذریعے بھارت [illegible] والے ایٹمی سامان کی جانچ پڑتال نہیں ہوگی۔ دوسری طرف نریندر مودی نے اعلان کر ڈالا کہ [illegible] جانے کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے بھارتی حکومت ایک انشورنس پول تشکیل دے گی۔ مقصد یہ [illegible] امریکی کمپنیوں سے [illegible] بنائی جائے۔ [illegible] بھارتی اٹارنی جنرل نے اعلان کیا کہ ہرجانے کے ایکٹ میں مزید ترمیم کیا جائے گا۔

امریکی کمپنیوں کی سرمایہ کاری لانے کے لیے مودی حکومت گھٹنے ٹیک چکی اور یقیناً اس سودے بازی میں بی جے پی کے وزیر مشیر کمیشن بھی کھائیں گے۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ امریکی کمپنیوں کی سرمایہ کاری لانے کے لیے مودی حکومت گھٹنے ٹیک چکی اور یقیناً اس سودے بازی میں بی جے پی کے وزیر مشیر کمیشن بھی کھائیں گے۔ (گجرات اور آندھرا پردیش، دونوں ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت ہے)

امریکی سرمایہ کاری سے تعمیر ہونے والے ایٹمی ری ایکٹروں کو دو اور مسائل کا سامنا ہے۔ اول جن علاقوں میں انھیں تعمیر ہونا ہے، وہاں کے رہائشی اور کسان ری ایکٹروں کے سخت مخالف ہیں۔ اسی لیے ان کے خلاف جلسے جلوس نکالتے اور احتجاج کرتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ دونوں ایٹمی بجلی گھر سمندر کے نزدیک واقع ہیں۔ مثال کے طور پر آندھرا پردیش میں بننے والا ری ایکٹر ساحل سے صرف ۶۸ کلومیٹر دور ہے۔ جبکہ نومبر ۲۰۱۴ء میں اسی جگہ [illegible] نے بہت تباہی پھیلائی تھی۔ اگر وہاں ایٹمی بجلی گھر [illegible] ہوتا، تو خدانخواستہ فوکوشیما جیسا خوفناک حادثہ ظہور پذیر ہو سکتا تھا۔

ترقی پذیر ملک ہونے کے ناتے بھارت کو یقیناً مزید بجلی کی ضرورت ہے۔ لیکن مودی حکومت اپنے شہریوں کا جان و مال خطرے میں ڈال کر ایٹمی بجلی گھر تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ اسے [illegible] غیر مقبول بنا سکتا ہے۔

ماموں کی بہن

ایک بار رسول اللہﷺ نے دل لگی کے طور پر ایک شخص سے پوچھا: "بتاؤ تمھارے ماموں کی بہن تمھاری کیا لگی؟"

وہ شخص سادہ لوح واقع ہوا تھا، سر جھکا کر سوچنے لگا۔ حضورﷺ مسکرائے اور فرمایا: "ہوش کر! کیا تجھے اپنی ماں بھول گئی؟ وہی تو تیرے ماموں کی بہن ہے۔"

(حسن روحانی)

www.pdfbooksfree.pk

دور جدید میں پلنے بڑھنے والی

”ماڈرن“ محبت

اس دکھیاری لڑکی کی عجب کتھا جو انٹرنیٹ کے ذریعے اپنے سونے جیون میں انقلاب لے آئی

ذکیہ علی بیگ

پردیس بیتی

ابوظہبی ہوائی اڈے پر ہمیشہ کی طرح چہل پہل تھی۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی والے مرد و زن کا ہجوم رواں دواں تھا۔ عمر پاکستان جاتے ہوئے ہمیشہ ابوظہبی ہوائی اڈے کا انتخاب کرتا تھا۔ وہاں دبئی کی نسبت کم ہجوم ہوتا لیکن سہولیات وہی دستیاب تھیں۔ عمر ہجوم کے درمیان سبک روی سے جگہ بناتا گزر رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہ تھی۔ پاکستان جانے والی پرواز دس گھنٹے بعد جانی تھی۔ وہ ہالینڈ سے وطن واپس جا رہا تھا۔

عمر غور سے ہر عمر کی خواتین کو دیکھ رہا تھا۔ ہالینڈ میں رہ کر وہ مغربی معیار حسن کا عادی ہو گیا تھا جس میں چہرے کی کشش سے زیادہ لانبے قد اور پتلی کمر کو فوقیت حاصل ہے۔ نوخیز لڑکی کی جگہ ہم عمر خواتین کی رفاقت پسند کی جاتی ہے کیونکہ وہ ذہنی طور پر باشعور ہوتی ہیں۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

گوروں کے پاس نخرے اٹھانے کا وقت نہیں ہوتا۔

عمر کو ابوظہبی ہوائی اڈے پر گزرنے والا یہ وقت ہمیشہ بہت اچھا لگتا۔ وہ ائیرلائن کے قریب پڑھتا پھرتا۔ چلتے چلتے وہ خورونوش کے اسٹال کے پاس سے گزرا۔ یہ پورا علاقہ طعام کے لیے مخصوص تھا۔ ہر ملک کے کھانے وہاں دستیاب تھے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک پرکشش خاتون پر ٹھہر گئی۔ وہ ایک اونچی کرسی پر بیٹھی تھی اور سامنے میز پر آئی پیڈ کھلا تھا۔ وہ انتہائی محویت سے اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

عمر نے اس کا بغور جائزہ لیا۔ وہ انتہائی نفاست سے سیاہ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے بیٹھی تھی۔ کمر سے چھوتے بالوں کے درمیان کہیں کہیں چاندی کی جھلکی سی آمیزش عمر کی چغلی کھا رہی تھی۔ انداز میں جاذبیت اور خود اعتمادی لیے ہوئے تھا۔ عمر چلتے چلتے اکا تو اس کے ذہن میں ایک خاکہ سا ابھرا ... ایک سیدھی سادی گھریلو خاتون جو معمولی کپڑے پہنے تھی۔ عمر نے سر جھٹکا۔ یہ وہ نہیں ہو سکتی۔ شکلیں ملتی ہیں لیکن انداز و اطوار تو کسی دوسری ملک کی گواہی دیتا ہے۔

عمر آگے نکل گیا لیکن اس کو بے کلی سی لگ گئی۔ ایک خلش سی پیدا ہونے لگی۔ اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔ ایک تصویر جس پر گرد پڑ گئی تھی وہ پھر عیاں ہو گئی۔ وہ اٹھ کر پھر ادھر ہی چل پڑا۔ وہ اسے قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔

''یس پلیز' ہاؤ کین آئی ہیلپ یو؟'' (جی فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟) خاتون نے اسے قریب سے گھورتے پایا تو انگریزی میں پوچھا۔ عمر کو لگا کہ کوئی مترنم گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اس آواز کو کیسے بھول سکتا تھا؟ کبھی اسی آواز نے اسے دیوانہ بنایا تھا۔ ایسی مدھر

مصنف سے ملیے

ذکیہ علی بیگ برطانیہ کے شہر، برمنگھم میں مقیم ہیں۔ دیارِ غیر میں مقیم پاکستانیوں کے سماجی مسائل پر عمدگی سے قلم اٹھاتی ہیں۔ تحریر میں ان مختلف الجھنوں کو بخوبی اجاگر کرتی ہیں جن سے لاکھوں پاکستانی بیرون ممالک میں دوچار ہیں۔

آواز کہ آدمی سنتا ہی رہے۔

اس خاتون کی آنکھوں میں بڑی ہی چمک، خود اعتمادی اور لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ توجہ کی عادی ہو۔ ایسی خود اعتمادی عموماً مغربی خواتین کا خاصہ ہے۔ پاکستانی خواتین میں حجاب سا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ عمر کچھ کہتا خاتون کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے آئی فون اٹھایا اور جرمن زبان میں باتیں کرنے لگی۔ ماڈرن انگریزی اور جرمن زبانیں ہندی اور اردو کی طرح ملتی ہیں۔ اسی لیے عمر کو اس کی بات سمجھ آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے خریدا ہوا سامان پسند نہیں آیا اور وہ اسے اسی قیمت پر واپس کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سختی سے پیشہ ورانہ طریقے سے معاملات طے کیے۔ عمر اب کچھ شکوک کا شکار ہو گیا۔ اتنی تیز رفتاری اس کی ماضی والی شبیہ میں نہیں تھی۔ وہ تو ایک ڈری ہوئی سی لڑکی تھی جو اپنے سائے سے بھی ڈر جاتی۔

بات ختم کر کے خاتون نے اپنی نظریں پھر عمر پر مرکوز کر دیں۔ وہ گڑبڑا گیا۔ اس نے دھیرے سے کہا ''زبیدہ۔''

ایک لمحے کے لیے خاتون کی آنکھوں میں حیرت سی آئی۔ لیکن اس نے فوراً خود پر قابو پا کر کہا ''آئی ایم کالڈ زویلی ناؤ۔'' (میں اب زویلی کہلاتی ہوں۔)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

عمر کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے بے ساختہ کہا ”آئی کیو یو ڈس نیم۔“ (میں نے تمھیں یہ نام دیا تھا)۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سن کر وہ شرما جائے گی۔ آخرکار پرانی محبت کے نام پر مشرقی عورت کو لاج آ جاتی ہے اور وہ ماضی سے دامن چھڑانا چاہتی ہے۔ عمر اس کی بدحواسی کا سوچ کر محظوظ ہوا لیکن اس کے برعکس زوبی نے ہنس کر کہا:

”یس عمر بٹ یو ہیو چینجڈ“ (ہاں عمر لیکن تم بدل گئے ہو)۔

عمر پھر پانی پانی ہو گیا۔ زوبی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عمر کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔ زوبی نے اس کی آنکھوں کی زبان پڑھ لی۔ اب محظوظ ہونے کی باری زوبی کی تھی۔ اسے عمر کی بدحواسی مزا دے رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ عمر کیوں بدحواس ہو رہا ہے۔ اتنی دیر میں اس کے آئی پیڈ نے اشارہ دیا کہ ای میل آئی ہے۔ اس نے سرعت سے آئی پیڈ کو پکڑ لیا۔ عمر ابھی تک تذبذب کا شکار تھا۔ زوبی نے اس کا بازو دھیرے سے دبایا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ عمر نے حکم کی تکمیل کی۔ زوبی نے پوچھا ”کیا لو گے؟“

عمر بولا ”آخری ملاقات تک تو میں اسپرسو لیتا تھا۔“

ترنت جواب آیا ”آخری ملاقات کے وقت میں بیس سال کی تھی۔ اور ملاقات کے درمیان تیس سال کا عرصہ حائل ہے۔“

عمر نے اسے رشک سے دیکھا، وہ اسمارٹ اور بردبار خاتون نظر آتی تھی۔ بے اختیار عمر کا ہاتھ اپنی توند کی جانب چلا گیا۔ تیس برسوں نے عمر سے بہت کچھ لے لیا تھا جبکہ زوبی کو بہت کچھ بخش دیا۔ اسے تو دبلی زبیدہ یاد تھی جسے اس نے کبھی حسین سپنے دکھائے تھے۔ پھر وہ خود کی اور جادوگری میں جا بسا۔ اسے پھر وہ دبلی لڑکی کبھی یاد نہیں آئی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اس کی حالت کے بارے میں سوچ کر محظوظ ہوتا۔ کتنا روئی تھی جب وہ ہالینڈ جا رہا تھا! اس کی گوری سی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئی تھیں۔ عمر کی انا کو بڑا سکون ملا۔ اس نے تو کوئی آس نہ دلائی تھی اور کیوں دلاتا؟ وہ تو خود پریوں کے دیس جا رہا تھا۔ عورت پہلی محبت کبھی نہیں بھول سکتی اور مرد... مرد کا کیا ہے؟ وہ تو ہرجائی اور بھنورے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا یہی خیال تھا کہ زبیدہ کی قسمت میں انتظار اور آنسو لکھے جا چکے۔

تیس برسوں نے عمر سے بہت کچھ لے لیا تھا جبکہ زوبی کو بہت کچھ بخش دیا۔ اسے تو دبلی زبیدہ یاد تھی جسے اس نے کبھی حسین سپنے دکھائے تھے۔

عمر اچانک ماضی سے نکل آیا جب زوبی نے کافی کا آرڈر دیا اور اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ عمر کے پاس ایئرلائن کا کوپن تھا اور وہ ٹھنڈی بیئر پینا چاہتا تھا لیکن جھجک گیا اور کافی کا آرڈر دیا۔ آرڈر کے ساتھ ہی بل دینا ہوتا ہے۔ عمر کا ہاتھ کوپن کی جانب گیا لیکن اس سے پہلے ہی زوبی کریڈٹ کارڈ نکال کر دے چکی تھی۔ عمر کو زبیدہ یاد آ گئی۔ وہ اس کے لیے سستے تحفے خرید کر لایا کرتا تھا، کبھی چوڑیاں اور کبھی پراندہ۔ وہ ایک حوالدار کی بچی تھی اور اس کے لیے ان تحائف کی بہت اہمیت تھی۔ وہ دیر تک ان چیزوں کو سینے سے لگائے رکھتی۔ کبھی چھوتی اور کبھی چومتی۔ آج جب زوبی نے بل ادا کیا تو عمر کو بہت عجیب لگا۔ واقعی ان کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

درمیان تیس سال حائل تھے۔

اتنی دیر میں زوبی کے آئی فون پر کال آئی۔ اس نے انگریزی میں بات چیت کرتے ہوئے آئی پیڈ بھی کھول لیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے رپورٹ تیار کر کے ای میل کر دی ہے۔ اب پریزنٹیشن تیار کر رہی ہے جو کانفرنس میں پڑھنی ہے۔ عمر کو پھر زبیدہ یاد آ گئی جسے بی اے کے بعد گھر بٹھا لیا گیا تھا۔ اس طبقے کی لڑکی کے خواب شادی تک محدود ہوتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی کیسے ادا ہوتی ہے اس سے انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی اور نہ انھیں کچھ بتایا جاتا ہے۔

لیکن زبیدہ نے انگریزی کب سیکھی؟ وہ اس مقام تک کیسے پہنچی؟ اس کی محبت کا یہ کیسا ڈراپ سین ہے۔ عام طور پر ایسا تو نہیں ہوتا۔ زبیدہ کو تو ان کی دو میں ساری عمر گزار دینی چاہیے تھی یا پھر زبردستی اس کی شادی کر دی جاتی۔ آج یہاں ملنے کے بجائے اسے ایک معمولی گھر میں میلے کپڑے پہنے بھرے ... سے برتن دھوتے بچوں کی شکایتیں کرتے ملنا چاہیے تھا۔ جبکہ اسے دیکھ کر وہ چھپ جانا چاہتی۔ آخر کو زمانے کا یہی دستور ہوتا ہے!

کیا تیس سالوں میں دنیا بالکل بدل چکی اور عمر کو خبر بھی نہ ہوئی؟ زوبی نے کال ختم کر کے آئی پیڈ بند کیا اور عمر سے بولی ''آؤ کھانا کھانے چلیں، مجھے کل کانفرنس پر سیمینار کی تیاری کرنی ہے۔''

عمر سحر زدہ کیفیت میں اٹھا۔ زبیدہ نے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا اور کچھ پوچھا بھی نہیں۔ مگر عمر کو تو بہت کچھ پوچھنا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔ ایک گتھی جس میں خلش کب کی بند تھی، لیکن کھلی اب!

> عمر کو تو بہت کچھ پوچھنا تھا۔ اس کے دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔ ایک گتھی جس میں خلش کب کی بند تھی، لیکن کھلی اب!

ابوظہبی ہوائی اڈے پر ہر مشہور ریستوران کی شاخ موجود ہے۔ زوبی روانی سے ہر ریستوران کی خوبیاں گنوا رہی تھی۔ عمر تو بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ اس زبیدہ کو تلاش کر رہا تھا جو ریڑھی سے دہی بھلے کھا کر خوش ہو جاتی تھی۔ اس نے بھی ریستوران تو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ یہ انقلاب کب اور کیسے آیا؟

زبیدہ نے ایک ریستوران کا انتخاب کیا اور اپنے لیے سلاد اور فروٹ چاٹ منگوایا۔ عمر نے ''انڈین کری'' کا انتخاب کیا۔ دراصل کئی سال بائینڈ رہ کر بھی وہ انگریزی پھیکے کھانوں کا عادی نہ ہو سکا تھا۔ اسے دیسی کھانے پسند تھے اور اس لیے توند نکل آئی۔ زوبی نے ہنس کر کہا ''میں اکثر اسکرٹ پہنتی ہوں کیونکہ میری سفید رنگت کی وجہ سے لوگ مجھے یونانی سمجھتے ہیں۔ عمر! یورپ میں پاکستانی پاسپورٹ اور لباس کی وقعت نہیں۔ اب دیکھو یہ ویٹر عزت سے پیش آ رہا ہے ورنہ اس نے کریڈٹ کارڈ کے بجائے نقد مانگنا تھا۔''

عمر نے ہمت کی اور اس نے پوچھا ''کیا تمھیں مجھ سے کوئی شکوہ نہیں؟''

وہ حیرت سے بولی ''کیسا شکوہ؟ ارے بھئی جب تمھیں کوئی پچھتاوا نہیں تو مجھے بھی کوئی شکوہ نہیں۔''

''پھر بھی کوئی یاد کوئی دھندلی سی تصویر؟''

زوبی نے مسکرا کر کہا ''وقت ساری یادیں دھندلا دیتا ہے۔ کبھی لوگ ماضی کو سینے سے لگائے

www.pdfbooksfree.pk

پھرتے تھے لیکن عمر! اب ٹیکنالوجی نے دنیا ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کو بدل دیا۔ لوگوں کے پاس اب رونے کو وقت نہیں۔ دنیا بہت تیز رفتار ہو چکی۔ ہر لمحہ پہلے سے زیادہ ہنگامہ خیز ہے۔''

عمر بات کاٹ کر بولا ''میں تو تمھیں خوابوں میں مدفون' محبت کے مزار پر چھوڑ کر گیا تھا۔''

''اور تم نے سوچا کہ مجھے ہمیشہ اس محبت کے مزار کی رکھوالی کرتے پاؤ گے؟ کیونکہ عورت کی قسمت میں صرف رونا لکھا ہے۔ اسے صرف ایک دفعہ محبت کرنے کا حق ہے۔ تم نے کبھی سوچا کہ میں اکیسویں صدی کی عورت ہوں جو بانو قدسیہ کے افسانے نہیں پڑھتی بلکہ بیری کلنٹن کو مردوں کی دنیا میں جگہ بناتے دیکھتی ہے؟ جب تم چلے گئے' تو واقعی میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ کوئی بھی نہ تھا جو میرا غم بانٹتا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ تم لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

میں چار دیواری میں قید تھی اور کوئی روزن نہ تھا۔ ایک گھٹن تھی اور وہ گھٹن میرا دم گھٹتا۔ سارا دن اپنے چھوٹے سے گھر میں جلے پیر کی بلی کے مانند گھومتی رہتی۔ تمہارے لیے تو نئی دنیا تھی' لیکن میں کہاں جاتی؟ مجھے احساس ہوا کہ پرانی فلموں کی ہیروئنیں کیوں رو رو کر اندھی ہو جاتی تھیں کیونکہ ان کے لیے کوئی راستہ نہ ہوتا تھا۔ پھر ایک دن میرے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا۔''

> مجھے احساس ہوا کہ پرانی فلموں کی ہیروئنیں کیوں رورو کر اندھی ہو جاتی تھیں کیونکہ ان کے لیے کوئی راستہ نہ ہوتا تھا۔ پھر ایک دن میرے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا۔''

عمر نے اچنبھے سے بھنویں اچکا ئیں۔ اس کی صورت دیکھ کر زوبی ہنس پڑی اور بولی ''ہم آج الف لیلوی دنیا میں ہی رہتے' ہوا میں اڑتے اور ہزاروں میل دور کے مناظر گھر بیٹھے دیکھتے ہیں۔ خیر میرے بھائی نے انٹرنیٹ لگوا لیا کیونکہ وہ گھر پر کمپیوٹر کا کام کرتا تھا۔ عمر میرے لیے یہی جادوگری ثابت ہوئی۔ میں یاہو پر سب سے پہلے ہالینڈ کی ویب سائٹ پر گئی۔ میں اس ملک کو دیکھنا چاہتی تھی جہاں تم گئے تھے۔ میں نے ہالینڈ کی تاریخ پڑھی اور سیاست کے بارے میں جانا۔ پھر میں چیٹ روم میں گئی اور ڈچ لوگوں سے باتیں کیں۔ آہستہ آہستہ میں تمھیں بھولتی گئی کیونکہ میرے سامنے ایک نئی دنیا وا ہو گئی۔ میں دیگر ممالک کی معلومات حاصل کرنے اور انگریزی بھی سیکھنے لگی۔ میں ملکوں ملکوں گھومتی اور وہاں کے لوگوں سے باتیں کرتی۔ ان کے بارے میں جانتی۔ میری ٹائپنگ رواں ہو گئی۔

''رفتہ رفتہ مجھے دنیائے کمپیوٹر سے متعلق اتنی زیادہ معلومات حاصل ہو گئیں کہ ایک کالج میں آئی ٹی لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔ یہ نوے کی دہائی تھی اور بہت کم خواتین اس میں مہارت رکھتی تھیں۔ عمر، میں تمھیں بتا نہیں سکتی کہ میری اپنی تنخواہ کا کیا نشہ تھا۔ میری گھر میں کیا اہمیت تھی۔ مجھے پروین شاکر کی نظم بار بار یاد آتی: ''میں اپنی ہریالی لیے ہوئے سینچ رہی ہوں۔'' میں یوں معتبر ہو گئی۔ مجھے ہر موضوع پر اتنی معلومات ملیں مجھے کہ ہر کوئی مجھ سے متاثر رہنے لگا۔''

زوبی کی آنکھوں میں بیتے دن کامرانی کے موتی بن کر دمک رہے تھے۔ وہ پھر گویا ہوئی ''میں نے بذریعہ انٹرنیٹ ایک جرمن کالج میں داخلے کی درخواست دے دی۔ خوب محنت کی ڈگری لی اور پھر

www.pdfbooksfree.pk

جرمنی میں مجھے ملازمت بھی مل گئی۔ اب میں جرمنی میں اپنی فرم چلاتی ہوں۔''

''اچھا تو تمہاری شخصیت کو کس نے اعتماد دیا؟'' عمر نے پوچھا۔

''جرمنی نے! وہاں عورت کو مرد کے برابر کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اسے آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں۔ اسے اعتماد دیا جاتا ہے، کوئی مرد اس سے بدتمیزی نہیں کر سکتا۔''

''اور یہ تم بال کیوں نہیں رنگتی؟'' عمر اسے شرمندہ کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود کو بہت کمتر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کئی سال محنت کے بعد محض ایک دکان کا مالک بن سکا تھا۔

''عمر! میں خود کو بہت محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں انسان کو سمجھتی ہوں۔ اس کی ظاہری شخصیت کو نہیں! مجھے تو جوان نظر آنے کی قطعاً خواہش نہیں کیونکہ گلزار کے الفاظ میں: جو ملی، خوب ملی ہے۔ میں [illegible] نظر رکھنا چاہتی ہوں۔''

''جو تم نظر آتی ہو۔'' عمر نے آہ بھر کر کہا۔

''کسی لمحے مجھے یاد کیا؟'' عمر نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پر امید لہجے میں پوچھا۔

''ہر لمحہ۔'' زوبی نے مسکرا کر کہا اور عمر کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ چھا گئی۔

''تمہاری بے وفائی میری زندگی کا حاصل ہے۔'' وہ ہنس پڑی جیسے اپنے جملے سے محظوظ ہوئی ہو۔ عمر نے نگاہیں چرائیں۔

''پھر کب ملو گی؟'' عمر نے پوچھا۔

''عمر! ہم زمان و مکان کی قید میں ہیں۔ آج اس قید نے اتفاقاً چند لمحوں کی رہائی دے دی۔ جانے پھر کب ملتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' عمر نے حیرت سے سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ واقعات کو خاص زمرے میں ترتیب دینے کے لیے جگہ کی بھی خصوصیت ہے۔ اگر تم ابوظہبی کے بجائے دبئی ہوائی اڈے کا انتخاب کرتے اور میری پرواز لیٹ نہ ہوتی، تو ہماری ملاقات نہیں ہو پاتی۔ اب انتظار کرو کہ نجانے کب زمان و مکان ہمارے لیے پھر سازگار حالات پیدا کرتے ہیں۔''

عمر گنگ ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ خواتین ڈائجسٹ پڑھ کر ناداں گفتگو کرنے والی زبیدہ تو نہ تھی۔ وہ اب اس کی ذاتی زندگی کے متعلق سوال کرنا چاہتا تھا کہ زوبی کی آئی پیڈ پر سکائپ بولنے لگا۔ اسکرین پر ایک خوبصورت باورچی خانہ نظر آیا جہاں ایک بچہ کھانے کی میز پر بیٹھا تھا۔ ایک جیدم آدمی اپرن باندھے انڈا تل رہا تھا۔ وہ جہاں بھی تھا وہاں اجالا ہو رہا تھا۔ بچے نے زوبی کو دیکھ کر کلکاریاں ماریں۔

آدمی پیچھے مڑا اور ہنس کر بولا ''اب گھر آ جاؤ منے کی اماں بہت کاروبار ہو گیا۔ ہم تمہیں یاد کر رہے ہیں۔ نیپیاں بدل بدل کر میں تھک چکا، میرا کام بھی متاثر ہو رہا ہے۔''

زوبی ہنس کر بولی ''یہ آخری دورہ تھا۔ اب بیٹے کے نرسری جانے تک کاروبار صرف گھر رہ کر ہو گا۔''

یہ تھی آج کی عورت اور ''ماڈرن'' [illegible] انٹرنیٹ نے تو عشق کو بھی بدل ڈالا تھا۔ عمر خاموشی سے اٹھا اور چل دیا۔ اسے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سو امراض کی ماں

موٹاپا ختم کرنے والی 10 غذائیں

ان غذاؤں کا طبی تحفہ جو انسان کو فربہ نہیں کرتیں بلکہ چربی گھلانے میں مدد دیتی ہیں

عالیہ فاطمہ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

میرا ایک دوست مذاقاً کہتا ہے ''کاش مچھر خون پینے کے بجائے ہماری چربی چوس لیا کرتے۔ یوں کسی انسان کو موٹاپے میں مبتلا نہ ہونا پڑتا۔''

دراصل موصوف خاصے فربہ ہیں اور ان تمام مسائل کا شکار جو فربہی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے، موٹاپا کئی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اسی لیے فربہ مرد و زن متفرق امراض کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔

جدید طبی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ بعض غذائیں بھی انسان کو موٹاپے سے بچاتی ہیں۔ وہ یوں کہ انھیں کھانے سے انسان کو اتنی زیادہ غذائیت ملتی ہے کہ اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔ اس طرح مزید کھانا کھانے کی حاجت نہیں رہتی اور وہ موٹاپے سے محفوظ رہتا ہے۔

ذیل میں ایسی ہی دس غذاؤں کا تذکرہ ہے جو ہمیں تمام ضروری غذائیات فراہم کرتی ہیں، لیکن ہمیں فربہ نہیں ہونے دیتیں۔

ترش پھل

لیموں، کنو، مالٹے، گریپ فروٹ وغیرہ اپنے اندر خوب وٹامن سی رکھتے ہیں۔ وٹامن سی کی خوبی یہ ہے کہ اس کی مدد سے انسانی جسم بہ سرعت چربی گھلاتا ہے۔ یوں وزن گھٹانا آسان ہو جاتا ہے۔

انسان کو روزانہ ۶۰ تا ۷۰ ملی گرام وٹامن سی درکار ہوتا ہے۔ مگر تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ فربہ مرد و زن ورزش کرتے ہوئے روزانہ ۵۰۰ ملی گرام وٹامن سی لیں، تو ان کے پیٹ، رانوں اور دیگر جسمانی حصوں میں جمی چربی تیزی سے گھلنے لگتی ہے۔ تاہم جو مرد و زن مختلف ادویہ استعمال کرتے ہیں، وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد ۵۰۰ ملی گرام وٹامن سی لینا شروع کریں۔

گندم کی روٹی

ڈاکٹر اب سبھی کو تلقین کرتے ہیں کہ صبح ناشتا ضرور کیجیے۔ وجہ یہ کہ اگر ہم خالی پیٹ دن کا آغاز کریں، تو جلد ہماری ساری توانائی خرچ ہو جاتی ہے۔ پھر ہم بعد میں ضرورت سے زیادہ غذائیں چٹ کر جاتے ہیں۔ یہی معمول موٹاپے کو دعوت دیتا ہے۔

دوسری تلقین یہ ہے کہ ناشتے میں فائبر سے بھرپور کوئی غذا ضرور کھائیے۔ وجہ یہی کہ فائبر ہماری بھوک ختم کرتا ہے۔ لہٰذا صبح ہی فائبر والی غذا کھا لی جائے، تو انسان دیر تک بھوک محسوس نہیں کرتا۔

فائبر یا ریشہ ثابت اناج میں ملتا ہے۔ اسی لیے صبح بنا چھانے گندم کے آٹے کی روٹی کھائی جائے، تو انسان شام تک سیر رہتا ہے۔ یوں وہ الم غلم غذائیں کھانے سے بچ جاتا ہے۔ فائبر گندم کے علاوہ دالوں، سویابین، مٹر اور مکئی میں بھی ملتا ہے۔

> ناشتے میں فائبر سے بھرپور کوئی غذا ضرور کھائیے۔ وجہ یہی کہ فائبر ہماری بھوک ختم کرتا ہے۔

اسٹابری

یہ پھل موٹاپا کم کرنے کے سلسلے میں دونوں اہم غذائی عناصر، وٹامن سی اور فائبر معقول مقدار میں رکھتا ہے اور خاص بات یہ کہ اس میں حرارے (کیلوریز) بھی کم ہوتے ہیں۔ یعنی ایک پیالی اسٹابری میں صرف ۶۰ حرارے پائے جاتے ہیں۔

تحقیق سے دریافت ہوا ہے کہ اسٹابری شکم کی چربی گھلاتی اور زائد حرارے بھی جذب کرتی ہے۔ لہٰذا جب اس پھل کا موسم ہو، تو اسٹابری کھائیے اور موٹاپے سے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

محفوظ رہیے۔

چربی سے پاک گوشت

گائے، بکرے اور مرغ کا چکنائی یا چربی سے پاک گوشت ہم تناول کریں، تو ہمارا جسم اسے ہضم کرنے پر زیادہ توانائی خرچ کرتا ہے۔ لہٰذا بغیر چکنائی والا گوشت کھائیے۔۔۔ ہمارا جسم خودبخود زائد حرارے خرچ کرنے اور اپنے اندر بھی چربی گھلانے لگے گا۔

طبی تجربات سے انکشاف ہوا کہ جو مرد و زن چربی سے پاک گوشت کھائیں، ان میں نہ کھانے والوں کی نسبت زیادہ حرارے جلتے ہیں۔ مزید برآں گوشت میں شامل پروٹین عضلات کی مرمت اور انھیں صحت مند بنانے میں کام آتا ہے۔

سبز چائے

یہ چائے کیفین کی حامل ہے۔ کیفین ایک قدرتی تحرک انگیز (Stimulant) مادہ ہے۔ جب ہم آرام کر رہے ہوں، تب بھی کیفین ہمارے بدن میں پہنچ کر حرارے جلانے لگتا ہے۔ مزید برآں سبز چائے میں ای جی سی جی (EGCG) نامی غذائی مادہ بھی ملتا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ دماغ اور اعصابی نظام متحرک کر کے ہمارا استحالہ یعنی میٹابولزم بڑھاتا ہے۔

یاد رہے، ہمارے جسم میں استحالہ کے ذریعے ہی چربی اور دیگر مادے گھلتے ہیں۔ ان کے گھلنے سے خلیوں کو توانائی ملتی ہے اور وہ اپنے معمول کے کام جاری رکھتے ہیں۔

کیفین ہمارے دل کی دھڑکن بھی تیز کرتی ہے۔

> ہمارے جسم میں استحالہ کے ذریعے ہی چربی اور دیگر مادے گھلتے ہیں۔ ان کے گھلنے سے خلیوں کو توانائی ملتی ہے۔

یہ عمل بھی ہمارے جسم میں ذخیرہ شدہ چربیلے تیزاب گھلاتا ہے۔ کیفین اور ای سی جی سی کی حامل ہونے کے باعث سبز چائے بازاری بوتلوں سے بدرجہا بہتر مشروب ہے۔ یہ بوتلیں پی کر تو انسان حرارے ہی پاتا اور فربہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

چکنائی والی مچھلیاں

پاکستان میں سالمن، ٹونا، میکرل اور سارڈین نامی مچھلیاں ڈبا بند غذاؤں کی شکل میں دستیاب اور خاصی مہنگی ہیں۔ ان چاروں مچھلیوں میں چربیلا مادہ، اومیگا۔۳ فیٹی ایسڈز بکثرت پایا جاتا ہے یہ مادہ ہمارے جسم میں پہنچ کر چربی گھلانے والے خامرے (انزائمز) متحرک کرتا ہے۔

خوش قسمتی سے اومیگا۔۳ فیٹی ایسڈز مادہ ٹراؤٹ مچھلیوں میں بھی ملتا ہے۔ یہ مچھلیاں سوات اور قرب و جوار کے علاقوں میں دستیاب ہیں۔ ایک طبی تحقیق سے پتا چلا ہے کہ اگر درج بالا مادہ رکھنے والی مچھلیاں باقاعدگی سے کھائی جائیں، تو انسان بھی فربہ نہیں ہوتا [illegible] چاہے وہ معمول کے مطابق الم غلم غذا بھی کھاتا [illegible]۔

مرچ

جی ہاں، منہ میں مرچیں لگا دینے والی مرچ بھی ہمارا وزن کم کرنے میں کام آتی ہے۔ وجہ یہ کہ مرچوں میں کیپسیسین (Capsaicin) نامی مادہ پایا جاتا ہے۔ یہ مادہ بھی تحرک انگیز ہے۔ یہ حرکت قلب اور استحالہ، دونوں میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں ہمارے بدن میں چربی گھلنے کی مقدار بھی بڑھ جاتی ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

لہٰذا معتدل طور پر مرچوں بھرے کھانے کھائیے اور خود کو صحت مند رکھیے۔ تاہم یاد رہے، مرچیلے کھانوں کی زیادتی نظام ہاضمہ خراب کرتی اور السر چمٹنے کا اندیشہ بڑھا دیتی ہے۔

پستہ

یہ پروٹین اور فائبر سے بھرپور غذا ہے۔ جبکہ اسی قسم کی دیگر غذاؤں کے مقابلے میں یہ حرارے کم رکھتی ہے۔ اسی لیے پستہ وزن کم کرنے والوں کی مرغوب غذا ہے۔ اکثر اوقات محض آدھ پیالی پستے انسان کو اتنا سیر کر دیتے ہیں کہ اسے کوئی اور غذا کھانے کی حاجت نہیں رہتی۔

مسور کی دال

جی ہاں، پروٹین اور فائبر کی موجودگی مسور کو بھی عمدہ ''ڈائیٹری'' غذا بنا ڈالتی ہے۔ مسور کی صرف ایک پلیٹ سے ہمیں ۱۸ گرام پروٹین، ۱۶ گرام فائبر اور محض ۲۰۰ حرارے حاصل ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ وزن کم کرنا چاہتے ہوں یا موٹاپے سے بچنا ہو تو مسور کی دال اکثر و بیشتر استعمال کیجیے۔

پاپ کارن

ٹی وی خصوصاً فلم دیکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ کھاتے رہنا انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کھاتا رہے۔ مگر یہی تمنا عموماً اسے موٹاپے کا شکار بنا ڈالتی ہے۔ اب ماہرین طب کا کہنا ہے کہ فلم دیکھتے ہوئے کچھ کھانا ہی ہے، تو پاپ کارن کھائیے۔

وجہ یہی کہ مکئی کے یہ بھنے دانے خاصی تعداد میں فائبر اور پروٹین رکھتے ہیں۔ جبکہ ان میں حراروں کی مقدار زیادہ نہیں ہوتی۔ لہٰذا معتدل مقدار میں پاپ کارن کھائیے اور وزن کم کرنے کے اپنے منصوبے کو کامیاب بنا لیجیے۔

مامون نظام بہتر بنانے والی غذائیں

ہمارے جسم میں خصوصی خلیے، پروٹینی مادے، بافتیں اور اعضا مل کر ایک مدافعتی نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ اصطلاح میں ''مامون نظام'' (Immune System) کہلاتا ہے۔ اسی نظام کی بدولت ہمارا جسم جراثیم اور چھوتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ درج ذیل غذائیں ہمارے اس مدافعتی نظام کو مضبوط بناتی ہیں۔

ان میں سرفہرست وہ غذائیں ہیں جن میں وٹامن سی بافراط ملتا ہے۔ مثال کے طور پر سرخ و سبز مرچ، امرود، گوبھی، ساگ، کنو و لیموں، ٹماٹر اور مٹر۔ وٹامن سی مامون نظام کی خرابیاں درست کر کے اسے قوی بناتا ہے۔

> **لہٰذا معتدل مقدار میں پاپ کارن کھائیے اور وزن کم کرنے کے اپنے منصوبے کو کامیاب بنا لیجیے۔**

وٹامن ای بھی ایک غیر تکسیدی (Antioxidant) مادہ ہے۔ غیر تکسیدی مادے ہمارے بدن میں تیار تیزاب نکال باہر کرتے ہیں۔ لہٰذا وٹامن ای والی غذائیں مثلاً سورج مکھی کے بیج، ساگ، گوبھی اور اخروٹ وغیرہ کھاتے رہیے۔

تیسرے نمبر پر وٹامن بی ۶ ہے۔ یہ ایک اہم وٹامن ہے کیونکہ ہمارے جسم میں ''۲۰۰'' سے زائد حیاتی کیمیائی (بائیو کیمیکل) ردعمل اسی کی مدد سے انجام پاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارے نظام مامون کی تندرستی کے لیے درکار اہم وٹامن ہے۔ یہ سورج مکھی کے بیجوں، پستے، چکن، آلو، کیلے اور ساگ میں ملتا ہے۔

وٹامن اے بھی ایک اہم غیر تکسیدی مادہ ہے۔ یہ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

غذاؤں میں ''کاروٹینوئیڈز'' (Carotenoids) کی صورت ملتا ہے۔ یہ کیمیائی مرکب ہمارے جسم میں پہنچ کر وٹامن اے میں بدل جاتے ہیں۔ یہ مرکب گاجر، شکرقندی، حلوہ کدو اور گھیے میں ملتے ہیں۔ اگر چھوت انسان کو چھٹ جائے، تو وٹامن اے ہمارا نظام مامون طاقتور بنا کر اسے ختم کرنے میں مدد دیتا ہے۔

نظام مامون کی مضبوطی کے لیے وٹامن ڈی بھی ضروری ہے۔ تاہم یہ حیاتین بہت کم غذاؤں میں ملتا ہے۔ اسی لیے مرد و زن دھوپ میں بیس پچیس منٹ بیٹھ کر اسے لیتے ہیں۔ یا پھر ادویہ کے ذریعے وٹامن ڈی لیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سے مشورہ ضروری ہے۔

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ سرطان میں مبتلا جو انسان لہسن، بند گوبھی اور ثبت اناج کھائے، اس کا مرض تیزی سے نہیں پھیلتا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ایسا معدن سیلنیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ معدن نظام مامون کو قوی بناتا ہے۔

غذائیں جو سانس کو خوشگوار بنائیں

جس انسان کے منہ سے بدبو آرہی ہو، کوئی اس کے قریب آنا پسند نہیں کرتا۔ منہ کی بدبو مختلف وجوہ کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ ویسے بھی منہ کسی کوڑے دان کے مانند ہے۔ اس میں ۶۰۰ سے زائد جراثیم رہتے بستے ہیں۔ نیز پروٹین (گوشت)، لہسن اور پیاز میں شامل گندھک مرکبات بھی منہ میں بدبو پیدا کرتے ہیں۔

ایک رپورٹ کے مطابق منہ کی سانس معطر کرنے کی خاطر ہر سال ایک ارب ڈالر (ایک کھرب روپے)

عمر گھٹانے والی غذائیں

ہر انسان طویل عمر پانا چاہتا ہے۔ اچھی غذا کے ذریعے بھی یہ منزل پانا ممکن ہے۔ اور جو مرد و زن عمدہ خوراک نہ کھائیں، وہ جلد اگلے جہان پہنچ جاتے ہیں۔ جدید تحقیق سے دریافت ہوا ہے کہ بعض غذائیں ہمارے خلیوں کے خاص حصے، ''ٹیلومیرس'' (Telomeres) کو نقصان پہنچا کر ہمیں قبل از وقت بوڑھا کر دیتی ہیں۔

ٹیلومیرس ہر خلیے کے آخری حصے میں واقع ہوتے ہیں۔ یہ خلیے کے ڈی این اے کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھتے اور یوں اس کی عمر بڑھاتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب انسان خراب غذا کھائے، تو ٹیلومیرس وقت سے پہلے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر بیرونی کیمیائی مادوں کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ چناں چہ خلیے مختلف بیماریوں مثلاً سرطان، امراض قلب، ذیابیطس وغیرہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ماہرین نے دریافت کیا ہے کہ کولا مشروبات ٹیلومیرس کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ چینی سے لدے یہ مشروبات اگر انسان روزانہ ایک گلاس بھی نوش کرے، تو اس کی عمر ''پانچ سال'' تک کم ہو جاتی ہے۔

دوسرا مجرم بازار میں بکتا گوشت ہے۔ یعنی وہ گوشت جو ہوٹلوں میں بن کباب اور مختلف اقسام کے کبابوں کی شکل میں ملتا ہے۔ یاد رہے، گوشت کوئی بھی ہو، اس کی زیادتی صحت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ شراب اور دیگر نشے جو کہ ویسے بھی حرام ہیں ٹیلومیرس کی لمبائی گھٹاتے ہیں۔ لہٰذا ان سے بھی پرہیز کیجیے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کی اشیا مثلاً چیونگم، گولیاں ٹافیاں وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔ مگر یہ عارضی طور پر بدبو دور کر پاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے قدرت نے سانس معطر کرنے والی غذائیں بھی پیدا کر رکھی ہیں جن کا تذکرہ پیش ہے۔

ان میں سرفہرست سبز یا کالی چائے ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں اقسام کی چائے غیر تکسیدی مادے "پولی فینول" رکھتی ہیں۔ یہ مادے منہ میں بدبو پیدا کرنے والے جراثیم مار کر سانس کو خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ یہ گندھکی مواد کا بھی خاتمہ کرتے ہیں۔

دوسرے نمبر پر دہی ہے جو چینی یا نمک ملائے بغیر کھائی جائے۔ تحقیق سے پتا چلا کہ جو انسان روزانہ صرف ایک پیالی دہی کھائے اس کے منہ میں گندھکی مادوں سے جنم لینے والی بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ وجہ یہ کہ دہی میں ملنے والے انسان دوست جراثیم ان مادوں کا خاتمہ کر ڈالتے ہیں۔ یاد رہے چینی میں دہی ملا کر کھانے سے اتنا نقصان ہوتا ہے۔

پانی پینا بھی موثر علاج ہے۔ وجہ یہ کہ بدبو کے خالق بیشتر جراثیم خشک ماحول میں پلتے بڑھتے ہیں۔ لہٰذا پانی پینے سے منہ میں پھنسے غذائی ذرات اور جراثیم نکل جاتے ہیں۔ پانی کے باعث لعاب دہن بھی پیدا ہوتا اور منہ کی صفائی کر ڈالتا ہے۔

لہسن اور پیاز میں مختلف اقسام کے گندھکی مادے پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے انھیں باقاعدہ استعمال کرنے والوں کے منہ سے بہت بدبو آتی ہے۔ مگر وہ پیاز لہسن کے ساتھ دھنیا، پودینہ، اجوائن یا نیاز بو (جڑی بوٹیاں) بھی کھا لیں تو منہ کی بدبو سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ان جڑی بوٹیوں میں پولی فینول مادے ہوتے ہیں۔

یہی پولی فینول غیر تکسیدی مادے سیب اور پالک میں بھی ملتے ہیں۔ اسی لیے یہ دونوں بھی لہسن و پیاز سے پیدا شدہ منہ کی بدبو دور کرتے ہیں۔

جب منہ کے جراثیم پھنسے غذائی ذرات تناول کریں، تو وہ میتھائل مرکیپٹن نامی بدبودار گیس خارج کرتے ہیں۔ اسی گیس کے باعث منہ سے بدبو آتی ہے۔ لیکن کھانے کے ساتھ سلاد کھائی جائے، تو گیس کی بدبو جاتی رہتی ہے۔ وجہ یہ کہ سلاد کے کیمیائی مادے اسے ختم کر دیتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے بزرگ بجا فرما گئے کہ کھانے کے ساتھ سلاد ضرور ہونی چاہیے۔

مناجات

من کے اندر پھیلی کالک دھونے آیا ہوں
تیرے گھر کے اندر تیرا ہونے آیا ہوں

تو نے میرا ہجر میں برسوں رونا دیکھا ہے
آج تیری دہلیز سے لگ کر سونے آیا ہوں

نیکی میرے پاس کہاں میزان میں رکھنے کو
میں تو آنسو اور فریادیں ڈھونے آیا ہوں

جس نے مجھ کو تجھ سے دور کیے رکھا مالک!
اس ہم زاد کو تیرے شہر میں کھونے آیا ہوں

تو جانے اور کھیتی جانے، میں تو میرا مولا!
تیرے آنکھ میں یہ آنسو بونے آیا ہوں

پچھلی باتوں پر نہ جانے، اے جان انیس
آج تو تیرے شہر میں تیرا ہونے آیا ہوں

(محمد انیس انصاری، جھنگ صدر)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

معاشرت

انسان چار اربعہ عناصر کا مرکب ہے۔ یہ چاروں ایک مشترک صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ ہے اثر لینے کی خاصیت۔ یہی وجہ ہے، انسان جس ماحول اور علاقے میں جنم لے، وہاں کے جغرافیائی، معاشرتی، ماحولیاتی اور تمدنی اثرات سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔

مگر اس سادہ معاملے کے علاوہ ایک پیچیدہ بات یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ہم انفرادی اور گروہی سطح پر کسی ماحول کا حصہ نہ ہوں پھر بھی سمندر پار علاقوں کے لوگوں کے طرز معاشرت سے نہ صرف متاثر ہوتے بلکہ اسی رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔ گویا خربوزہ تو بچارا خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے، مگر انسان محض سن سنا کر ہی رنگ پکڑ لیتا ہے۔ بقول ہمارے دوست اور ہمزاد جناب میر ''عورتیں اس معاملے میں مرد سے بھی آگے ہیں۔'' اثر پذیری میں سب سے عجلت رنگ سیاہی اور نظریاتی پایا گیا ہے کیونکہ یہ نہ صرف جغرافیائی بلکہ تاریخی حدود و قیود کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

یہ تمہید دراصل ایک جوڑے کی کتھا سنانے کو باندھی جن کی زندگی رنگوں کا عجیب آمیزہ بن گئی۔ ایک تھے شہباز میاں اور ان کی بیگم شہناز! شہناز گھریلو خاتون تھیں جبکہ شہباز میاں صحافی تھے۔ کچھ عرصے سے وہ پارلیمان میں

سب سے ممتاز، انمٹ، گہرا

صبغۃ اللہ

جہاں بھر کی خوشیاں جھولی میں ڈالنے والے پالن ہار سے انسان بیگانہ رہے تو پھر ایسی زندگانی کا فائدہ؟

نجم الحسن

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

کارروائی کی رپورٹنگ کر رہے تھے مگر اس بات کو چھپاتے۔ جدید سیاسی لغت میں چونکہ پارلیمان کے تعلق، جعلی ہونے کی اصطلاح فیشن کا حصہ بن گئی ہے، تو کہیں لوگ انھیں بھی جعلی صحافی نہ کہہ دیں۔

سیاست سے قطع نظر ان کی زندگی اتفاقات کا دلچسپ مجموعہ تھی۔ مثلاً وہ اور شہناز بیگم بیک وقت خالہ زاد و چچازاد تھے، اکلوتے بھی اور ایک ہی روز ایک ہی اسپتال میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے ساتھ ہی سلسلۂ جنبانی شروع ہو گیا اور جھولے میں رشتہ پکا ہوا۔ ایک ہی اسکول اور کالج میں تعلیم پائی۔ چودہ برس قبل رشتۂ ازدواج میں بندھے۔ نتیجے میں چار بچے یعنی دو لڑکیاں دو لڑکے پائے۔

شہناز بیگم کو بچپن ہی سے فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی تھی۔ اوائل جوانی سے کتابیں ناولیں ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ مذاق نہیں حقیقتاً جس کا ثبوت خود شہباز میاں کے پاس تھا۔ ان کی منظوم آنکھوں نے بارہا اپنی خالہ جان اور ان کی والدہ، جدہ کو کافی غیر ادبی ارشادات کے ساتھ بیگم کے سوتے میں اوپر نیچے دبی کتابیں نکالتے دیکھا۔

شروع سے یہ حال تھا کہ جو کہانی پڑھتیں، اسے خود پر طاری کر لیتیں اور اتنی شدت سے کہ جتنا خود ادیب کے لیے بھی ممکن نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ خود کو کہانی کی ہیروئن سمجھتیں۔ اگر ہیروئن ہنسوڑ اور شوخ مزاج ہوتی، تو خود بھی بات بات پر پھلجھڑی چھوڑتیں، خوب قہقہے لگا کر ہنستیں اور ہر کسی کو مذاق کا نشانہ بنا دیتیں۔

ایسے میں شہباز میاں ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی ایسی کتاب لے آتے جس میں ناول کی ہیروئن آنسوؤں سے لبریز اداسی کا مرقع اور غموں کی ماری ہوتی۔ اب یہ اداس کردار دو صفحات پڑھنے کے بعد ہی شہناز بیگم کے اندر حلول کر جاتا اور پچھلی ہیروئن نکل جاتی۔ اب وہ بال الجھائے، آنکھوں میں اداسی کے ڈیرے جمائے چپ چاپ ادھر ادھر تصویر غم بنی پھرتیں۔ شروع میں تو گھر والے سکھ کا سانس لیتے مگر جب بات بڑھ جاتی اور موصوفہ ذرا ذرا سی بات پر آنسو پونچھتی نظر آتیں، تو یہ حرکت وبال جان بن جاتی۔ اب پھر شہباز میاں کتب خانے کا رخ کرتے اور خاصی عرق ریزی کے بعد کسی معتدل مزاج ہیروئن پر لکھا ناول لے آتے جس کی وجہ سے کافی دن امن رہتا۔

شادی ہوئی، تو ان کی ساس بیمار ہو گئیں۔ انھوں نے آتے ہی اپنی ساس کو سنبھال لیا۔ یوں بھی وہ خالہ کی لاڈلی بیٹی اور بہو تھی۔ پھر اوپر تلے چار بچوں کی پیدائش نے زندگی سے وہ فرصت چھین لی جو تالیف ادب کے لیے درکار تھی۔ دس برس بعد بچے کچھ سمجھدار ہوئے اور خالہ ساس اللہ کی رحمت میں چلی گئیں، تو شہناز بیگم کو پھر فرصت کا وقت ملنے لگا۔ چناں چہ فنون لطیفہ کا شوق عود آیا۔

گزشتہ چار سال سے وہ پھر اپنے سابقہ رنگ میں آ گئیں لیکن اب ناول پڑھنے کے لیے کم، دیکھنے کو زیادہ۔ متاثر ہوئیں۔ ٹی وی پر مختلف ڈراما چینل ناولوں پر دھڑا دھڑ ڈرامے بنا کر پیش کرتے۔ کھانے کے بعد جب بچے جہد سو جاتے، تو وہ اطمینان سے دیکھا کرتیں۔ لاؤنج میں ایک کونے میں دھری لکھنے کی میز پر کاغذوں کا انبار سجائے، کانوں پر کن ٹوپ چڑھائے شہباز میاں اپنے کالموں اور رپورٹوں میں سیاستدانوں کے بخیے ادھیڑا کرتے۔

منہ کا ذائقہ بدلنے کو بیگم تجزیے اور گفتگو کے پروگرام بھی دیکھ لیتیں۔ چناں چہ کبھی کبھار لیڈروں کی طرح بکی بکی باتیں بھی کرتیں، کبھی پرانے پاپیوں یا انقلابیوں کی طرح گھونسے تان تان کر اور کف اڑاتے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہوئے نظام پر پُرتشدد بیانات دینے لگتیں۔ ایک روز ایک ڈراما دیکھتے ہوئے انھیں غصے سے گھورنے لگیں، تو کن ٹوپ چڑھائے شہباز میاں بوکھلا گئے۔

میر کہتے ہیں کہ صحافی کاغذ کا شیر ہوتا ہے مگر ہم اپنی ازلی مصالحت اندیشی سے مجبور ہیں، اس لیے اصرار کرتے ہیں ''یار یہ کہو کہ صحافی قلم کا شیر ہوتا ہے۔ یوں شانِ صحافت سلامت رہتی ہے اور مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔'' خیر شہباز میاں نے تیزی سے سوچنا شروع کیا کہ کہیں وہ بیگم کی سالگرہ تو نہیں بھول رہے؟ مگر نہیں وہ تو ایک ماہ پہلے گزری تھی۔ بیگم کی ذاتی دلچسپی کے بدولت وہ ان کا پسندیدہ تحفہ لائے تھے۔

پھر کہیں شادی کی سالگرہ؟ مگر نہیں، اسے بھی بخیریت گزرے تین ماہ ہوچکے۔

پچھلے پانچ برس سے وہ ان مواقع کو اکل نہ بھولے تھے۔ چناں چہ ماضی کی خانہ جنگی خیال و خواب ہو چکی تھی۔ اس میں بڑی بیگم کی حاضر دماغی کا بڑا ہاتھ تھا جو انھیں بار بار خفیہ یاددہانی کرا کر تحفے تک کا انتخاب کرتی۔ جب انھوں نے خود کو ہر متوقع خطا سے بری پایا، تو ذرا حوصلہ پا کر کن ٹوپ اتارا اور بیگم کی سمت سوالیہ انداز سے دیکھا۔

وہ خفگی سے بولیں ''میں کہتی ہوں آخر کب تک آپ مرد ہم بیچاری عورتوں کو ظلم کا نشانہ بناتے رہیں گے؟'' انھوں نے بطورِ خاص 'آپ' اور پھر 'ہم' پر زور دیا۔

شہباز میاں برا مان گئے۔

''میں؟ میں نے کیا اور کب کیا؟''

وہ تیورا کے بولیں ''اور نہیں تو کیا؟ عورت چاہے گھریلو ملازمہ ہو، چاہے کسی خوشحال گھرانے کی خاتون خانہ یا خود مختار عورت...... سب بے چاریاں شوہروں کی باندیاں ہیں۔''

یہ سن کر شہباز میاں خاموش ہو گئے۔ بقول میر مرد بیچارا بار بار سن کر ہی خود کو ظالم سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب دوسرے ہی پل انھیں اس حقیقت کا ادراک ہوا تو انھوں نے اپنے دفاع کا سوچا اور بولے ''دیکھیں بیگم، یہ آدھا سچ ہے...... کل ہی اسمبلی میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ اصل ظالم ہے کون..... مرد، عورت یا عمران خان؟''

یہ سننا تھا کہ بیگم نے جارحانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر انھیں روکا ''بس میاں بس...... ہمیں اب آپ کا پارلیمان نامہ نہیں سننا۔ آپ مجھے تو کہتے ہیں کہ میں جو دیکھوں اسی رنگ میں رنگ جاتی ہوں۔ اور خود جو بات بات پر اسمبلی کا ذکر خیر لے آتے ہیں، وہ؟''

ان کی زندگی میں جو تکلیف دہ ناگوار کبھی نہ آئی تھی، اس میں دونوں کا یکساں ہاتھ تھا۔

شہباز میاں چڑ سے گئے۔ ''اللہ سے ڈرو بیگم، میں ایسا کب کرتا ہوں؟''

وہ اطمینان سے گویا ہوئیں ''ابھی کل جب بچے آپس میں لڑ رہے تھے، تو آپ نے کہا، چپ کرو تم بچو، یہ گھر ہے اسمبلی نہیں جو ہر کوئی اپنی ہی ہانکے جاتا ہے، دوسرے کی سنتا ہی نہیں۔ پھر جب پڑوس میں ساس بہو کے مابین جوتی چلی، تب آپ نے کہا ہے کہ عوام میں پارلیمان کا کلچر فروغ پا رہا ہے۔''

شہباز میاں نے خاموشی میں عافیت جانی اور کن ٹوپ کان پر چڑھا کام کی طرف متوجہ ہو گئے۔

یہ حقیقت اپنی جگہ کہ شہباز بیگم نے خود کو خوش مزاج، مصلحت اندیش اور قابل تعریف بیوی ثابت کیا تھا۔ وہ اچھی ماں اور اہلِ خانہ کی قدرشناس دوست بھی تھی۔ شہباز

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

میاں کو اپنے گھر کے سکھ نے ہی اس قابل کیا تھا کہ یکسوئی سے اپنا کام کر سکیں۔ ان کی زندگی میں جو تکلیف دہ ناگواری کبھی نہ آئی تھی، اس میں دونوں کا یکساں ہاتھ تھا۔

زندگی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی کہ ایک نیا ڈراما سیریل شروع ہو گیا۔ موضوع شوہر کا ہرجائی ہونا تھا۔ اس کے آغاز سے پہلے جھلکیوں پر آتے جاتے نظر پڑنے سے ہی شہباز میاں کا ماتھا ٹھنک گیا۔ مگر معاملہ کتنا سنگین ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ تو بعد میں ہوا۔ ڈراما شروع ہوا اور دو ہی قسطوں میں شہناز بیگم بجھ سی گئیں۔ آنکھیں اندیشوں سے پر رہنے لگیں۔ شوہر باہر جانے کے لیے تیار ہوتے، تو انھیں چونک چونک کر دیکھتیں۔ خوشبو لگاتے، تو ان پہ شاکی نظریں ڈالتیں۔ یہاں تک کہ وہ چھپ کر پرفیوم لگانے لگے۔

"آپ روز شیو بنانے لگے ہیں؟" یہ سوال جب بار بار ہوا، تو وہ باہر سے شیو بنوانے لگے۔ دوست احباب کے لطیف پیغامات ختم کر دیتے کہ اکثر بہانے بہانے سے بیگم موبائل اٹھا لیتیں۔ یوں چار اقساط ہی میں شہباز میاں کا صبر جواب دے گیا اور انھوں نے بیگم سے بات کرنے کی ٹھانی۔ ایک شام وہ آ کر بیگم کے پاس جا بیٹھے اور انھیں ان کے بچپن کے نام سے پکارا "نازو۔"

انھوں نے شاکی نظروں سے انھیں دیکھا، مگر شہباز میاں نے ہمت کی اور کہا "دیکھو جانی! ڈراما زندگی سے مستعار لیا جاتا ہے، مگر وہ زندگی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تم سے اپنے بچوں اور گھر سے بے حد مطمئن ہوں۔ میں تم سب سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ میری پرسکون اور ٹھہراؤ رکھنے والی طبیعت ہے، چناں چہ مجھے کسی ایڈونچر کا شوق نہیں۔ میری زندگی کسی غیر عورت سے چکر چلانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے فضل سے درجنوں ہم مشرب و ہم مزاج دوست اور تم جیسی مزاج آشنا ساتھی...... اور مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

شہناز بیگم نے ملی جلی کیفیت میں انھیں دیکھا، تو وہ مسکرا کر بولے "اور دیکھو تو بھلا، میں ڈرامے والے ہیرو کی طرح ہینڈسم بھی نہیں کہ کوئی خاتون مجھے گھاس ڈالے۔"

یہ سن کر بیگم کے رخ زیبا پر بھی مسکراہٹ آ گئی اور شہباز میاں نے سکھ کا سانس لیا۔ معاملات پھر درست سمت چلنے لگے۔

شہباز میاں سینئر صحافیوں میں شامل ہو چکے تھے، چناں چہ ان کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ ایک دن وہ بیورو چیف بن گئے۔ شروع کے دنوں میں وہ گھر بالکل وقت نہ دے پاتے لہٰذا بیگم کی حالیہ ذہنی کیفیت سے قریباً بے خبر تھے۔ وہ اکثر گھر دیر سے آتے۔ اگر گھر میں ہوتے بھی، تو کوڑے کوڑے کاغذ، قلم اور روشنائی میں ڈوبے رہتے۔

حسب سابق بیگم اور بچوں نے انھیں ان کے حال پر چھوڑے رکھا۔ صحافیوں اور اہل قلم کے لیے یہ بڑی نعمت ہے کہ جب وہ چاہیں، انھیں تنہا چھوڑ دیا جائے۔ وہ اس کے لیے بیوی بچوں کے شکر گزار تھے۔ ایک روز بڑی مصروفیت کے بعد انھیں فرصت ملی، تو بچوں کے ساتھ کھانا کھایا اور ہلکی پھلکی گپ شپ بھی لگائی۔ بچے باپ کو اپنے درمیان پا کر خوش تھے۔

بچے سونے چلے گئے، تو اپنے کمرے میں قہوہ لے آ گئے۔ شہناز چپ چاپ خاموش سی تھیں۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، مگر وہ ہنوز گم سم سے انداز میں بیٹھی رہیں۔ شہباز میاں نے چند لمحے توقف کے بعد انھیں پکارا "نازو...! کیا بات ہے؟ کچھ کھوئی کھوئی سی ہو؟"

وہ ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔ چہرے کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

تاثرات ناقابل فہم تھے۔ بولیں ''شمی! کچھ دنوں سے چند باتیں سوچ رہی ہوں۔ آپ کہتے ہیں نا کہ ہم سب ہی اپنے ماحول کے رنگ کا اثر لیتے ہیں اور میں کچھ زیادہ ہی لیتی ہوں۔''

وہ خاموش ہوئیں، تو شہباز میاں گھبرائے کہ خدا جانے طبعِ نازک پر کیا گراں گزر گیا، مگر بیگم کے تاثرات مختلف تھے۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں خود بھی محسوس کرتی ہوں مگر بات کچھ اور ہے۔ کچھ روز سے علما کے پروگرام دیکھ رہی ہوں۔ ایک عالم نے کہا کہ دنیا میں کئی براعظم ہیں، ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا اپنا طرزِ زندگی اور رنگ روپ ہے۔ مگر ایمان والے کسی بھی علاقے، قوم اور کسی زمانے میں پائے جائیں، ان سب کا صرف ایک ہی رنگ ہے۔ وہ ہے صبغۃ اللہ۔ اللہ کا رنگ، سب سے گہرا، انمٹ اور ممتاز!

''جب تک اللہ کی بندگی کا دعویٰ کرنے والا بندہ خود کو اس میں رنگ نہ لے بلکہ ڈبو نہ لے، دنیا و آخرت کی فلاح نہیں پا سکتا۔ میں اس کے بعد سوچتی رہی شمی کہ یہ کیا بات ہے؟ ہم نماز پڑھتے اور روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ خیرات دینے کی فکر بھی رہتی ہے۔ حج کی تمنا بھی ہے، مگر یہ سب کارِ خیر ہمیں اللہ کے رنگ میں رنگے ربانی کیوں نہیں بناتے؟

''شاید اس لیے کہ ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ پہلے ایمان دل میں راسخ ہوگا، اللہ کا تعارف ہمارے دل میں پیوست ہوگا تو وہ ہماری سوچ، ہمارے دھیان اور پل پل کی یاد میں بسے گا۔ پھر عبادات بھی خالص ہو جائیں گی۔ ابھی تو ہماری عبادت محض عادت ہے۔ لگے بندھے سجدے اور رکوع! ہم تو یہ ادراک بھی نہیں رکھتے کہ وضو کر کے قیام کرتے ہوئے ہم اس رب کے سامنے ہوتے ہیں جو ہمارا خالق، مالک اور پالنے والا ہے۔

نماز اپنے رب سے ہماری گفتگو ہے۔ اس نے ہمیں اپنا یہ پیغام بھیجا تاکہ ہم اسے پڑھیں، سمجھیں اور ہمارا اس سے تعلق استوار ہو۔ مگر ہم نے بے سوچے سمجھے اسے کبھی کبھار پڑھنے اور مرنے والوں کو بخشنے کا وسیلہ بنا دیا۔ ہے نا عجیب بات!'' وہ چہرے پر سوز لیے کہہ رہی تھیں۔ شہباز میاں ساکن بیٹھے سن رہے تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ خود کبھی احساس کے اس مقام تک نہ آئے تھے، وہ کیا کہتے؟

گہرا سانس لے کر شہناز بیگم پھر بولیں ''شمی! دیکھیے عالم صاحب کیا کہتے ہیں؟ اللہ نے خود فرما دیا کہ جو میرا بندہ ہونے کا دعویٰ کرے، اسے سب سے زیادہ محبت مجھ سے ہوگی۔ میں ہر پل اس کے دھیان کا حصہ ہوں گا۔ وہ مجھے ہر پل یاد کرے اور رکھے گا، وہ تنہائی میں میری سوچ سے لذت پائے گا۔ محفل میں بات بات پر میرا تذکرہ چھیڑے گا، کوئی سنے نہ سنے۔ اس کا جینا مرنا، اس کی خوشی، غم اور رضا میرے لیے ہوگی۔

''میں نے غور کیا..... بہت غور کیا کہ میری فہرست میں، میرے محبوبوں میں اللہ کہاں ہے؟ مجھے اپنے والدین سے محبت ہے پھر آپ اور بچوں سے محبت ہے، مگر یہ محبتیں مجھے کسی ہستی نے دیں، میں اس کے احساس تک سے بیگانہ ہوں۔ نہیں شمی نہیں، ہمیں اپنی ترجیحات کا پھر سے جائزہ لینا ہوگا۔ ہمیں محبتوں کی فہرست پھر مرتب کرنی ہو گی۔ ہمیں اللہ کو سمجھنا، اس کا فہم حاصل کرنا ہے۔ اسی کے پیغام کے ذریعے اس تک پہنچنا ہے۔ مجھے آپ کو، بچوں اور پھر باقی پیاروں کو سب سے پہلے یہ کام کرنا ہے۔''

وہ آنکھوں میں نمی لیے کہہ رہی تھیں۔ شہباز بھی اسی رنگ کے اثر میں آتے جا رہے تھے جو اللہ کا رنگ ہے، صاف شفاف اور میٹھا میٹھا سا۔

●●●

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نرم و نازک کاندھوں پر پڑا

بستہ

گھر کی چار دیواری میں مقید ایک معصوم بچے کا قصہ الم، اس نے اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کا عجب راستہ ڈھونڈ لیا

نیلوفر اقبال

بلّو اسکول سے نکلا، تو سخت گرمی تھی۔ سورج لگتا تھا جیسے عین سڑک کے اوپر اتر آیا ہے۔ گرمی کی چھٹیاں ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے...... اوپر سے گھر جانے والی سڑک بھی سیدھی اور سپاٹ تھی۔ پورے راستے میں کوئی درخت نہ سایہ! بلو اسی طرف جانے والی لڑکوں کی ایک ٹولی کے ساتھ گھر جایا کرتا تھا۔ آج بھی انہی کے ساتھ تھا۔ کئی بار اس نے اپنی امی سے سائیکل کی فرمائش کی تھی۔ مگر سڑک پر ٹریفک کا جو برا حال تھا، اسے دیکھتے ہوئے تیسری جماعت کے بچے کو کون سائیکل پر اسکول جانے دیتا؟

ہر بار جواب ملتا کہ پانچویں جماعت میں پہنچو گے، تو سائیکل ملے گی۔ ویسے بلو کو سائیکل چلانی اچھی طرح آتی تھی۔ بازار میں اس کے سائز کی دو پہیوں والی سائیکلیں بھی موجود تھیں۔ مگر اس کی منتاؤں، ہر بار یہی جواب ملتا کہ پانچویں سے پہلے سائیکل نہیں ملے گی۔

آج بلو دوسرے بچوں کے ساتھ پیدل مارچ کرتا، تپتی ہوئی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ اوپر سے کم بخت بستہ کتنا بھاری تھا۔ ایک تو بیگ کا اپنا وزن، اوپر سے تین چار کتابیں اور کاپیاں۔ مگر اس بچارے کی مصیبت کون سمجھتا؟ کبھی وہ کہتا، تو جواب ملتا کہ وہ کوئی اکیلا تو نہیں، سارے بچے اپنا بستہ خود اٹھا کر لاتے ہیں۔ اوپر سے پڑھائی کا شوق نہ ہونے کا الزام لگ جاتا۔

امی ماتھے پر ہاتھ مار کر کہتیں کہ پتا نہیں وہ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کون خوش قسمت لوگ ہیں جن کے بچے خوشی خوشی اسکول جاتے اور فرسٹ بھی آتے ہیں ... بے چارے بچے، کوئی ان کی مصیبت نہیں سمجھتا۔ امی کی بچی کو خود یہ بستہ اٹھا کر گھر لانا پڑے، تو پتا چلے! ہر وقت یہی کہتی رہتی ہیں، اگلے سال اہوکی ترقی ہوگی، تو گاڑی مل جائے گی۔ بس یہی کہتی رہتی ہیں۔

کئی دفعہ سڑک پر چلتے ہوئے جب بلو نالے کے پل پر پہنچتا، تو بستہ کو اپنے پسندیدہ بڑے سے پتھر پر رکھ کچھ دیر رک جاتا۔ یہ پتھر اوپر سے کچھ چپٹا تھا۔ بستے کے ساتھ اس کو بیٹھنے کی جگہ بھی مل جاتی۔ وہ نیچے نالے میں نہاتے ننگ دھڑنگ بچوں کو دیکھتا۔ ان میں سے کئی تو بالکل ننگے ہوتے۔ کچھ جو ذرا بڑے تھے، انھوں نے میلا سا چیتھڑا باندھ رکھا ہوتا۔ یا طلابی سی چڈی پہنی ہوتی۔

کبھی کبھی تو بلو کا دل بھی مچل اٹھتا کہ یونیفارم سمیت ٹھنڈے ٹھار پانی میں چھلانگ لگا دے۔ نالے کے ساتھ اگی گھاس میں پھدکتے مینڈک اس کی توجہ کھینچ لیتے۔ اتنے میں آگے نکل جانے والے لڑکوں کی ٹولی میں سے کوئی اسے پکارتا۔ وہ بستہ اٹھا کر بھاگتا ہوا پھر ان میں جا شامل ہوتا۔

گھر پہنچ کر ہو لتے سے بیٹھ جاتے ہی ماں کی ممتا کا شکار ہو جاتا۔ ماں یونیفارم اور جوتے اتروانے کے درپے ہو جاتی۔ اتنی گرمی اور اسکول سے الم غلم کھانے کے بعد بھوک کیا خاک لگے گی۔ مگر زبردستی منہ میں نوالے ٹھونستی۔ نہ کھانے پر ڈانٹ پڑتی۔ ضد کہ پلیٹ ختم کرو۔

کھانے کے بعد بلو کی جائز خواہش ہوتی کہ باہر جھومتے ہوئے درختوں کے نیچے جا کر کھیلے۔ مگر امی کو نجانے کیوں ضد تھی کہ اب اسے کچھ دیر سونا چاہیے۔ ''فریش'' کیسے ہو گے، ہوم ورک کیسے کرو گے؟'' سمجھتی ہی نہیں تھیں کہ جب درختوں کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ہوں، رسی کی پینگ پڑی ہوئی ہو، پٹی پٹی گھاس کی خوشبو ہو، نور خاں اور کھاتوں کے ہنسنے کی آوازیں ہوں، تو دل سونے کو کیسے چاہے گا؟''

اسے کھڑکی میں سے دور کسی ٹہنی پر نور خاں بندر کی طرح جھولتا دکھائی دیتا۔ وہ جانے کی ضد کرتا، تو امی تھپڑ لہراتی۔ ''بند کرو آنکھیں ... فوراً بند کرو۔ پھر مولوی صاحب آئیں گے، تو تمھیں نیند آنے لگے گی۔''

وہ انھوں سے بھی چڑتا تھا۔ شروع شروع میں جب مولوی صاحب نے آنا شروع کیا، تو ادھر وہ سامنے والے دروازے سے داخل ہوتے، ادھر پچھلے دروازے سے بلو ہوا ہو جاتا۔ مگر آخر کب تک، ڈھونڈ ڈھانڈ کر زبردستی لایا جاتا۔ بچارا زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ یہی تو اس کے کھیلنے کا وقت ہوتا تھا۔ مگر ادھر چار بجتے، ادھر مولوی صاحب نازل۔ وہ روح افزا کا گلاس پینے اور بلو کو سبق دینے کے بعد اونگھنے لگتے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گھر سے نکلتے اور امی بستہ اٹھائے چلی آتیں اور نہایت میٹھے لہجے میں کہتی ''لو بیٹا، ہوم ورک کر لو۔''

''اوں، ابھی نہیں، ابھی میں باہر جا کر کھیلوں گا۔''

''کھیلو گے تو ہوم ورک کس وقت کرو گے؟'' ان کا لہجہ بدلنے لگتا۔

''رات کو کر لوں گا۔''

''رات کو تم ٹی وی دیکھنے لگتے ہو۔ پھر تمھیں نیند آنے لگتی ہے۔ آخر پڑھائی کب ہوگی؟''

''بس ابھی نہیں، میں جا رہا ہوں نور خاں کے ساتھ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کرکٹ کھیلے۔"

"خبردار جو نام بھی لیا اس کا! وہ تو آوارہ بچہ ہے۔ بڑے ہو کر باپ کی طرح مالی بنے گا۔ میرا بیٹا، تو اسکول جاتا ہے۔ انجینئر بنے گا، ڈاکٹر بنے گا...... چلو شاباش۔" وہ بلو کو کھینچتے ہوئے پڑھائی کے میز کی طرف لے جاتیں۔ پھر ہوم ورک کی ڈائری کھولتیں: ریاضی دس سوال، انگریزی ایک پوری ایکسرسائز، اردو کے جملے بنایئے......

بلو منہ بسورتے ہوئے کاپیاں اور پنسل باکس نکالتا ہے...... ایک سوال...... دوسرا سوال...... تیسرا سوال

"شش...... ش......" کھڑکی کے باہر سے آواز آتی۔ لال کپڑے کی جھلک سی دکھائی دیتی۔ پھر خاکستری لباس میں پھدکتا سا ہیولا نظر آتا۔

بلو اچک کر جھانکتا، کھڑکی کے نیچے کھاتوں (نور خاں کی بہن جس کا نام خاتون ہوگا) کھڑی ہے۔ اس کے ہاتھ میں کیا ہے...... املی کی پڑیا، اوپر لال مرچیں...... اف، بلو کے منہ میں پانی آ جاتا۔ نور خاں جیب سے کانچ کے بنٹے نکال کر دکھاتا۔ باہر درخت اور پودے ہولے ہولے ہوا میں جھول رہے ہیں۔

"باہر آ جا...... باہر آ جا" کھاتوں کہتی۔ "ابا گاؤں سے بیر لایا ہے، یہ دیکھ۔" اس کی ہتھیلی پر بیر ہیں، سرخ نارنجی، کھٹے میٹھے۔

املی اور بیر کی کشش سے کھنچتا ہوا، بلو دروازے کی طرف بڑھتا۔ مگر ماں کی عقابی نظروں سے بچ نہیں سکتا۔

"بلو آؤ واپس، فوراً۔"

"ابھی آتا ہوں۔"

"واپس آؤ فوراً، ہوم ورک دکھاؤ لا کر۔"

"آتا ہوں نا۔" وہ بدستور دروازے کی طرف بڑھتا۔

ماں کو کھڑکی کے باہر کھاتوں کا سر نظر آتا۔

"بھاگ جا بدذات۔" وہ دہاڑتیں۔

کھاتوں بساط بھر رفتار سے بھاگ جاتی۔

"دکھاؤ کتنا کام کیا ہے۔" کاپی اٹھا کر دیکھتی ہیں۔ "آدھ گھنٹے سے لگے ہوئے ہو، صرف تین سوال کیے ہیں۔ ایک تو میں ان آوارہ بچوں سے تنگ ہوں۔ پڑھائی میں دھیان ہی نہیں ہوتا تمھارا، ان کی وجہ سے۔ کتنی دفعہ کہا ہے کوارٹر خالی کروا لیں۔ بچہ برباد ہو رہا ہے۔ خود دفتر سے آ کر سو جاتے ہیں۔ دماغ میرا خراب ہوتا ہے۔ بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے اس بچے کی وجہ سے...... کام ختم کرو فوراً، خبردار جو اب سر اٹھایا...... ریاضی کا پرچہ بھی ہے کل......" بکتی جھکتی چلی جاتی ہیں۔

بلو کے دل میں غصے کا ناگ پھن اٹھاتا۔ وہ غضب بھری نظروں سے بستے کو دیکھتا۔ بے دلی سے کتابیں میز پر ڈالتا۔ ہر وقت پڑھتے رہو، پڑھتے رہو، ہر وقت...... صبح اتنی مزیدار نیند آ رہی ہوتی ہے۔ اٹھا دیتی ہیں کہ تیار ہو، اسکول جاؤ۔ صبح تو پاپا چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر بستہ اٹھا کر لاؤ...... ایک دن بھی چھٹی نہیں کرنے دیتیں۔ نور خاں اور کھاتوں کتنے مزے سے کھیلتے رہتے ہیں۔ نہ اسکول نہ ہوم ورک نہ بستہ نہ کچھ...... نور خاں جب دیکھو درخت پر بیٹھا رہتا ہے...... کتنے کھیل آتے ہیں اسے...... پکڑم پکڑائی، گرم، بدروشنی......

جب بارش آئے، مجھے امی اندر بند کر دیتی ہیں۔ نور خاں کتنی دوڑیں لگاتا ہے بارش میں۔ وہ اور کھاتوں کتنا نہاتے ہیں، کشتیاں چلاتے ہیں...... کالیاں اناں کالے روڑ۔ مینہ وسا دے زوروں زور...... چیچو چیچ گنڈیریاں۔ نور خاں اتنی بڑی کالی سائیکل قینچی مار کر

www.pdfbooksfree.pk

چلاتا ہے۔ وہ کھڑکی سے نور خان کو دوسرے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا۔ کبھی کبھی وہ اسے کھڑکی سے اپنی جیب سے کچھ نکال کر دکھاتا۔ ''دیکھ اوئے ڈڈو۔'' نالے سے پکڑ کر لایا ہوتا۔

ایک دن اس نے کتاب سے نور خاں کو سکھانے کی کوشش کی تھی: ایف۔فروگ (Frog)۔ نور خاں نے کہا تھا ''اے کوئی فراگ آ، اے تے ڈڈو آ......'' بس کل کچھ بھی ہو جائے، اسکول نہیں جاؤں گا۔ ریاضی کے پرچے کی تیاری بھی نہیں۔ میڈم چھوڑیں گی نہیں۔ امی نہ سر درد کا سنتی ہیں نہ پیٹ درد کا۔ ایک دفعہ گرم پانی میں تھرمامیٹر ڈال کر بخار کی چھٹی ملی تھی...... دوسری دفعہ پارہ ۱۰۸ پر چلا گیا اور پکڑے گئے...... بس کل کچھ بھی ہو جائے، چھٹی کروں گا...... کاش یہ بستہ ہی کہیں غائب ہو جائے!

شام کو جب سب لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے، بلو غور سے ادھر ادھر دیکھ کر موقع تلاش رہا تھا۔ ابو سیر کرنے نکل گئے۔ امی باورچی خانے میں کچھ بنانے کے لیے چلی گئیں۔ برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن بلو کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر جیسے ہی مسالہ بھوننے کی تیز خوشبو اور پتیلی میں چمچ چلنے کی آواز آئی، بلو سمجھ گیا کہ یہی وقت ہے۔ اس نے پیچھے سے بستہ اٹھایا، بغیر آواز پیدا کیے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ گھر کے ساتھ خالی پلاٹ تھا۔ لوگوں نے اسے کوڑا خانہ بنا دیا۔

شام کے دھندلکے بلکہ اندھیرے میں دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ اونچے نیچے پتھروں پر پیر ٹیڑھے میڑھے پڑ رہے تھے۔ پھر یہ ڈر رہا کہ کوئی دیکھ نہ لے...... آخر ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آ گیا جو بستے کی قبر بنانے کے لیے بالکل ٹھیک تھا۔ بلو نے بستے کو گڑھے میں ڈالا، اوپر سے کچھ پتھر اور پتے وغیرہ ڈال دیے اور ہاتھ میں جھاڑتا یوں کھڑا ہو گیا

''یہ قیامت سی کیوں اے خدا آ گئی''

(سانحہ پشاور کی یاد میں)

آسماں پہ یہ کالی گھٹا چھا گئی
گہرے بادل اٹھے بستی دھندلا گئی
ہر طرف کیسی یہ تیرگی چھا گئی
ملک کو میرے کس کی نظر کھا گئی
اے خدا کون انگارے سلگا گیا
کس کی سازش یہاں آگ دہکا گئی
خوں بھری صبح ہی سے اک آندھی چلی
جو کہ اس شہر کو خوں میں نہلا گئی
کتنی ماؤں کی گودیں اجاڑی گئیں
کتنی مانگوں کی سیندور دھندلا گئی
کون دشمن ہمارا ہوا اے خدا
کس کی سفاکی یوں گولی برسا گئی
غور سے دیکھو کتنا حسیں ہے جواں
کوئی گولی جسے خوں میں نہلا گئی
ماں نے دیکھا جو بیٹے کو یوں غرق خوں
ماں کا دل پھٹ گیا آنکھ پتھرا گئی
کیا تمھاری کوئی ماں نہیں ہے سنو
کون ماں ایسی سفاکی سکھلا گئی
بہنیں روتی ہیں بھائی ہمارا گیا
اے خدا یہ کہاں سے قضا آ گئی
کیا ہوا کیوں ہوا یہ بتا دے کوئی
ملک میں یہ تباہی سی کیوں آ گئی
صور پھونکا نہ تھا آسماں گر گیا
یہ قیامت سی کیوں اے خدا آ گئی
اے خدا بخش دے ہم گناہ گاروں کو
لب پہ سب کے ثناء یہ دعا آ گئی

(ڈاکٹر ثناء قریشی)

www.pdfbooksfree.pk

جیسے کسی زہریلے دشمن کو دفن کر کے اٹھا ہو۔

گھر میں داخل ہوتے ہوئے پہلے اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا کہ کوئی اسے اندر آتا دیکھ تو نہیں رہا؟ پھر چپکے سے اندر داخل ہو گیا۔ اسے جاتے یا آتے ہوئے کسی نہ دیکھا۔ وہ خود کو کسی جاسوسی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔ اسے ہنسی آ رہی تھی۔ کتنا مزا آئے گا صبح جب بستہ نہیں ہو گا! کیسے بھیجیں گے اسکول؟ کل کچھ بھی ہو، اسکول نہیں جاؤں گا۔ اس کا دل غبارے کی طرح ہلکا ہو گیا۔ اس نے پرچے کی تیاری کرنے کے بجائے عمر و عیار والی کہانی کی کتاب نکالی اور مزے لے لے کر پڑھتا رہا۔ کئی جگہ اسے ہنسی آئی۔ آخر امیر حمزہ اور دیو ہائے آہن کی لڑائی کے دوران کہیں وہ میٹھی نیند سو گیا۔

صبح ہوئی تو ماں نے روزانہ کی طرح یونیفارم اور جوتے بلو کے بستر کے پاس رکھے۔ پھر انھوں نے بستے میں رکھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"بستہ کہاں پڑا ہے بیٹا؟" انھوں نے بلو کو جگایا۔

"میں نے رکھا تھا میز پر" بلو نے نیند بھری آواز میں کہا۔ حالانکہ آج وہ خلاف معمول صبح ہی بیدار ہو گیا تھا۔

"اچھا اب اٹھنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اٹھو تیار ہو جاؤ۔ میں بستہ لاتی ہوں۔" ماں نے کمرے میں بستہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ بلو کن انکھیوں سے ماں کو میزوں کے نیچے، الماریوں کے اندر، پردوں کے پیچھے بستہ تلاش کرتے دیکھتا رہا۔

"بستہ کہاں گیا بلو کا؟"

"کہاں گیا بستہ!"

"آخر گیا کہاں؟" دوسرے کمروں سے آواز آتی رہی۔

"تم نے تو نہیں دیکھا؟"

"ارے وہ کمبخت نور خان وغیرہ تو نہیں اٹھا کر لے گئے۔ جاؤ ان کے کوارٹر میں جا کر دیکھو۔" مگر یہ بستہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ بلو کی نظر گھڑی پر تھی۔ بس کسی طرح اسکول کا وقت گزر جائے، آٹھ بج جائیں کسی طرح، تو سب ٹھیک ہے۔

ابو ناشتے کے لیے آئے، تو معاملہ ان کے سامنے رکھا گیا۔

"بستہ کہاں جائے گا، اسی نے چھپا دیا ہو گا کہیں۔" انھوں نے نہایت اطمینان سے کہا۔

اس طرف تو کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا..... امی چیل کی طرح بلو پر جھپٹیں "نکالو جلدی بستہ۔"

"میں نے تھوڑی چھپایا ہے۔"

"میں کہتی ہوں نکالو فوراً"

"میں نے نہیں چھپایا۔"

"نکالتے ہو یا تھپڑ ماروں، وقت ہو رہا ہے اسکول کا، جلدی کرو۔"

"مجھے نہیں پتا۔" بلو نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ مگر جرم اس کے چہرے اور آنکھوں پر صاف لکھا ہوا تھا۔ کہاں آٹھ سالہ بچہ کہاں زمانہ ساز خرانٹ ماں! ماں نے ایک زور کا تھپڑ گال پر لگایا۔ "کہاں ہے بستہ؟" بلو رونے لگا۔

"نکالتے ہو یا نکالوں چمٹا گرم کر کے" ماں نے چمٹا لہرایا۔

آخر بلو کی مدافعت جواب دے ہی گئی۔ وہ ماں کو لیے خالی پلاٹ کی طرف چل پڑا۔ گڑھے کے پاس پہنچا اور آہستہ آہستہ پتے اور پتھر ہٹا کر اس طرح بستہ نکالنے لگا جیسے مرا ہوا سانپ نکال رہا ہو۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

صدر جناب احمد بلال محبوب' جناب الطاف حسن قریشی کو دیکھ کر تیزی سے ہماری جانب لپکے۔ وہ ہمیں لیے تقریب کے مہمان بھارت سے آئے مسلمان الیکشن کمشنر محترم شہاب الدین قریشی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اُردو ڈائجسٹ اور الطاف صاحب کی پاکستان صحافت

صاف شفاف انتخابات کرا کے

”بھارت میں ہم نے جمہوریت کو پروان چڑھایا“

بھارتی الیکشن کمیشن کے پہلے مسلمان چیف کمشنر شہاب الدین یعقوب قریشی کی خیال افروز گفتگو

ملاقات' تاثرات: طیب اعجاز قریشی

پیشکش: سجاد قادر

شام ساڑھے سات بجے آواری ہوٹل لاہور کے ہال میں داخل ہوئے تو دروازے پر پلڈاٹ کی میزبان خواتین نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ پلڈاٹ کے روح رواں اور میں خدمات کا تعارف کرایا۔ ہم نے انھیں بتایا کہ بھارت کے مختلف شہروں میں اردو ڈائجسٹ کے قارئین کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے جس سے اُردو زبان کی اہمیت اور پسندیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

جناب شہاب الدین قریشی نے بھی اس امر کی تصدیق کی اور اردو کی مختلف ویب سائٹس اور بلاگ کی مقبولیت کا تذکرہ کیا۔

پلڈاٹ کی آج کی تقریب کا مقصد بھارتی الیکشن کمیشن کی کامیابی کی کہانی سابق الیکشن کمشنر کی زبانی سننا تھا۔ تقریب میں ایڈیٹروں، کالم نگاروں، عدلیہ سے وابستہ شخصیات اور پاکستان کے الیکشن کمیشن کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

محترم احمد بلال محبوب نے بتایا کہ جناب شہاب الدین یعقوب کو بھارتی الیکشن کمیشن کے پہلے مسلمان چیف الیکشن کمشنر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ ۳۰ر جولائی ۲۰۱۰ء تا ۱۰ر جون ۲۰۱۲ء سے اس عہدے پر فائز رہے۔

آپ ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے گویا آزادی پاکستان سے صرف دو ماہ پہلے ۱۹۴۷ء میں انڈین سول سروس کا حصہ بنے۔ دوران ملازمت تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے کمیونیکیشنز اینڈ سوشل مارکیٹنگ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر شہاب الدین مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ جب چیف الیکشن کمشنر بنائے گئے تو وزارت کھیل و امور نوجوان کے سیکرٹری تھے۔ جب ۶۵ سال کے ہوئے تو بمطابق قانون اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ آپ انتخابات، جمہوریت اور سیاست کے موضوعات پر کتب بھی تحریر کر چکے۔

پاکستان آمد کے بعد سابق بھارتی چیف الیکشن کمشنر مختلف سیمیناروں اور تقاریب میں شریک ہوئے۔ ان تقاریب کا موضوع انتخابی عمل اور جمہوریت تھا۔ ایک ایسی ہی تقریب ''پلڈاٹ'' (Pakistan Institute of legisative Development and Transparency) کے زیر اہتمام لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔

اس تعارف کے بعد جناب احمد بلال محبوب نے مہمان شخصیت شہاب الدین قریشی کو اپنے تجربات اور مشاہدات سنانے کی دعوت دی۔ اس موقع پر جناب شہاب الدین قریشی نے بھارتی الیکشن کمیشن کے طریق کار اور ذمے داریوں پر سیر حاصل گفتگو فرمائی۔ ان کی معلومات افزا باتوں سے یہ اہم نکتہ نمایاں ہوا کہ بھارت میں اب دھاندلی سے پاک انتخابات ہونے لگے ہیں اور اسی باعث وہاں بتدریج جمہوریت برگ و بار لا رہی ہے۔ اُن کی مدلل گفتگو اُنہی کی زبانی سنیے:

☆☆

بھارت میں الیکشن کمیشن شروع سے سرگرم عمل رہا ہے۔ اسی کی کوششوں سے بھارتی خواتین کو ۱۹۵۰ء ہی میں ووٹ دینے کا حق مل گیا۔ امریکا نے خواتین کو یہ حق دیتے ہوئے ۱۴۴ برس لگائے تھے۔ پھر یہ دیکھیے کہ امریکا میں آج تک کوئی خاتون حکمران نہیں بن پائی جبکہ بھارت میں اندرا گاندھی نے پوری طاقت سے حکمرانی کی ہے۔ امریکی خوامخواہ خود کو جمہوریت کا چیمپئن کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی جمہوریت پورے رنگ و روپ میں پھل پھول رہی ہے۔

بھارتی الیکشن کمیشن اب تک پانچ سو کے قریب وفاقی اور ریاستی انتخابات کامیابی سے منعقد کرا چکا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارت میں بسلسلہ الیکشن امریکا و برطانیہ سے کہیں زیادہ مسائل موجود ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں کئی اقلیتی اقوام بستی ہیں۔ ہمیں ان سب کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ الیکشن کمیشن نے انھیں تحفظ دینے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کی خاطر سیکڑوں قوانین بنا رکھے ہیں۔

مثال کے طور پر الیکشن میں کوئی بھی مذہب کے نام پر ووٹ نہیں لے سکتا۔ اسی طرح قومیتی بنیاد پر ووٹ لینا بھی جرم ہے۔ کمیشن نے ہر قسم کا فراڈ روکنے کے لیے قانون تشکیل دیے ہیں۔ اور انھیں مسلسل اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے۔

بھارت میں ۴۹ فیصد خواتین سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ہم نے ان کی سہولت کے لیے پولنگ اسٹیشنوں میں جائے حاجت بنوائیں اور دیگر سہولیات مہیا کیں۔ پہلے بعض لوگ ثقافت اور مذہبی اقدار کی وجہ سے خواتین کی تصاویر لینے سے گریزاں تھے لیکن ہم نے انھیں مطمئن کیا۔ مسلم خواتین کی تصاویر بہت چھوٹے سائز کی ہوتی ہیں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جب انھیں سیاسی جماعتوں کو دی جائیں تو ان میں تصاویر شامل نہ ہوں تاکہ ان کا غلط استعمال نہ ہو۔ یوں مسلمانوں کو ہر طریقے سے اعتماد میں لیا گیا۔

اسی طرح معذور ووٹروں کے لیے خاص اہتمام کیا۔ پولنگ اسٹیشنوں میں ان کے لیے ریمپ رکھے جاتے ہیں۔ معذوروں کے لیے خصوصی ۲۰ لاکھ ووٹنگ مشینیں بنوائی گئی ہیں۔

بھارت وسیع و عریض ملک ہے لہٰذا دور دراز کے مقامات پر بھی پولنگ بوتھ بناتے ہیں تاکہ ہر بھارتی اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکے۔ ایک بار گجرات کے دور دراز علاقے میں صرف ایک ووٹر کے لیے شام تک بوتھ کھلا رکھا گیا۔ اسے دوگھنٹے دور سے آنا تھا۔ انتخابی عمل میں ایک ووٹ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۹ء میں صرف ایک ووٹ کی کمی کے باعث واجپائی حکومت ختم ہوگئی تھی۔

بھارتی الیکشن کمیشن خودمختار ادارہ ہے۔ ہم انتخابات پُرامن طور پر کرانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ان لوگوں پر نظر رکھی جاتی ہے جو کسی بھی طرح انتخابی نتیجے پر اثرانداز ہو سکیں۔ مثلاً ۲۰۰۹ء میں الیکشن کمیشن کو محسوس ہوا کہ ریاست اترپردیش کا چیف سیکرٹری، سیکرٹری داخلہ اور آئی جی پولیس نتائج پر اثرانداز ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کمیشن کے حکم پر ان تینوں کا تبادلہ کر دیا گیا۔

پہلے یہ ہوتا تھا کہ سیاست داں غنڈوں کی مدد سے انتخابی مہم چلاتے اور ووٹروں پر دھونس جماتے تھے۔ کمیشن نے حل یہ نکالا کہ ہر ضلع میں اس کے نمائندے ایس پی کے سر پر پہنچ جاتے۔ پھر پولیس افسروں پر زور دیا جاتا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر تمام غنڈوں کو پکڑ لیں جو کسی نہ کسی طور سیاسی جماعتوں سے منسلک تھے۔ پولیس کو کمیشن کے احکامات تسلیم کرنا پڑتے۔ یوں کمیشن کی کوششوں سے گلی کے غنڈے الیکشن کے عمل سے الگ ہو گئے۔

بھارتی آئین سازوں نے یہ کام بہت اچھا کیا کہ ریاستوں میں بھی انتخابات کرانے کا فریضہ الیکشن کمیشن کو سونپ دیا۔ اگر ریاستوں کو ریاستی الیکشن کرانے کا اختیار ہوتا تو صاف شفاف انتخابات کرانا مشکل ہو جاتا۔ حکومت وقت اپنے آدمیوں کو ریاستی الیکشن کمیشن میں بھرتی اور وہ اسے باآسانی انتخاب جتوا دیتے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

الیکشن صاف و شفاف کرانے کی خاطر کمیشن نے ایک کام یہ کیا کہ ہر معین علاقے میں وہیں کی ایک معزز شخصیت مثلاً استاد، ڈاکٹر، پٹواری وغیرہ کو اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ اب جس ووٹر کو بھی الیکشن کے سلسلے میں جو معلومات لینی ہے، وہ اسی سے حاصل کرے۔ وہ نمائندے کو اپنے مسائل اور شکایات سے بھی آگاہ کر سکتا ہے۔ بھارت میں الیکشن کمیشن کے علاوہ کوئی اور سرکاری محکمہ آپ کے دروازے تک نہیں پہنچتا۔ صرف اسی کے نمائندے گھر گھر لوگوں تک پہنچتے ہیں۔

انتخابات کرانے میں بیوروکریسی بھی کمیشن کی بھرپور مدد کرتی ہے۔ حالیہ انتخابات میں ایک کروڑ دس لاکھ سے زائد ڈپٹی کمشنر، ایس پی، سرکاری اسکولوں کے اساتذہ وغیرہ تعینات کیے گئے۔ یہ بھی غیر جانبدار رہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ کسی سیاسی جماعت کے آنے جانے سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن کوئی سرکاری افسر گڑبڑ کرے تو الیکشن کمیشن گرفت میں لے کر اس کا کیریئر تباہ کر دیتا ہے۔

بھارتی ووٹر قطار لگائے کھڑے ہیں

پاکستان میں الیکشن کمیشن کے کرتا دھرتا عدلیہ سے لیے جاتے ہیں۔ مگر بھارتی کمیشن میں قریباً سارا نظام سرکاری افسروں کے ہاتھوں میں ہے۔ اسی لیے پورا انتخابی عمل بیوروکریسی کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ لہٰذا کمیشن کے افسر اپنی برادری کو خوب جانتے پہچانتے ہیں۔ کوئی سرکاری ملازم دوران الیکشن ہیرا پھیری کرے تو پھر ان کی نظروں سے بچ نہیں پاتا۔

مزید برآں بھارتی الیکشن کمیشن کے سبھی اعلیٰ افسر ماضی میں کسی نہ کسی الیکشن میں ڈیوٹی دیتے ہیں۔ لہٰذا انھیں انتخابات کرانے کا عملی تجربہ ہوتا ہے۔ پچھلے الیکشن میں ایک پریذائڈنگ افسر ووٹوں کے باکس ضلعی ہیڈکوارٹر دینے آیا تو پتا چلا کہ وہ مہر پولنگ اسٹیشن ہی بھول آیا ہے۔ چناں چہ بچارا بھاگا بھاگا بارہ میل واپس گیا اور مہر لے کر آیا۔ یہ پریذائڈنگ افسر گوناگوں مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہیں جبکہ عوام ان سے واقف نہیں ہو پاتے۔

ماضی میں خصوصاً بھارتی الیکشن کمیشن سے منسلک افسروں نے بہت برا وقت دیکھا ہے۔ ایک دفعہ بہار میں بحیثیت الیکشن آفیسر میری ڈیوٹی لگی۔ وہاں (مشہور سیاست دان اور سابق وزیراعلیٰ بہار) لالو پرشاد [illegible] نے پُرامن انتخاب کرانے کے سلسلے میں انھیں بریفنگ دی۔

وہ کہنے لگے "صاحب! آپ جو کچھ بھی کر لیں، شریف آدمی ووٹ دینے نہیں آئے گا۔ کیونکہ یہاں کی سیاست ایسی ہے کہ اس سے وابستہ لوگوں کو پیٹ میں گولیاں کھانی پڑتی ہیں اور منہ میں [illegible] پڑتے ہیں۔" اور یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں دوران الیکشن گولیاں چلتی اور بم پھٹتے تھے۔ قتل ہونا معمول کی بات تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

الیکشن کمیشن ہر معین علاقے میں استاد، ڈاکٹر یا کسی معزز شخصیت کو اپنا نمائندہ بناتا ہے

ماضی میں یہ بھی رواج تھا کہ ایک حلقے میں بااثر امیدوار کے غنڈے پولنگ اسٹیشن پر قبضہ کر لیتے۔ وہاں پھر خوب جعلی ووٹ ڈلوائے جاتے۔ معاملہ عدالت میں پہنچتا تو وہاں فیصلہ ہوتے کئی سال لگ جاتے۔ یہ غنڈہ گردی ختم کرنے کے لیے الیکشن کمیشن تین دن بعد نتائج سنانے لگا۔

اس اقدام کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی پولنگ اسٹیشن یا بوتھ میں فراڈ ہوا ہے تو اس کا بروقت پتا چل جائے۔ لہٰذا وہاں ہونے والا الیکشن کالعدم قرار پاتا۔ اب وہاں دوبارہ ووٹ ڈالے جاتے۔ یوں الیکشن کمیشن کے درست فیصلے سے غنڈہ گرد عناصر کی حوصلہ شکنی ہوئی اور وہ پولنگ اسٹیشنوں میں شرافت کا برتاؤ دکھانے لگے۔

کسی پولنگ اسٹیشن سے دھاندلی کی شکایت آئے تو افسران کمیشن ہر کاغذ کا معائنہ کرتے اور وہاں کی ویڈیو دیکھتے ہیں۔ اگر دھاندلی کا ذرا بھی شک ہو تو وہاں انتخاب دوبارہ کر دیا جاتا ہے۔

دھاندلی کے تمام طریقے الیکشن کمیشن کو تجربات ہی سے معلوم ہوئے۔ اسی لیے اب تین دن بعد نتائج سنائے جاتے ہیں۔ اس پر بعض اوقات میڈیا احتجاج کرتا ہے۔ لیکن نجانے اسے کیوں پریشانی ہے؟ حالانکہ میڈیا کو چٹ پٹی خبریں بنانے و سنانے کے لیے تین دن مل جاتے ہیں اور ان کی ریٹنگ بھی بڑھتی ہے۔ یہ اقدام صرف دھاندلی کا سراغ لگانے کی خاطر کیا گیا۔ ورنہ افسر پہلے دن نتائج سنا کر گھر پہنچ آرام کرنے لگیں۔ مگر اس اقدام کے بعد وہ بعد از الیکشن بھی ہفتوں اپنے کاموں میں محو رہتے ہیں۔

تجربے ہی سے کمیشن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ دوران انتخاب ریاستی پولیس جانبدار رہتی ہے۔ اسی لیے اب دوران الیکشن امن و امان برقرار رکھنے کے لیے وفاقی سیکیورٹی فورسز سے مدد لی جاتی ہے۔ چناں چہ مقامی رکن اسمبلی حتیٰ کہ ریاستی وزیراعلیٰ تک ان پر اثرانداز نہیں ہو پاتا۔

الیکشن میں دھاندلی روکنے کے لیے ہی کمیشن نے یہ قانون وضع کیا کہ اب کسی بھارتی ریاست میں اعلیٰ سرکاری افسر خصوصاً چیف سیکرٹری، سیکرٹری داخلہ، آئی جی پولیس، ڈپٹی کمشنر اور ایس پی تین سال سے زائد عرصہ تعینات نہیں رہ سکتے۔

شروع شروع میں سیاسی جماعتوں نے اس معاملے میں بھی فراڈ کیا۔ بعض وزرائے اعلیٰ نے الیکشن سے سال یا چھے ماہ قبل من پسند سرکاری افسروں کو ریاست سے باہر تعینات کرا دیا۔ مگر الیکشن سے کچھ عرصہ پہلے انھیں واپس لے آئے۔ لہٰذا اب کمیشن انتخابات سے قبل اچھی طرح دیکھتا ہے کہ ہر سرکاری افسر کہاں کہاں تعینات رہا ہے۔ اس طرح کمیشن ایسی "سرکاری ٹیم" نہیں بننے دیتا جو من پسند سیاسی جماعت کو ریاست یا ضلع میں الیکشن جتوا سکے۔

الیکشن کمیشن کی مخلصانہ کوششوں کے باعث آج بھارت میں یہ بہت طاقتور ادارہ بن چکا۔ الیکشن کے زمانے میں وہ خصوصاً بہت بااختیار اور مقتدر سرکاری ادارہ بن جاتا ہے۔ تب کوئی سیکرٹری یا ایس پی کسی منتری کو لینے ہوائی اڈے گیا تو وہ معطل ہو جائے گا۔

وجہ یہ ہے کہ الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہوتے ہی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

وزیراعلیٰ چیف منسٹر نہیں رہتا بلکہ سیاسی راہنما بن جاتا ہے۔ اب وہ سرکاری گاڑی پر جھنڈا یا لال بتی نصب نہیں کرسکتا۔ اس کی سواری نجی گاڑی بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اپنے کارنامے بھی بیان نہیں کرسکتا۔

ایک بار ایک وزیراعلیٰ الیکشن سر پر آتے ہی اپنی کارگزاری کا چرچا کرنے لگے۔ ہم نے ان پر جرمانہ عائد کردیا اور کہا کہ آپ کو چار سال گیارہ ماہ بعد ہی اپنے کارنامے یاد آنے تھے؟ وہ پوری کابینہ سمیت سرکاری ہیلی کاپٹر میں الیکشن کمیشن کے دفتر آ گئے۔

وزیراعلیٰ نے دہائی دی کہ کمیشن کو اتنی جلدی کیا ہے ابھی تو اس کی مدت (اقتدار) باقی ہے۔ کمیشن نے الٹا اس کے لتے لیے اور کہا کہ آپ کو سرکاری ہیلی کاپٹر میں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟ ہیلی کاپٹر یہیں چھوڑ کر نجی کاروں میں واپس جائیں۔ انھیں اٹھارہ لاکھ روپے جرمانہ ہوا۔ وہ جب بھی مجھے ملیں تو کہتے ہیں "تم نے ہماری درخواست کو ٹھکرا دیا۔ اس کا افسوس نہیں لیکن جو جرمانہ لگایا اس کی شکایت ہے۔"

یہ بات قابل ذکر ہے کہ آئین اور عدلیہ دونوں نے بھارتی الیکشن کمیشن کو طاقتور و بااختیار بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خصوصاً عدلیہ کو کمیشن کا [illegible] کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی کمیشن کے خلاف عدالت میں جائے تو اس کی درخواست خارج کردی جاتی ہے۔

یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے جب سیاست دان الیکشن کمیشن کے خلاف شکایات لیے سپریم کورٹ پہنچے۔ سپریم کورٹ نے ترنت جواب دیا کہ آئین کی رو سے انتخابات سے متعلق تمام فیصلے الیکشن کمیشن کرے گا۔ اور اس کے فیصلوں میں سپریم کورٹ بھی مداخلت نہیں کرسکتی۔ یوں عدالت عالیہ نے آغاز ہی میں سیاست دانوں پر الیکشن کمیشن کی دھاک بٹھا دی۔

لیکن عدالتیں بھی اسی لیے کمیشن کی حمایت کرتی ہیں کہ اس کا کردار صاف ستھرا ہے۔ جب بھی کمیشن کا دامن داغدار ہوا، نہ صرف سپریم کورٹ اس کی مدد سے ہاتھ کھینچ لے گی بلکہ عوام بھی مخالف بن جائیں گے۔

بھارتی الیکشن کمیشن کا تیارہ کردہ اشتہار۔ اس میں بھارتی عوام کو بتایا گیا ہے کہ مہر کا (جامنی رنگ) آپ کے ملک کی تقدیر بدل سکتا ہے

بھارتی الیکشن کمیشن اسی لیے بھی مضبوط ہوا کہ بھارت میں بیوروکریسی کا ادارہ ٹھوس بنیادوں پر قائم ہے۔ ہمارے ملک میں تو اسے ریڑھ کی ہڈی تصور کیا جاتا ہے۔ بیوروکریسی نے الیکشن کے دوران اپنی سرگرمیوں کے سلسلے میں قوانین کار (Code of Conduct) بنا رکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک نہیں ہونا، کسی سے کام کا تقاضا نہیں کرنی، کسی کو چیلنج نہیں دینا وغیرہ۔

مزید برآں بھارتی بیوروکریسی مکمل طور پر سپریم کورٹ اور الیکشن کمیشن کی تابع ہے۔ اگر کہیں کوتاہی ہوتی ہے اور الیکشن کمیشن کسی سرکاری افسر سے کہے کہ کل ۵ بجے تک جواب دینا ہے تو وہ ۴ بجے ہی پہنچ جاتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ سرکاری افسر الیکشن کمیشن سے اتنا ڈرتے ہیں۔

پارلیمنٹ یقیناً سپریم ہے۔ وہاں بیٹھے ارکان ہمارے ادارے کا بجٹ بناتے ہیں لیکن وہ ہمارے باس نہیں۔ ہمارے ایک وزیرِ قانون نے انتخابی قوانین کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ چناں چہ الیکشن کمیشن نے انھیں نوٹس بھجوا دیا۔ وہ خوب چلائے کہ ہماری بلی ہمی کو میاؤں! الیکشن کمیشن نے انھیں کہا کہ ٹھیک ہے آپ وزیر ہیں۔ مگر قانون کوئی بھی توڑے، وہ سزا سے نہیں بچ سکتا۔

بھارت میں بھی اچھے برے لوگ موجود ہیں۔ لیکن الیکشن کمیشن برے بھلے افراد کے مابین تمیز کرنا سیکھ گیا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ جمہوریت سیاست دانوں کے بغیر نہیں پنپ سکتی اور ان میں اچھے ہوتے ہیں برے بھی۔ کمیشن ہمیشہ اچھے سیاست دانوں کی مدد کرتا اور انھیں تقویت پہنچاتا ہے۔

مزید برآں بھارتی میڈیا بھی چوکس نگران کی صورت اختیار کر چکا، وہ الیکشن کمیشن پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن وہ کسی معاملے میں کوتاہی ہو تو حل کرنے کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ مسلسل جانچتا ہے کہ الیکشن کمیشن کے افسروں یا نمائندوں نے رشوت تو نہیں لی یا کوئی سہولت تو نہیں لی۔ کمیشن نے میڈیا کو کہہ رکھا ہے کہ اگر ادارے کا کوئی افسر یا نمائندہ فراڈ کرتا پکڑا جائے تو اس امر کی خوب تشہیر کریں۔

انتخابات کے عمل سے گزر کر بھارتی عوام بھی سمجھدار ہو چکے۔ وہ اب جانتے ہیں کہ کون سی سیاسی جماعت ان کے کام کراتی ہے۔ چناں چہ دہلی میں عاپ (عام آدمی پارٹی) کی کامیابی اسی سمجھداری کا ثبوت ہے۔ ہم نے ووٹروں کو تعلیم و تربیت دینے کی خاطر ''انڈیا انسٹی ٹیوٹ ڈیموکریسی'' کے نام سے ایک ادارہ بھی بنا رکھا ہے۔

الیکشن کمیشن نے انتخابی عمل کو بہتر بنانے کے لیے ۲۵ تجاویز دے رکھی ہیں۔ وہ حکومت کے زیرِ غور ہیں۔ ان کی منظوری سے انتخابی عمل مزید بہتر ہو گا اور بھارت میں جمہوریت کو تقویت ملے گی۔

☆☆☆

شہاب الدین قریشی صاحب کی گفتگو ختم ہوئی تو اس کے بعد سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ جماعت اسلامی پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل جناب فرید احمد پراچہ نے پہل کرتے ہوئے پوچھا ''آپ نے بہت پر مغز گفتگو فرمائی۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ بھارتی الیکشن کمیشن انتخابات میں اخراجات کی کوئی حد مقرر کرتا ہے؟ اگر مقرر ہے تو اس کی نگرانی کیسے ہوتی ہے؟

''دوسرا سوال یہ کہ کمیشن کے خلاف کیا عدلیہ میں درخواستیں دی جاتی ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو ان پر کتنے عرصے میں فیصلے ہوتے ہیں؟ تیسرا سوال یہ کہ جموں و کشمیر میں حالیہ الیکشن کے موقع پر فوج موجود رہی۔ مودی صاحب نے بھی وہاں کے کئی دورے کیے۔ ایسے میں کمیشن نے الیکشن کو صاف شفاف بنانے کی خاطر کیا اقدامات کیے؟''

ان سوالات کا جواب دیتے ہوئے شہاب الدین قریشی نے فرمایا: ''الیکشن کمیشن اخراجات کی حد امیدوار پر مقرر کرتا ہے، سیاسی جماعت پر نہیں۔ فی الوقت پارلیمنٹ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کے الیکشن پر امیدوار ۷۰ لاکھ روپے خرچ کر سکتا ہے۔ ریاستی الیکشن پر یہ رقم ۲۵ تا ۴۰ لاکھ روپے ہے۔

''ہم انتخابی مہم کے دوران سبھی اخراجات پر نظر رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ بڑا کٹھن کام ہے۔ پوری دنیا میں دوران الیکشن اخراجات کنٹرول نہیں ہو پاتے۔ مگر کمیشن نے ایسے اقدامات ضرور کیے ہیں جن کی وجہ سے امیدوار سوچ سمجھ کر رقم خرچ کرتا ہے اور الٹے سیدھے اقدامات نہیں اپناتا۔

''اخراجات کی پڑتال کی غرض سے الیکشن کمیشن ''مانیٹرنگ کمیشن'' تشکیل دے چکا۔ ایک انکم ٹیکس افسر اس کے سربراہ بنے تھے۔ انھوں نے پھر بسلسلہ اخراجات قوانین بنائے۔ مثال کے طور پر ایک قانون یہ ہے کہ ہر امیدوار بینک اکاؤنٹ کھول کر اس میں انتخابی مہم پر خرچنے والی ساری رقم ڈالے گا۔ کمیشن پھر اس اکاؤنٹ پر نظر رکھتا اور دیکھتا ہے کہ رقم کیونکر خرچ ہو رہی ہے۔

''امیدوار انتخابی مہم کے سلسلے میں ایک رجسٹر بناتا ہے۔ وہ روزانہ کا حساب کتاب اس پر درج کرتا ہے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز آ کر کمیشن کو رجسٹر دکھاتا ہے۔ مزید برآں کمیشن کی ویڈیو ٹیم اس کی بڑی میٹنگوں میں شرکت کرتی ہے۔ اگر وہ دروغ گوئی کرے تو کمیشن فوراً اسے متنبہ کرتا ہے کہ فلاں میٹنگ پر ایک نہیں دو لاکھ روپے خرچ آیا ہے۔

''الیکشن ختم ہونے کے بعد ۲۰ دن کے اندر اندر امیدوار اخراجات کی تفصیل دیتا ہے۔ ہم باریک بینی سے اس کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ معمولی سا فراڈ بھی سامنے آ سکے۔ لیکن سیاہ دھن کو مکمل طور پر کنٹرول کرنا بہت مشکل ہے۔ میں نے اپنی ایک کتاب میں سیاہ دھن کو سفید بنانے (منی لانڈرنگ) کے ۴۰ طریقے لکھے ہیں۔

''مسئلہ یہ ہے کہ ووٹر کو اپنے جال میں پھنسانا آسان ہے۔ کئی امیدوار گھریلو سامان حتی کہ ملازمتیں دینے کا لالچ دے کر ووٹروں کو اپنی چھتری تلے لے آتے ہیں۔ انتخابی مہم کے دوران ووٹروں کی دعوتیں کرنا بھی کام ہے۔

جناب شہاب الدین دوران الیکشن ٹی وی پر بھارتی قوم سے خطاب کرتے ہوئے

''اب آئیے دوسرے سوال کی طرف! انتخابات کے بعد الیکشن کمیشن کے خلاف عدالیہ میں درخواستیں دی جاتی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ہائی کورٹ میں پہنچ کر درخواستیں چار پانچ سال تک لٹکی رہتی ہیں۔ اب کوئی رکن اسمبلی دھاندلی سے منتخب ہوا تین چار سال گزار گیا اور پھر اس کے خلاف عدالتی فیصلہ آیا تو وہ کس کام کا؟

''اسی لیے الیکشن کمیشن نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ انتخابات سے متعلق درخواستیں نمٹانے کے لیے ایک ''لا کمیشن'' بنایا جائے۔ یہ لا کمیشن پھر جلد از جلد ان درخواستوں کو نمٹا سکے گا۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

''تیسرے آپ نے کشمیر میں الیکشن سے متعلق سوال اٹھایا۔ کشمیر میں اب فوج انتخابات سے بالکل لاتعلق رہتی ہے۔ کمیشن نے فوج سے کہہ دیا کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کرے۔ ریاست میں الیکشن کرنا کمیشن کی ذمے داری ہے۔ مزید برآں پورے بھارت کی طرح کشمیری ووٹروں کا بھی بنیادی مطالبہ یہی ہے کہ ایسے امیدواروں کو ووٹ دیا جائے جو ان کے مسائل حل کر سکیں۔''

☆☆

دنیا نیوز سے وابستہ پروگرام نقطہ نظر کے میزبان اجمل جامی نے اگلا سوال کیا: ''میرا پہلا سوال یہ ہے کہ الیکشن کمیشن کو تین دن کے مختصر وقت میں کیسے پتا چلتا ہے کہ فلاں جگہ دوبارہ انتخاب کرانا ہے؟ دوسرے یہ بتائیے کہ الیکٹرونک مشین کے استعمال سے کیا فوائد حاصل ہوئے؟'' بھارت کے سابق چیف الیکشن کمشنر گویا ہوئے:

''جب کسی علاقے میں دوبارہ انتخاب کرانے کا حکم دیا جائے تو پہلے خوب سوچ بچار ہوتا ہے۔ اور کئی وجوہ دیکھی جاتی ہیں۔ مثلاً دھاندلی کی شکایات کا آنا۔ اسی طرح ایک پولنگ اسٹیشن پر ٹرن آؤٹ کی اوسط شرح ۶۰ فیصد ہے اور وہاں صرف ۲۰ فیصد ووٹ پڑیں تو قدرتاً ہمارے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نمائندے پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ووٹروں کو آنے سے روکا گیا؟

''الیکٹرونک مشین کے غلط استعمال یا خرابی کی صورت میں بعض اوقات دوبارہ الیکشن کرانا پڑتا ہے۔ ہم ہر الیکٹرونک مشین میں سو ڈمی ووٹ ڈال کر اس کی پڑتال کرتے ہیں۔ مگر کبھی پریذائڈنگ افسر مشین میں ری سیٹ کا بٹن دبانا بھول جاتا ہے۔ غرض ری پولنگ کرانے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔

''الیکشن کمیشن ۱۹۹۸ء سے الیکٹرونک مشینوں کے ذریعے انتخابات کروا رہا ہے۔ میں تو اس کو ''جمہوریت کی جادوئی مشین'' کہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعے صاف و شفاف الیکشن کرانا آسان ہو گیا۔ بے شک ہم تین دن بعد ووٹ گننا شروع کرتے ہیں مگر جب کام شروع ہو تو الیکٹرونک مشینوں کی مدد سے پانچ چھے گھنٹے میں نتائج قوم کے سامنے لے آتے ہیں۔

''یہ الیکٹرونک ووٹنگ ہی کا کمال ہے کہ محض ایک ووٹ سے ہارنے والا امیدوار بھی اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ دوسری طرف ڈبوں میں ڈالے گئے ووٹوں کا یہ حال ہے کہ ایک ایک ووٹ پر جھگڑا ہوتا ہے۔

''اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ ان پڑھ بھارتی الیکٹرونک مشین کیسے استعمال کرتے ہیں؟ اس کے استعمال کا طریقہ کوئی راکٹ سائنس نہیں۔ تھوڑی سی مشق کے ذریعے دیہاتی ووٹر بھی اسے چلانا سیکھ جاتا ہے۔ آخر ووٹ ڈالنے کے لیے صرف بٹن ہی دبانا پڑتا ہے۔

''جب کوئی الیکٹرونک مشین پر ووٹ ڈالنے جائے تو اسے ہر انتخابی نشان کے سامنے ایک بٹن نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ بتی نصب ہوتی ہے۔ جب بھی ووٹر مطلوبہ بٹن دبائے، متعلقہ بتی روشن ہو جاتی ہے۔ مزید برآں ''بیپ'' کی آواز بھی آتی ہے۔ یہ آواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ کمرے کے باہر کھڑے لوگ بھی سن لیں۔ اگر مقررہ وقت کے بعد کوئی دھاندلی سے ووٹ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ڈالنے کی سعی کرے تو یہ آواز ہی فراڈ افشا کر دیتی ہے۔

"جب الیکٹرونک مشین کا مطلوبہ بٹن دب جائے تو وہ ۱۲ سیکنڈ کے لیے مردہ ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ازسرنو چالو ہوتی ہے۔ پہلے فراڈیے چند لمحوں میں پانچ سو جعلی ووٹ ڈال دیتے تھے۔ اب ایک بٹن دبا کر دوسرا نہیں دب سکتا کیونکہ مشین مردہ ہو جاتی ہے۔

"غرض الیکٹرونک مشین کے آنے سے نہ صرف الیکشن کمیشن کا کام آسان ہوا بلکہ اس پر عوام کا اعتماد بھی بڑھ گیا۔ اب سیاست داں بھی اس نظام کو پسند کرتے ہیں کہ یوں دھاندلی ہونے کا خطرہ جاتا رہا۔

"اب الیکشن کمیشن نے یہ طریقہ کار بھی وضع کیا ہے کہ جوں ہی مطلوبہ بٹن دبے، مشین ایک کاغذ طبع کر دیتی ہے۔ کاغذ پر ووٹر اور اس سیاسی جماعت کا نشان چھپا ہوتا ہے جسے ووٹ ڈالا گیا۔ وہ کاغذ خود بخود کٹ کر پیٹی میں گر جائے گا۔ لوگ اسے 'ووٹ رسید' کہتے ہیں۔ پاکستانیوں کو میرا یہی مشورہ ہے کہ اپنا انتخابی نظام بھی صاف و شفاف کرنے کے لیے الیکٹرونک مشین استعمال کریں۔"

اب وطن عزیز کے ممتاز سرکاری افسر اور پی ٹی آئی کے راہنما تسنیم نورانی گویا ہوئے۔ انھوں نے مہمان گرامی سے فرمایا "آپ نے بتایا کہ بھارتی الیکشن کمیشن کے منتظم سرکاری افسر ہوتے ہیں۔ جبکہ ہمارے

بھارت کی مشہور زمانہ الیکٹرونک ووٹنگ مشین

ہاں یہ ذمے داری ریٹائرڈ جج سنبھالتے ہیں۔ بھارت میں الیکشن کرانے کا طریقہ کار کیا ہے؟

جناب شہاب الدین قریشی نے جواب دیا "جیسا کہ میں نے بتایا، الیکشن کا اعلان ہوتے ہی سرکار کوئی اعلان نہیں کر سکتی۔ اس کی گاڑی لال بتی پر رک جاتی ہے۔ حتیٰ کہ نتائج کا اعلان ہونے تک سپریم کورٹ بھی ہمارے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔

"الیکشن کے موقع پر ریٹرننگ افسر ضرور عدلیہ سے لیے جاتے ہیں، لیکن ان کے نیچے موجود ایک کروڑ دس لاکھ افراد عدلیہ سے تعلق نہیں رکھتے اور بھی سیاست دان اور عوام ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ الیکشن کمیشن بھارت کے ہر نامی گرامی وکیل سے رابطہ رکھتا ہے تاکہ دوران انتخابات کوئی قانونی سقم جنم لے تو اسے دور کیا جا سکے۔

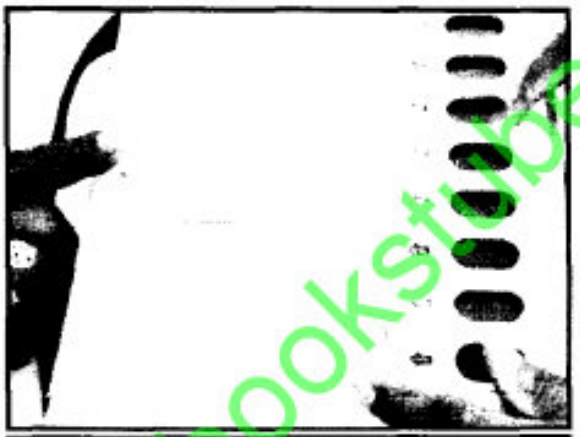

محفل میں معروف صحافی افتخار احمد بھی شریک تھے۔ اب انھوں نے اگلا سوال کیا "الیکٹرونک مشین خراب ہو جائے تو اس سے پورے انتخاب پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

بھارتی مہمان کچھ سوچ کر بولے "اگر کوئی الیکٹرونک مشین خراب ہو جائے تو صرف ایک پولنگ بوتھ ہی متاثر ہوتا ہے۔ وجہ یہ کہ کوئی بھی الیکٹرونک مشین ایک دوسرے سے منسلک نہیں۔ ہر مشین آزادانہ کام کرتی ہے۔ دراصل ہم نے یہ مشین ستر ہویں صدی کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کیلکولیٹر کی طرز پر بنائی۔ چناں چہ کیلکولیٹر کے مانند یہ مشین بھی دھوکا نہیں دیتی' دو اور دو چار ہی بتاتی ہے۔

''اس وقت انٹرنیٹ کی نیٹ ورکنگ بہت خطرناک شے بن چکی۔ اس سے منسلک کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ دو اور دو پانچ بھی بتا سکتا ہے۔''

☆☆☆

ملک کے ممتاز قانون داں ایس ایم ظفر بھی محفل میں تشریف فرما تھے۔ انھوں نے بھارتی (ر) چیف الیکشن کمشنر کو مخاطب کر کے فرمایا: ''آپ کی گفتگو آشکار کرتی ہے کہ بہتر جمہوریت کے لیے صاف شفاف انتخابات کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں یہ تاثر جڑ پکڑ چکا کہ بے شک دھاندلی ہو لیکن بار بار انتخابات ہونے سے پاکستان میں جمہوریت مستحکم ہو جائے گی۔''

جناب شہاب الدین قریشی کہنے لگے: ''پاکستان میں دھاندلی کی شکایات اس لیے زیادہ جنم لیتی ہیں کہ الیکشن کمیشن پر اعتبار کم ہے۔ انتخابات سے قبل اور بعد میں اس پر سوالات کی بوچھاڑ رہتی ہے حالانکہ اس کا انتظام جج صاحبان نے سنبھالا ہوتا ہے۔ ہر جگہ سرکاری افسروں کی نسبت جج صاحبان کی ساکھ زیادہ اچھی ہوتی ہے۔

''پاکستان میں پھر الیکشن کمیشن میں ججوں اور دیگر عہدیداروں کی تعیناتی کا نظام بھی عمدہ ہے۔ ہمیں تو حکومت وقت تعینات کرتی ہے۔ کوئی بھی انگلی اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ یہ تو حکومت کا بندہ ہے۔ لیکن کوئی انگلی نہیں اٹھاتا کیونکہ سب کو اعتماد ہے کہ یہ آدمی غیر جانبدار رہے گا۔

''الیکشن کمیشن میں کوئی بھی بے ایمانی کرے' فوراً دوسروں کو نظر آ جاتا ہے۔ اس لیے پاکستانی قوم سے گزارش ہے کہ آپ بھی اپنے الیکشن کمیشن پر شک نہ کریں۔ اس کی چھوٹی موٹی انتظامی غلطی کو درگزر کر دیں اور اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط و طاقتور بنائیے۔

''بھارتی الیکشن کمیشن کو طاقتور بنانے میں سیاسی جماعتوں کا بھی اہم کردار ہے۔ اگر پاکستانی سیاسی جماعتوں نے اپنے الیکشن کمیشن کی ساکھ کو نشانہ بنائے رکھا تو اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بھارت میں کبھی الیکشن کمیشن کو تیز و تند حملوں کا نشانہ نہیں بننا پڑا۔

''آج بھارت میں جب بھی انتخابات ہوں' تو عموماً ہارنے والا فاتح کو مبارکباد دیتا ہے۔ اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتا ہے۔ اگر سیاسی راہنماؤں کو انتخابی نتائج پر شک و شبہ ہوتا' تو وہ یہ اقدام کیوں کرتے؟ آپ یہ دیکھیے کہ نریندر مودی نے الیکشن جیتا' تو وزیراعظم منموہن سنگھ سے ملنے گئے۔ یہ ایک طرح سے بھارتی الیکشن کمیشن پر اظہار اعتماد ہے۔''

☆☆☆

مہمان گرامی سے اگلا سوال سی پی این ای کے صدر اور ممتاز صحافی (روزنامہ پاکستان) کے چیف ایڈیٹر مجیب الرحمان شامی نے کیا: ''بھارتی الیکشن میں ووٹ ڈالنے کی شرح کیا ہے؟''

''ہمارے ہاں انتخابات میں ووٹ ڈالنے کی شرح

www.pdfbooksfree.pk

۶۰ سے ۷۰ فیصد ہے۔ میں نے اپنے دور میں کمیشن میں ''ووٹر ایجوکیشن ڈویژن'' بنا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ جو بھارتی ووٹ نہیں ڈالتے انھیں ووٹنگ کی افادیت سے آگاہ کیا جائے۔

''شروع میں کہا گیا کہ الیکشن کمیشن کا کام عوام کو تعلیم و تربیت دینا نہیں۔ لیکن میں نے کہا کہ ٹرن آؤٹ کم رہے تو پورا انتخابی عمل مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس لیے عوام کو ووٹ ڈالنے کی ترغیب دینا ضروری ہے۔

''ایک تجویز یہ آئی کہ جو بھارتی شہری ووٹ نہیں ڈالتا' اُسے سزا دی جائے۔ یہ تجویز میں نے رد کر دی کیونکہ اس طرح وکلا کی چاندی ہو جاتی۔ بہر حال ووٹر کو تعلیم دینے کا منصوبہ شروع کر دیا گیا جس کے باعث الیکشن کمیشن کو اچھا نتیجہ ملا۔

''ہم بھارتی عوام سے کہتے ہیں کہ اوّل اپنا ووٹ دیں اور دوم پوری ذمے داری سے دیں۔ رشوت لے کر یا لالچ میں کبھی ووٹ نہ ڈالیں۔ ہمارے منصوبے سے خصوصاً خواتین نے اچھا اثر قبول کیا۔ چناں چہ انھوں نے حالیہ الیکشن میں پہلے سے زیادہ تعداد میں ووٹ ڈالے۔''

جناب شہاب الدین یعقوب قریشی سے آخری سوال یہ پوچھا گیا: ''بھارت میں دہری شہریت والا راہنما الیکشن لڑ سکتا ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''اگر کوئی بھارتی سیاست دان کسی اور ملک کی قومیت رکھتا ہے' تو وہ الیکشن نہیں لڑ سکتا۔ اگر کوئی ہنڈی مارے اور چھپ چھپا کر رکن اسمبلی بن جائے' تو بعد ازاں اصلیت کھلنے پر اس کی بھارتی شہریت ختم کر دی جاتی ہے۔ وہ پھر ویزہ لے کر ہی بھارت میں قیام کر سکتا ہے۔''

◆●●

بھارتی اور پاکستانی الیکشن کمیشنوں میں فرق

پاکستان اور بھارت' دونوں ملکوں کے الیکشن کمیشنوں کی قوت اور اختیارات ایک جیسے ہیں۔ دونوں خودمختار ادارے ہیں۔ ان کے فیصلے ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں چیلنج ہو سکتے ہیں۔ ان کے مابین پہلا بڑا فرق یہ ہے کہ بھارت الیکشن کمیشن کی پہلے (۲۵ر جنوری ۱۹۵۰ء کو) بنیاد رکھی گئی جبکہ الیکشن کمیشن پاکستان ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کو وجود میں آیا۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ بھارتی الیکشن کمیشن کو وسیع پیمانے پر انتخابات کرانے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر حالیہ بھارتی الیکشن کے لیے کمیشن کو بھارت بھر میں ''۹۱۹۰۰۰'' پولنگ اسٹیشن قائم کرنے پڑے۔ ووٹنگ کرانے کی خاطر وہاں ایک کروڑ سے زائد عملہ تعینات تھا جبکہ ۸۱ کروڑ سے زائد بھارتی ووٹ ڈالنے کے اہل تھے۔ حقیقتاً بھارت میں ہر موقع الیکشن دنیا کا سب سے بڑا انتخابی میلا لگتا ہے۔ لیکن بھارتی الیکشن کمیشن اس دیوہیکل تقریب کا اہتمام اتنے شاندار طریقے سے کرتا ہے کہ وہ بخوبی نمٹ جاتی ہے۔ بس اکا دکا ناخوشگوار واقعات ہی پیش آتے ہیں۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

8 مختلف دلفریب خوشبوؤں میں دستیاب ہے

MEDORA OF LONDON

http://www.booktube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

آنکھیں توجہ چاہتی ہیں!

- ✓ کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
- ✓ کیا آپ پریشان ہیں کہ لینز والا اپریشن کرواؤں یا صرف شعاعیں لگوالوں؟
- ✓ کالا موتیا کیا ہے اور کیا اس کا علاج ہوسکتا ہے؟
- ✓ آنکھ کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- ✓ شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟
- ✓ بچوں کو عینک کیوں لگتی ہے؟ کیا عینک اتر سکتی ہے؟ لیزر سے عینک اتارنے کا اپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
- ✓ کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ لیزر نقصان دہ ہوتی ہے؟
- ✓ آپ نے اپریشن کروایا اب آپ کو کیا احتیاطیں کرنی چاہئیں؟

اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے لئے مندرجہ ذیل Website کا مطالعہ کریں

www.drasifkhokhar.com

ڈاکٹر آصف کھوکھر آئی سرجن

AMERICAN ACADEMY OF OPHTHALMOLOGY
MEMBER

ثریا عظیم ہسپتال

لاہور میڈی کیئر

Cell: 0333-4102266

Email: drasifkhokhar@hotmail.com

آپریشن لاہور میڈی کیئر جیسے جدید ترین آئی ہسپتال میں کیے جاتے ہیں

Vitreoretinal Surgery
- ✓ (Retinal Detachment)
- ✓ (Vitreous Hemorrhage)
- ✓ Macula

Phaco Surgery
- ✓
- ✓ Multifocal

Laser Surgery
- ✓ Retina
- ✓ Epi-LASIK Excimer
- ✓ Diode Yag Argon
- ✓ Yag

Corneal grafting surgery
- ✓

Surrayya Azeem Hospital Chawk Chawbugy, Multan Road, Lahore Phone: 03008467242

www.pdfbooksfree.pk

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

قدرتِ الٰہی کا حیران کن کرشمہ

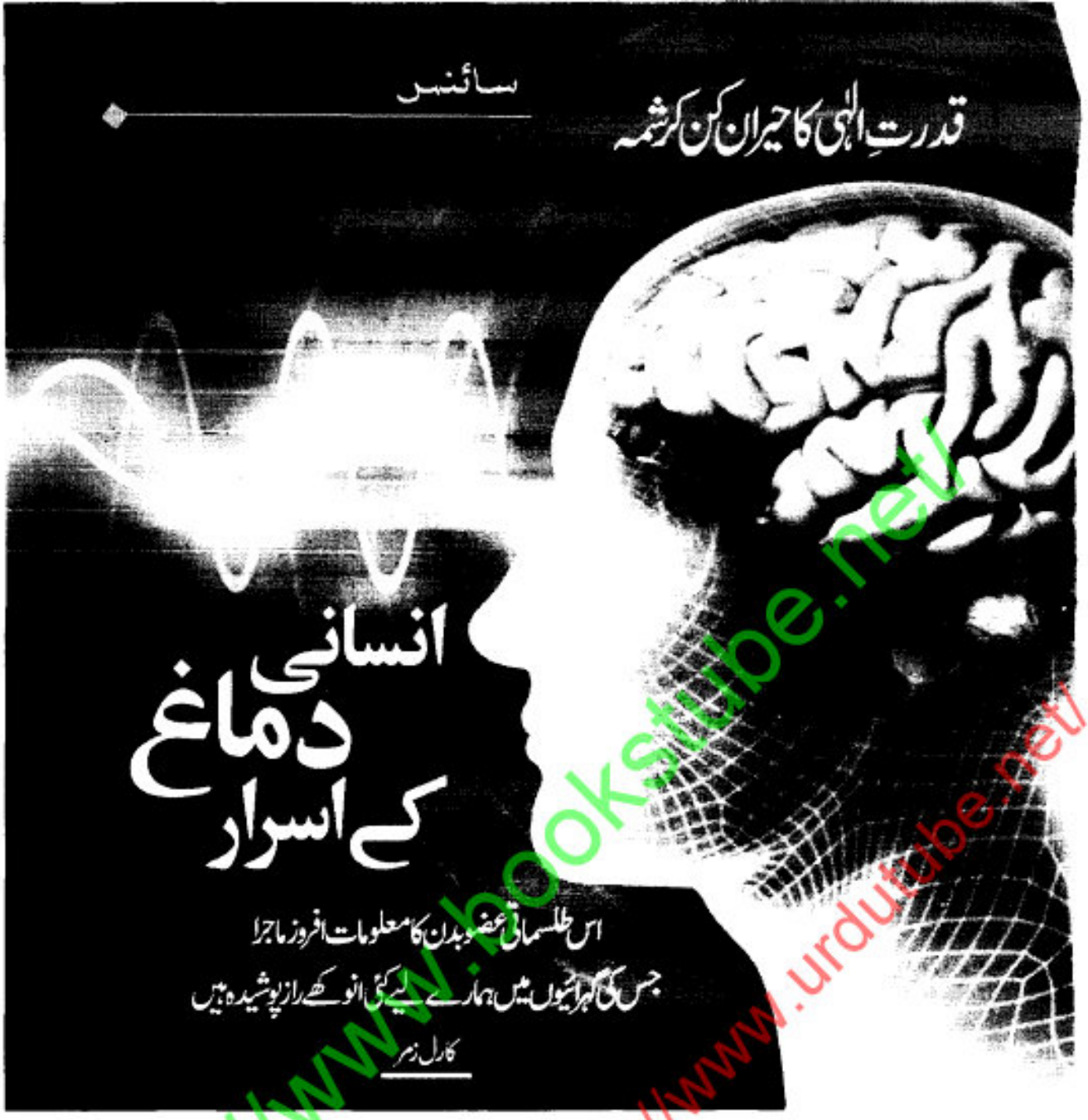

انسانی دماغ کے اسرار

اس طلسماتی عضو بدن کا معلومات افروز ماجرا

جس کی گہرائیوں میں ہمارے لیے کئی انوکھے راز پوشیدہ ہیں

کارل زمر

وان ویدن غور سے کمپیوٹر اسکرین کو تک رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دبا ''چوہا'' بہ سرعت ادھر اُدھر ہل رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہی کرسی پر براجمان تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا: ''تمھارا دماغ تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

دراصل ویدن کے کمپیوٹر میں سیکڑوں دماغوں کی تھری ڈی تصاویر محفوظ تھیں۔ یہ بندروں، چوہوں اور بشمول میرے انسانوں کے دماغ تھے۔ وہ میرے دماغ کی تھری ڈی تصاویر دکھا کر مجھے اس انسانی عضو کے حیرت انگیز اور محیر العقول اسرار سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

میں بوسٹن (امریکی شہر) کی بندرگاہ کے نزدیک واقع اس مارتینوس سنٹر فار بائیومیڈیکل امیجنگ میں دوسری بار آیا تھا۔ چند ہفتے قبل پہلا دورہ کیا، تو خود کو ویدن اور ان کے ساتھیوں کے سامنے بحیثیت ''گنی پگ'' پیش کر دیا۔ چناں چہ مجھے سکیننگ روم پہنچایا گیا۔

کمرے میں ایک نوجوان نے مجھے ہیلمٹ نما آلہ سر پر پہنایا۔ اس پر تقریباً ایک سو ننھے منے انجینے نصب تھے۔ ان انجنوں نے میرے دماغ سے نکلنے والی ریڈیائی لہریں پکڑنی تھیں۔ جلد ہی مجھے ایک تختے پہ لٹا سکینر کے نیچے سلا دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد سکینر اپنا کام کرنے لگا۔ یہ امیجنگ مشین ویدن نے مع ٹیم اپنی تحقیق کے واسطے خاص طور پر تیار کی تھی۔ اس میں بمشکل اتنی جگہ تھی کہ ایک انسان سما جائے اور میں اس گھٹن زدہ جگہ ایک گھنٹے تک لیٹا رہا۔

تاہم میری سوچوں اور غور وفکر نے اس ایک گھنٹے کو یادگار اور خوشگوار بنا دیا۔ مشین میں لیٹا جسم انسانی کے اہم ترین عضو دماغ کے متعلق سوچتا رہا۔ انسان میں تمام جذبات، احساسات اور سوچوں کا مرکز یہی سوا ایک کلو وزنی لجلجا سا سفید لوتھڑا ہے جو سخت کھوپڑی کے اندر محفوظ ہوتا ہے۔

اسی دماغ کے اندر بادام کی شکل والی گٹھلی، ایمی گڈالا (Amygdala) واقع ہے۔ انسان میں خوف و دہشت کا جذبہ اسی گٹھلی میں جنم لیتا اور برقی رووں (Electrical Impulses) کی صورت پورے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ جبکہ فرنٹل کورٹیکس (Frontal Cortex) میں یہ خوف دور کرنے والے آرام وسکون کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

مجھے پھر اپنی بیٹی کے ساتھ برف پر چہل قدمی کرنا یاد آیا۔ دماغ میں یادوں کا ''سوئچ'' ہپوکامپس (Hippocampus) نامی علاقہ ہے۔ اس علاقے میں نیورون (دماغی خلیے) کسی لشکر کی صورت موجود ہیں۔ انسان کو جب کوئی یاد آئے، تو انہی نیورونوں کے متحرک ہونے سے یادوں کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔

کچھ عرصہ قبل میں نے طے کیا تھا کہ دور جدید میں انسانی دماغ کے عجوبے پر جتنی تحقیق ہوئی ہے، اسے بشکل مضمون بیان کیا جائے۔ چناں چہ میں امریکا بھر میں پھیلے ان سائنسی اداروں میں جانے لگا جہاں انسانی دماغ پر تحقیق جاری ہے۔ مارتینوس سنٹر پہنچا، تو وان ویدن نے میرے دماغ کی بھی اسکیننگ کر لی۔

انسانی دماغ پر جاری تحقیق کی مختلف جہتیں ہیں۔ بعض ماہرین ایک ایک نیورون کے ڈھانچے یا ساخت پر تحقیق کر رہے ہیں۔ کچھ کی توجہ کا مرکز دماغ کی حیاتی کیمیا (Biochemistry) ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اربوں دماغی نیورون کیونکر پیدا ہوتے اور ہزاروں

مصنف

کارل زمر ۱۹۶۳ء میں امریکا میں پیدا ہوئے۔ ممتاز سائنسی ادیب ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں مشہور سائنسی رسالے ''ڈسکور'' کا آغاز کیا۔ سائنس و ٹیکنالوجی کے کئی موضوعات پر معلوماتی کتب تحریر کر چکے۔ آپ سائنسی موضوعات کو عام فہم زبان میں بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اقسام کے پروٹینی مادوں کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔

وان ویدن مع ٹیم دماغ کی ''وائرنگ'' پر تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ وائرنگ عصبی تاروں (Nerve Fibers) پر مشتمل ہے۔ اندازے کے مطابق ان تاروں کی کل لمبائی ''ایک لاکھ میل'' بنتی ہے۔ انہی عصبی تاروں کی مدد سے ہمارے دماغ کے تمام حصے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہم سوچنے، محسوس کرنے اور جانچ پرکھ کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ عصبی تاریں ''سفید مادہ'' (White Matter) بھی کہلاتی ہیں۔

امریکی اور یورپی حکومتیں نامور ماہرین کو کروڑوں روپے دے رہی ہیں تاکہ وہ گہرائی میں جا کر انسانی دماغ کا مطالعہ کر سکیں۔ مقصد یہ ہے کہ دماغی امراض کا علاج دریافت ہو جائے اور جدید تحقیق سے مستفید انسانوں اور مریضوں کے دماغوں میں موجود فرق سامنے لا رہی ہے۔ یہ متفرق دماغی بیماریوں مثلاً شیزوفرینیا، آٹزم اور الزائمر کے مریض ہیں۔ ان تمام امراض کا علاج دریافت نہیں ہو سکا۔

آخر ویدن نے میرے دماغ کا پرنٹ تلاش کر لیا۔ اس میں دماغ کے مختلف حصوں کو جوڑتے عصبی تاروں کے لاتعداد بنڈل نظر آ رہے تھے۔ یہی تاریں دماغ کے لاتعداد بنڈل تک پیغامات لے کر جاتی ہیں۔ ویدن کا تیار کردہ خصوصی اسکینر یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ مختلف عصبی تاروں کو متفرق رنگوں میں دکھا سکے۔ یوں یہ جاننا آسان ہو جاتا ہے کہ کون سی عصبی تاریں کس دماغی حصے سے تعلق رکھتی ہیں۔

مثلاً دماغ کے میرے اسکین میں بولنے کے عمل سے وابستہ عصبی تاریں سرخ تھیں۔ ویدن پھر اسکین کو بڑا (میگنی فائی) کرتا چلا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ کروڑوں اربوں عصبی تاریں اپنی بے انتہا پیچیدگی کے باوجود زاویہ قائمہ (Right Angle) بناتی پار ہو رہی ہیں..... جیسے گراف پیپر پر لکیریں (لائنیں) ایک دوسرے کے آر پار ہوتی ہیں۔

ویدن کا کہنا ہے کہ ہمارے دماغ کی بناوٹ گرڈ نما (Grid) ہے..... اور یہ ساخت معنی خیز ہے۔ وجہ یہ کہ ویدن نے بعد از تحقیق سبھی جانوروں کے دماغ کی بناوٹ گرڈ نما پائی ہے۔ حتیٰ کہ کروڑوں سال پہلے کے جانور بھی اپنے دماغ میں عصبی تاروں کا گرڈ رکھتے تھے۔ گو وہ نظام کافی سادہ تھا۔

> یونانی حکما کا خیال تھا کہ دماغ بلغم سے تشکیل پاتا ہے۔ فلسفی ارسطو کے نزدیک یہ ریفریجریٹر تھا جو شیلے دل کو ٹھنڈا کرنے میں کام آتا۔

انسانی دماغ کی گرڈ نما ساخت کے متعلق ویدن کا کہنا ہے ''یہ عین ممکن ہے کہ عصبی تاریں سڑکیں اور گلیاں ہوں۔ ہمارے خیالات گاڑیوں کی طرح ان سڑکوں پر سفر کرتے ایک سے دوسرے دماغی حصے تک سفر کرتے ہیں۔ گویا ہماری سوچ کا پورا نظام بہت نظم و ضبط رکھتا ہے۔ مگر ابھی ہم اس نظام کی جزئیات نہیں جان پائے۔''

دلچسپ بات یہ کہ انسانی دماغ کے اسرار چند عشروں قبل ہی ہم پر کھلے ہیں۔ ورنہ زمانہ قدیم میں تو اس عضو سے کئی توہمات وابستہ تھیں۔ مثلاً یونانی حکما کا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

خیال تھا کہ دماغ بلغم سے تشکیل پاتا ہے۔ فلسفی ارسطو کے نزدیک یہ ریفریجریٹر تھا جو جوشیلے دل کو ٹھنڈا کرنے میں کام آتا۔ جبکہ دماغ میں جنم لینے والے خیالات، جذبات، تصورات واہمے وغیرہ ''روحیں'' سمجھی جاتیں۔

آخر سترہویں صدی میں سائنسی دور شروع ہوا، تو دماغ کی اصلیت سامنے آنے لگی۔ برطانوی سائنس دان، تھامس ویلیس نے انکشاف کیا کہ ہماری سوچیں اسی عضو بدن میں پیدا ہوتی ہیں۔ عصبی خلیے یا نیورون یہ سوچیں جنم دینے کے ذمے دار ہیں۔

ہر نیورون کوئی بھی خیال یا حرکت اپنے سرے، ایکسون (Axon) تک پہنچاتا ہے۔ ہر دو نیورونوں کے درمیان ڈینڈرائٹ (Dendrite) نامی ننھا سے خالی علاقہ واقع ہے۔ جب ایک خیال کسی نیورون تک پہنچے، تو اس کے ایکسون خالی علاقے میں مخصوص کیمیائی مادہ چھوڑتا ہے۔ خیال اسی مادے کے ذریعے دوسرے نیورون تک پہنچتا ہے۔ یوں نیورونوں کی شاہراہ پر اس کا سفر جاری رہتا ہے تاآنکہ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

خیال یا حرکت کی لہر نیورونوں کے مابین بہت تیزی سے سفر کرتی ہے۔ وجہ یہی کہ نیورونوں میں لہر بجلی کے مانند دوڑتی پھرتی ہے۔ اس کی رفتار فی سیکنڈ ۳ تا [illegible] سوفٹ تک ہوتی ہے۔

سائنس دان اب نیورون کی ساخت و ہیئت سمجھنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ آسان کام نہیں، کیونکہ انسانی دماغ تقریباً ''تیس ارب'' نیورون رکھتا ہے۔ اور ہر نیورون ''دس ہزار'' طریقوں سے ایک خیال یا حرکت دوسرے کو بھجوانے پر قادر ہے۔ سائنس دان نیورونوں کے مطالعے سے جاننا چاہتے ہیں کہ ایک نیورون دوسرے سے انگل پچو طریقے سے تعلق جوڑتا ہے یا کوئی مربوط و منضبط طریقہ موجود ہے۔

چونکہ انسانی دماغ کے اربوں عصبی خلیوں پر تحقیق ابھی بہت مشکل ہے۔ لہٰذا فی الوقت چوہے کے دماغ پر ماہرین کی توجہ مرکوز ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ کرنے میں بھی سائنس دانوں کو دشواریوں کا سامنا ہے۔ وجہ یہی کہ دماغ کے نقطے جتنے علاقے میں بھی ہزاروں لاکھوں نیورون اپنی پیچیدہ سرگرمیاں انجام دینے میں مصروف ہوتے ہیں۔

> تجربہ دیکھ کر ہم سب ماہرین کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہمیں احساس ہوا کہ دماغ ہماری توقع سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور دقیق شے ہے۔

پروفیسر جیف لچمان مشہور زمانہ ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک ماہر اعصاب (نیوروسائنٹسٹ) ہیں۔ وہ پچھلے دو برس ایک چوہے کے دماغ میں موجود ہر نیورون کی سہ العبادی (تھری ڈائمنشنل) تصاویر بنا رہے ہیں۔ یوں تصویر میں نیورون کی پوری بناوٹ سامنے آجاتی ہے۔ اور موصوف اب تک محض اتنے نیورون کی تصاویر بنا پائے ہیں جو نمک کے ایک ذرے میں سما جائیں۔ لیکن ان تصاویر کا ڈیٹا ۱۰۰ ٹیرابائٹ کی ہارڈ ڈسکوں میں سما چکا...... یہ ڈیٹا ۲۵ ہزار ہائی ڈیفینیشن فلموں کے برابر ہے۔

بہرحال جب بھی چوہے کے ''سات کروڑ'' نیورونوں کی سہ العبادی تصاویر تیار ہوئیں، تب پروفیسر جیف کا اصل کام شروع ہو گا۔ وہ ایسے قوانین و قواعد تلاش کریں گے جن کی بنیاد پر دماغ کا سارا انتہائی

www.pdfbooksfree.pk

پیچیدہ نظام چل رہا ہے۔ یہ کام کتنا دقیق اور محنت طلب ہے، اس کا اندازہ درج ذیل مثال سے لگائیے۔

بھارت سے تعلق رکھنے والے نارائن کستوری پروفیسر جیف کی راہنمائی میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ چوہے کے دماغ کے ایک حصے کا مکمل تجزیہ کیا جائے۔ یہ حصہ نمک کے ایک ذرے کا ایک لاکھواں حصہ تھا۔ مگر یہ انتہائی ننھا حصہ بھی کام کے لحاظ سے بہت مشقت طلب ثابت ہوا۔

نارائن نے دریافت کیا کہ اس حصے کے نیورون ایک ہزار ایکسون اور تقریباً ایک سو ڈینڈرائٹ رکھتے ہیں۔ اور ہر ایکسون و ڈینڈرائٹ اس حصے میں موجود دیگر نیورونوں سے ''۶۰۰'' روابط یا کنکشن رکھتا ہے۔ پروفیسر جیف کا کہنا ہے ''یہ تجزیہ دیکھ کر ہم سب ماہرین کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہمیں احساس ہوا کہ دماغ ہماری توقع سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور دقیق شے ہے۔''

تاہم اس تحقیق سے ہارورڈ یونیورسٹی کے محققوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ دماغ کی ننھی ترین جگہ پر بھی کام ترتیب و نظم سے کیا جاتا ہے۔ ہر نیورون کے آگے پیچھے، دائیں بائیں نیورون ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کوئی خیال یا حرکت کی لہر آنے پر اسے ایک ہی مخصوص نیورون کی طرف بھجواتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی قدرت نے جس نیورون کو جو کام ودیعت کیا، وہ اسی کو انجام دیتا ہے۔

پروفیسر جیف اور ان کی ٹیم کو چوہے کے بھی نیورونوں کی سرالعبادی تصاویر اتارتے ہوئے کئی سال لگ جائیں گے۔ لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ نیورونوں کی محض تصاویر ہوں گی۔ زندہ نیورون پہ تحقیق کرنے سے ماہرین کو جو معلومات ہاتھ آئیں گی، وہ تصاویر پر وقت لگانے سے ظاہر ہے، نہیں مل سکتیں۔

حقیقی نیورون دراصل ڈی این اے، پروٹینی مادے (Proteins) اور دیگر سالموں (مالیکیولز) کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ پھر ان نیورونوں کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً ہماری آنکھوں میں موجود نیورون روشنی کے فوٹون پکڑنے والا پروٹینی مادہ بناتے ہیں۔ اسی طرح وسطی دماغ کے علاقے، سبسانیا نگیرا (Substantia Nigra) میں بستے نیورون ڈوپامائن (Dopamine) تخلیق کرتے ہیں۔ یہی کیمیائی مادہ ہم میں فرحت و انبساط کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

ماہرین سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ایک نشوونما پاتے بچے کے ''۸۴'' فیصد جین دماغ کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں۔ جبکہ دیگر اہم جسمانی اعضا مثلاً دل، جگر اور گردوں کی تشکیل میں کہیں کم جین صرف ہوتے ہیں۔ یہ سچائی آشکار کرتی ہے کہ انسانی دماغ کے اسرار اب تک جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی پہنچ سے کیوں باہر ہیں۔

بہرحال امریکا، برطانیہ، جاپان اور جرمنی میں چوٹی کے سائنس دان انسانی دماغ کی تنگ و تاریک پہنائیوں میں جھانک رہے ہیں۔ انھیں امید ہے کہ آنے والے عشروں میں وہ انسانی دماغ کی ہوبہو نقل تخلیق کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ گویا تب دماغ سے وابستہ کئی جسمانی و نفسیاتی بیماریوں کا علاج بھی دریافت ہو جائے گا۔ اس ضمن میں پروفیسر جیف لچمان کا کہنا ہے:

''ابھی ہم صحت مند انسان اور شیزوفرینیا کے مریض کے دماغوں میں فرق نہیں کر سکتے لیکن اب نیوروسائنس نئے دور میں داخل ہو چکی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب ہم معمے کی بکھری تصویریں موزوں جگہ فٹ کرنے لگے ہیں۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

گریفائن

اکیسویں صدی کا کرشماتی مادہ

نیئر اسد

۱۹۴۷ء کی بات ہے، امریکی طبیعات دان پی آر ویلس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ گریفائٹ (Graphite) مادے کے ذریعے نہایت باریک مگر بہت مضبوط مادہ بنانا ممکن ہے۔ آخر ۲۰۰۴ء میں مانچسٹر یونیورسٹی (برطانیہ) کے دو محققوں پروفیسر آندرے گیم اور کونسٹانٹین نووسلیوف نے طویل عرصہ تحقیق و تجربات کے بعد یہ مادہ دریافت کر لیا۔ یہ کارنامہ دکھانے پر دونوں سائنس دانوں کو ۲۰۱۰ء میں طبیعات کا نوبل انعام دیا گیا۔ یہ مادہ اب گریفائن

یا گریفین (Graphene) کے نام سے شہرت حاصل کر چکا۔

گریفائٹ کاربن کی ایک قسم ہے۔ اسی سے آنکھوں میں ڈالنے والا سرمہ بنتا ہے۔ گریفائن اسی گریفائٹ کی ایک قسم ہے۔ گریفائن کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے صرف ایک ایٹم جتنی شیٹ (Sheet) بنانا ممکن ہے۔ اس شیٹ کی موٹائی کا اندازہ یوں لگائیے کہ اگر ۳۰ لاکھ [illegible] شیٹیں ایک دوسرے کے اوپر رکھی جائیں تو وہ [illegible] ایک ملی میٹر موٹی ہوں گی۔ یہ تو ہوئی گریفائن کی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

باریکی، اب ذرا مضبوطی ملاحظہ فرمائیے۔

ماہرین کے مطابق یہ اب تک دریافت ہونے والا سب سے مضبوط مادہ ہے۔ یہ اسٹیل سے "۲۰۰ گنا" زیادہ طاقتور ہے۔ اگر کیمرے کی فلم گریفائن سے بنائی جائے تو اس میں اسی صورت سوراخ ممکن ہے کہ پنسل پر ہاتھی کھڑا ہو اور نوک اندر داخل ہو جائے۔

اسی مضبوطی اور دبلے پن کے باعث سائنس دانوں نے گریفائن کو اکیسویں صدی کے کرشماتی مادے کا خطاب دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب بھی مستقبل میں اس کی تیاری تجارتی پیمانے پر شروع ہوئی، یہ کمپیوٹر اور دیگر الیکٹرونکس میں انقلابی تبدیلیاں لے آئے گا۔

گریفائن کی ایک خوبی کاربن سے بھی زیادہ ایصالی (Conductive) ہونا ہے۔ چنانچہ ممکن ہے کہ مستقبل کی الیکٹرونکس اشیا میں یہ وہ سلی کون (Silicon) مادے کی جگہ لے لے جس سے کہ ابھی سیمی کنڈکٹر سرکٹ اور دیگر اجزا بنتے ہیں۔

پروفیسر آندرے گیم کا کہنا ہے: "گریفائن کو کئی اعتبار سے استعمال کرنا ممکن ہے۔ جیسے پلاسٹک کئی لحاظ سے استعمال کیا جاتا ہے۔" مادے کی زبردست افادیت دیکھ کر ہی کئی بین الاقوامی کمپنیوں کے مالی تعاون سے لیبارٹریوں میں گریفائن پہ تحقیق جاری ہے۔ صرف ۲۰۱۲ء میں اس پہ تین ہزار سے زائد تحقیقی مقالے لکھے گئے۔

دراصل یہ مادہ کاروبار اور صارفین، دونوں کو بے پناہ فوائد پہنچا سکتا ہے۔ مثلاً اس کے ذریعے نظریاتی طور پہ ایسا موبائل فون بنانا ممکن ہے جسے لپیٹ کر آپ پنسل کی طرح کان میں اڑس سکیں اور ایسے کریڈٹ کارڈ وجود میں آئیں گے جو موجودہ سمارٹ فون سے زیادہ پروسیسنگ قوت رکھیں گے۔ گویا ایسی الیکٹرونکس اشیا ایجاد ہوں گی جو ننھی، لچک دار اور زیادہ تیز رفتار ہوں گی۔

الیکٹرونکس ہی نہیں دیگر شعبوں میں بھی گریفائن بہت کام آ سکتا ہے۔ مثلاً اس کے ذریعے نہایت مضبوط ٹائر بنانا ممکن ہے۔ ایسے ٹائر میں کیل یا کوئی اور نوکیلی شے نہیں گھس سکے گی۔ لہٰذا وہ شاذونادر ہی پنکچر ہوں گے۔

انہی خصوصیات کے باعث حکومتیں اور نیم سرکاری ادارے بھی یونیورسٹیوں اور محققوں کو رقوم دے رہے ہیں تاکہ وہ گریفائن پر مزید تجربے کر سکیں۔ مثلاً ایک رپورٹ کے مطابق یورپین کمیشن اگلے ۱۰ برس میں اس مد پر ایک ارب یورو (ایک کھرب روپے سے زائد رقم) خرچ کرے گا۔

رکاوٹیں بھی ہیں

اگرچہ چھ محققین گریفائن کی خصوصیات کو احتیاط سے برت رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ خوبیاں ابھی صرف لیبارٹریوں میں برتی گئی ہیں، جب عملی طور پہ انھیں اختیار کیا گیا، صورت حال تبھی واضح ہوگی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ گریفائن کی خصوصیات بڑھا چڑھا کر بیان نہ کی جائیں، بلکہ حقائق سامنے لانے چاہئیں۔

◆◆◆

لفظ لفظ موتی

☆ ہجوم میں کھڑے ہو کر کبھی کسی کو نصیحت نہ کرو۔

☆ جب تک کوئی تم سے مشورہ نہ مانگے، مشورہ نہ دو۔

☆ غرض مند اور لالچی سے دوستی مت کرو۔

☆ جانوروں سے بھی پیار کرو، ان پر ظلم مت کرو۔

☆ خاموش انسان ساکن پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ (اسدق امین، واہ کینٹ)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بھوک، غربت اور لاچاری میں گندھی

روٹی

مکر و فریب کی دلدل میں پھنسے
ایک معصوم دیہاتی کا روح پرور ماجرا

سید قاسم محمود

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنے بونے والے کھیت پر بھرپور نگاہ ڈال کر پگڈنڈی پر ہولیا۔ پانچ میل کا کچا رستہ طے کر کے فیصل آباد پہنچا۔ لاہور کی لاری اسے جاتے ہی مل گئی۔ شیخوپورہ کے اڈے پر جب سواریاں ستانے نیچے اتریں تو اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، جون کے سورج کی دہکتی شعاعیں سیدھی آنکھوں پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کر اپنی مخصوص مسکراہٹ سے یونہی اڈے والوں کو دیکھا۔

ایک لڑکے نے اپنا تھال بالکل اس کی آنکھوں کے قریب لا کر آواز لگائی ''گرم پکوڑے۔'' ترغیب اپنا کام کر گئی۔ اس نے دس روپے کے پکوڑے لیے۔ پھر چادر کے پلو سے رات کی بچی روٹی نکالی جو اس نے چلتے وقت باندھ لی تھی۔ گاڑی چلنے کے بعد اس نے کھانا شروع کیا۔ وہ روٹی کا چھوٹا سا نوالہ توڑتا، دوسرے ہاتھ سے پکوڑے کی گردن یا ٹانگ توڑ کر ساتھ جوڑتا اور منہ میں رکھ لیتا۔ دس منٹ تک اس کے پوپلے منہ میں پکوڑوں کے مزے کھلتے رہے۔۔۔ آس پاس کی سواریاں حیرت سے بھولے بھالے منہ کو بچوں کی طرح چلتا ہوا دیکھ کر مسکراتی رہیں۔

آخری نوالہ حلق سے اتارتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں پر لگے ریزے صاف کیے، داڑھی پر ہاتھ پھیر کر خدا کا شکر ادا کیا، چپکے چپکے ایک طرف تک رہی تھی، مسکراتی ہوئی سواریوں پر ایک نظر ڈال خود بھی مسکرایا اور بولا ''پکوڑے مزے دار تھے۔''

لاہور میں شاہی مسجد کے قریب اتر کر وہ دیر تک گلیوں سڑکوں پر سنت نگر میں دیوسماج ہیڈ نگ کا پتا پوچھتا رہا، جہاں محکمہ بحالیات کے پٹواری بیٹھتے ہیں اور جہاں اس کی مسل آئی ہوئی ہے۔ آخر وہ اپنی منزل پر پہنچ ہی گیا۔

دیوسماج کے صدر دروازے پر ایک پہرے دار کھڑا تھا۔ کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ پھر بھی ہر کوئی کسی نہ کسی حیلے وسیلے سے اندر جا ہی رہا تھا۔ دروازے کے باہر اپنی اپنی زمینوں کے قضیے چکانے والوں کا ہجوم تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ بیسیوں عرضی نویس اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ دیر تک سہما کھڑا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کئی لوگوں سے پوچھا، کسی نے اس کی راہبری نہ کی۔ آخر ایک خوبصورت، صحت مند نوجوان جس نے سفید لٹھا قمیص اور سفید پتلون پہن رکھی تھی، قریب آ کر بولا ''بابا پریشان کیوں ہو؟''

وہ مسکرا کر کہنے لگا ''پریشان تو میں نہیں، پر پتر میری مدد کرو۔ میں بھی فیصل آباد ضلع سے آیا ہوں۔ پیچھے فیروزپور ضلع کا باشندہ ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتا، وہاں میری کوئی زمین نہیں تھی۔ ساری عمر دوسروں کی زمین واہی ہے۔ سرکار نے پتر جو زمین کاشت کاروں کو مفت دی تھی۔ میرے حصے میں تین ایکڑ آئے۔ میں نے ہی کنک اور چھولے بو رکھے ہیں۔ اب ہمارا پٹواری کہتا ہے، تیری چٹ میں باپ کا نام غلط لکھا ہے۔''

اس نے جیب سے چٹ نکال اس کے حوالے کر دی۔ نوجوان نے چٹ کی دونوں تہیں کھولتے ہوئے پوچھا ''بابا تیرا نام کیا ہے؟''

بولا ''جمال الدین ولد غلام محمد۔''

نوجوان نے کہا ''یہاں لکھا ہے جمال الدین ولد فضل بیگ۔''

بابا بولا ''اس ہی کی غلطی ہوئی ہے۔ میرے باپ کا نام غلط لکھ گیا۔ پٹواری کہتا ہے، نام ٹھیک ہو گا تو قبضہ ملے گا اور مسل لاہور سنت نگر دیوسماج ہیڈ نگ پہنچ چکی۔ بابو جی آٹھ دس دن تک فصل اٹھنے والی ہے۔ مجھے چٹ نہ ملی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

تو میں بھوکا مر جاؤں گا، فصل سرکار لے جائے گی۔"

نوجوان نے بڑی ہمدردی سے پوچھا "تم کتنے جی ہو؟"

وہ ایک جھرجھری سی لے کر انگلی کی پوروں پر گنتی کرنے لگا "ایک میں، ایک بہو، دو پوتے اور ایک پوتری۔"

نوجوان نے پوچھا "کوئی لڑکا نہیں؟"

"نہیں بابو صاحب، کوئی نہیں۔ ایک تھا وہ پچھلے برس اللہ کو پیارا ہو گیا..... اس کی مرضی! اس کا تھا، اسی نے لے لیا۔"

نوجوان بولا "بابا تیرا کام ہو جائے گا بے فکر رہ! میں یہاں پٹواری ہوں مگر دام خرچنے ہوں گے۔"

اس نے ایک کھدر کے کرتے کی اندرونی جیب سے سو روپے کے دو نوٹ، جو اس نے اسی مقصد کے لیے باقی نوٹوں سے الگ رکھے ہوئے تھے، نکالے اور بولا "لے پٹواری، اللہ تیرا بھلا کرے۔"

پٹواری نے نوٹ جلدی سے جیب میں رکھ لیے اور کہا "بابا تیرا کام ہو جائے گا۔ ہزار روپے لگیں گے۔"

بابا نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں دو سو سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

پٹواری نے کہا "بابا کسی اور پٹواری سے کام کرانا ہے اور وہ ہزار روپے سے کم نہیں لے گا۔ میرے پاس ضلع انبالہ ہے، مسل میرے پاس ہوتی تو ایک دھیلا بھی نہ لیتا۔"

بابا بولا "میں تو جی یہی دے سکتا ہوں، مرضی ہو تو مرضی ہو نہ ہو۔"

پٹواری نے بے پروائی سے کہا "تیری مرضی ہے بابا، کوئی زبردستی نہیں۔"

بابا نے کہا "زمین کا قبضہ مل جائے، فصل مل جائے تو دو سو اور بھی دے سکتا ہوں۔"

پٹواری ہنس پڑا "قبضہ مفت میں نہیں مل جاتا، پیسے خرچنے پڑتے ہیں۔"

وہ بولا "جب تک قبضہ نہ ملے، پیسے کہاں سے آئیں، ہم تو روٹی پتا نہیں کس طرح کھاتے ہیں۔"

پٹواری نے مشورہ دیا "اچھا یوں کر، تیری جیب میں جتنے پیسے ہیں، سب نکال دے، میں تیرا کام کرا دوں گا۔"

وہ کہنے لگا "تو میں واپس کیسے جاؤں گا جی؟ اگر مجھے یہاں ٹھہرنا پڑا، تو میں کھاؤں گا کیا؟"

پٹواری نے صدر دروازے کی طرف قدم بڑھا کر ترغیب پیدا کرنے کی کوشش کی "اچھا بابا، تیری مرضی۔"

وہ فوراً اپنی اندرونی جیب سے ساری رقم نکال کر گننے لگا۔

"لو پٹواری جی، یہ سو کا نوٹ اور یہ ہوئے ستر روپے! تیرا من بھاوے تو مجھے کھان پین واسطے دے دے، نہیں تو میں نے تو تجھے اپنی کل پونجی دے دی۔"

پٹواری نے اپنا پورا اطمینان کر لینے کے لیے خود اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ مایوس ہو کے وہ رقم بھی اپنی جیب میں ڈال ہنس کر پوچھا "بابا! دھوتی کی ڈب میں تو نہیں باندھ رکھے؟"

"نہیں پٹواری جی، میں کوئی بے ایمان آدمی نہیں۔"

پٹواری صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے لپک کر پوچھا "پھر پٹواری صاحب، میرا کام کب تک ہو جائے گا؟"

پٹواری نے اسے ایک طرف لے جا کر کہا "تو یوں سمجھ، تیرا کام ہو چکا۔ اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں، تجھے دو چار دن میں چٹ ڈاک سے مل جائے گی۔ تو بے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

فکر ہو کر لاری چڑھ جا۔"

اس نے پٹواری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمدردی طلب کرنے کے انداز میں کہا "میں لاری کیسے چڑھ سکتا ہوں؟ میرے پاس اب ایک پیسا بھی نہیں رہا، پٹواری جی! اس طرح کرو، مجھے اپنے گھر کا پتا بتا دو، میں شام کو معلوم کرلوں گا۔ اگر چٹ مجھے دتی مل جائے تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں پیدل چلا جاؤں گا۔" اسے پورا یقین تھا کہ وہ شام کو پٹواری سے واپسی کا کرایہ لے لے گا۔

پٹواری نے ایک پرچی پر اپنے گھر کا پتا لکھ کر اسے حوصلہ دیا "اگر پیسے مل گئے تو آج ہی دتی دے دوں گا...... ویسے مجھے امید نہیں، کئی دن لگ جائیں گے۔ بابا میری مان، تو آج ہی گھر جا۔ یہاں خواہ مخواہ ذلیل خوار ہوتا پھرے گا۔"

شام کو وہ پٹواری کے گھر وامنڈی پہنچ گیا۔ دیر تک دروازے کے باہر کھڑا رہا، پھر دودھ دہی والے سے پوچھا "پٹواری کس وقت آتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "بابا سامنے بیٹھک میں اس کا بڑا بھائی بیٹھا ہے، اس سے پوچھ۔"

وہ ڈرتے ڈرتے مکان میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی میں چند منٹ انتظار کر کے آخر اس نے بیٹھک کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی "کون ہے؟ اندر آجاؤ۔"

وہ کواڑ آہستہ سے کھول کر اندر چلا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ باہر کی چلچلاتی دھوپ سے اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ چھت پر چلتے پنکھے کی ہوا پسینے کو لگی تو جسم ٹھنڈا لگنے لگا۔ اس نے مسکرا کر پٹواری کے ہم شکل بھائی کو غور سے دیکھا جو اسے غصے سے گھور رہا تھا۔ اس نے وہیں ٹھٹک کر سلام کر کے پوچھا "ابھی پٹواری صاحب نہیں آئے جی؟"

پٹواری کے بھائی نے تنگ کر کہا "جب تجھے معلوم ہے کہ وہ ابھی نہیں آئے تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

بابا ڈر گیا، بولا "میرا مطلب ہے، وہ کس وقت آئیں گے؟"

اس نے کہا "میں نے کوئی اس کا ٹھیکا لیا ہوا ہے یا میں اس کی دم سے لگا ہوں...... چل جا کے باہر بیٹھ۔"

بابا بولا "بہت اچھا سرکار، آپ ناراض نہ ہوں۔" یہ کہہ کواڑ اسی طرح بند کر وہ چلچلاتی دھوپ میں چلا گیا۔

پٹواری کا بھائی پھر اپنے نئے ناول کی تخلیق میں مصروف ہو گیا۔ زیرِ قلم باب میں وہ ہیروئن کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نصف ناول تک وہ قارئین کا دل بہلانے کے لیے ہیروئن کو چند معاشقوں کا شکار دکھلانا چاہتا تھا۔ اصل موضوع کا اظہار دوسرے نصف حصے میں ہوتا تھا۔ وہ ہیروئن کو سچے پیار سے مایوس کر کے اس کا ضمیر بیدار کرنے روحانی سفر پر بھیجنا چاہتا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ نرس بن کر مختلف دیہات میں رہ کر سیدھے سادے دیہاتیوں کی خدمت کرے گی۔ عرصہ دراز تک ان لوگوں میں زندگی گزارنے کے بعد جب وہ واپس شہر آئے گی، تو اس کے سارے گناہ دھل چکے ہوں گے۔ غرض پہلا نصف بال بچوں کی روٹی اور دوسرا نصف حصہ فن کے لیے مخصوص تھا۔

"صبح سے تین آدمی آ چکے۔ میرے کام کے لیے پیسا اشد ضروری ہے، وقت پر پیسا نہیں ملتا تو پھر تم چیختی ہو۔"

بابا باہر گیا، تو اس نے دوبارہ قلم اٹھایا، خیالات جمع کیے اور آخری سطر پر توجہ مرکوز کی۔ وہ ہیروئن کی خوبصورتی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اظہار و شرافت کی حدود میں رکھنے والے الفاظ کی تلاش میں اس نے آنکھیں میچ لیں۔ تصورات بہت دور دور تک گئے۔ لیکن حسب منشا صحیح الفاظ نہ ملے۔ ہاں لفظوں کے اندر سے ایک عجیب و غریب چہرہ نمودار ہوا۔ لمبی سفید داڑھی، موٹی موٹی جھریاں، آنکھوں میں سدا مسکراتی سادگی، بھولا بھالا چہرہ، سر پر پگڑی، ستر پچھتر برس کی عمر اور سکون دینے والے انداز میں ایک میٹھا بول: "بہت اچھا سرکار، آپ ناراض نہ ہوں۔"

وہ قلم ہاتھ سے چھوڑ کر دوڑا دوڑا اوپر گیا اور جاتے ہی دہاڑا: "تم لوگوں نے آخر مجھے کیا سمجھا ہوا ہے۔ دن رات میری یہی ڈیوٹی رہ گئی ہے کہ پٹواری صاحب کی اسامیوں کا استقبال کرتا رہوں۔"

ماں نے پوچھا "آخر ہوا کیا؟"

بولا "صبح سے تین آدمی آ چکے ہیں۔ میرے کام کے لیے تنہائی اشد ضروری ہے، وقت پہ پیسا نہیں ملتا تو پھر تم بھگتی ہو۔"

بیوی نے ذرا سمجھانے کے لیے کہا "آدمی تو آئیں گے۔ جب انھیں یہاں کام ہوتا ہے، تو وہ یہیں آئیں گے کہیں اور کیسے چلے جائیں؟"

اس نے اپنے بال نوچتے ہوئے "اف، میں بہت غلط گھر پیدا ہو گیا۔ ادیبوں کو پٹواریوں کے گھر پیدا نہیں ہونا چاہیے۔"

ماں نے بہت آہستہ گویا اپنے آپ سے کہا "ایسے ادیبوں سے پٹواری اچھے۔"

اسے جیسے آگ سی لگ گئی، چیخا "تم تو اس کی حمایت کرو گی ہی، کیونکہ وہ تمھیں روٹی دیتا ہے.... دیکھو میں بتائے دیتا ہوں آئندہ نہ تو میرے نام سے کوئی منی آرڈر آئے اور نہ کوئی شخص میری بیٹھک میں گھسے۔ بس بہت لحاظ ہو چکا۔ بھلا غضب خدا کا، منی آرڈر بھی میرے نام سے منگواتا ہے لاٹ صاحب کا بچہ، اگر کبھی حکومت کو پتا چلا، تو جیل میں جاؤں گا، میری شہرت کرکری ہو جائے گی...... میں اس حرامزادے کا سر پھاڑ دوں گا...... اس کی شکایت کر دوں گا میں......"

وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اسے محسوس ہوا اس کی بات یہاں کون سمجھے گا۔ وہ غصہ دبا کر نیچے چلا آیا۔ یہ بڑی عجیب بات ہوئی کہ آتے وقت زینے میں اسے حسن بیان و شرافت کی حدود میں رکھنے والے بے شمار الفاظ مل گئے۔ مگر اب یہ الفاظ قلم بند کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ اس کی کرسی پہ پٹواری صاحب بڑے حاکمانہ انداز میں بیٹھے تھے۔ سامنے کرسی پہ ان کی اسامی دراز تھی جو دس روز سے مقامی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ دونوں بوتلیں پی رہے تھے۔ ناول نویس اس وقت الجھنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ الجھنے سے خیالات بھٹک جاتے تھے۔

ابھی ابھی زینے اترتے وقت جو خوش نما خیالات پکڑ کر لایا تھا، وہ انھیں بکھرنے سے بچانے کے لیے ایک کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ پٹواری صاحب نے اس کے ناول پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی پھر مسودہ اٹھا کر ساتھ والی میز پہ یوں بے نیازانہ پھینک دیا جیسے یہ واہیات چیز ہمارے تصور سے پرے رکھی گئی؟ ناول نویس نے زمین پہ گرے چند اوراق اپنے پلندے کے ساتھ بڑے پیار سے ہموار کیے اور [illegible] اپنی نفرت ظاہر کی معصومیت سے دبا کر بیٹھ گیا۔

بوتل ختم کرنے کے بعد پٹواری صاحب نے اپنا صندوقچہ نکالا جس میں ہر نمونے اور رنگ کی شیشیاں تھیں۔ مختلف نبوں کے قلم تھے اور سیاہی مٹانے والی سفیدی بھی۔ پہلے اس نے ایک ایک ورق خوب

http://www.bookstube.net/ http://www.urdutube.net/ www.pdfbooksfree.pk

کھڑکھڑاتے ہوئے اسامی کی مسل آہستہ آہستہ کھولی۔ پھر مسل میں اصل کلیم فارم آنے پر زور سے ایک دو ہتڑ جمایا اور بولا "ابھی تیرا تیاپانچا کر دیا جائے گا۔" پھر سیاہی مٹانے والی شیشی میں سے موقلم نکالا اور کلیم فارم پر سے الفاظ اور ہندسوں میں لکھے "تین سو ایکڑ" سفیدے سے مٹانے لگا۔

ناول نویس کا جی چاہا بغاوت کر کے صاف صاف اعلان کر ڈالے کہ اس مقدس کرسی سے انسانی فلاح کے خیالات کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس پر بیٹھ کر گناہ نہیں کیا جا سکتا۔ پٹواری نے سفیدہ خشک ہو جانے کے بعد اسامی کے اپنے ہاتھ سے کلیم فارم پر اصل سیاہی کے عین مطابق "تین ہزار ایکڑ" الفاظ میں لکھوائے اور ہندسوں میں بھی، پھر مسل بند کر دی۔ اسامی کا ہاتھ خودبخود اچکن کی جیب میں پہنچا۔ نوٹوں کا بنڈل پٹواری کو پیش کرتے ہوئے اس نے کہا "باقی رقم اس وقت جب تحریری پروانہ ملے گا۔"

تم دس برس سے کما رہے ہو، کیا کبھی اتنی رقم دیکھی؟ میں نے یہ دس منٹ میں کمائے ہیں۔

پٹواری نے وہ نوٹ ناول نویس کو تھماتے ہوئے کہا "والدہ کو دے دینا، اپنی طرف سے۔" ناول نویس نے نوٹ میز کے کونے پر رکھے اور اوپر اپنا قلمی پیپر ویٹ رکھ دیا۔ اسے معاً احساس ہوا کہ یہ پیپر ویٹ ناول کے اوپر رکھا جاتا ہے۔ اس نے شیشے کا گولہ وہاں سے ہٹا کر چپکے سے پھر اپنے ناول پر رکھ دیا۔

اسامی کے باہر نکلتے ہی پٹواری نے میز پر سے نوٹ اٹھائے اور بھائی کی ناک کے پاس لہرا کر بولا "تم دس برس سے کما رہے ہو، کیا کبھی اتنی رقم دیکھی؟ میں نے یہ دس منٹ میں کمائے ہیں۔"

ناول نویس نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے غصے اور نفرت کو مسکراہٹ میں چھپا لیا اور بولا "بھئی مجھے کیا دکھاتے ہو، خدا تمھیں اور دے۔"

پٹواری نے برجستہ کہا "دعا جل کر نہ دو، دل سے دو۔"

ناول نویس چڑ گیا مگر فوراً بھائی کا روپ اختیار کر لیا، کہنے لگا "دیکھو، میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ تمھارے پیشے کی روایت ہی یہ ہے کہ تمھیں بالائی آمدنی ہو، کماؤ خوب کماؤ، لیکن غریبوں کا کام جہاں تک ہو سکے، مفت کر دیا کرو، وہ بوڑھا شخص جو......"

پٹواری بات کاٹتے ہوئے بولا "میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے یا میں اسے گھر سے بلا کر لایا تھا؟"

ناول نویس بوڑھے پر ترس کھاتے ہوئے بولا "پھر بھی وہ بھولا آدمی ہے، سادہ ہے۔"

پٹواری بولا "بھولا نہیں احمق اور جاہل ہے۔ جہالت کی اسے ضرور سزا ملنی چاہیے۔ اس بے وقوف کو پٹواری نے بہکا دیا۔ بھلا اس کی مسل کا لاہور میں کیا کام؟ مسل ہوگی تو اول گاؤں میں پٹواری کے پاس ہوگی ورنہ زیادہ سے زیادہ تحصیل فیصل آباد میں۔ پٹواری خود کھانا چاہتا ہے۔ اس نے چٹ جاری کی ہے۔ جان بوجھ کر اس نے باپ کا نام لکھا۔ اب فصل کٹنے کا موقع آیا تو اسے دڑ بڑا دیا اور یہ گدھا سیدھا یہاں چلا آیا۔"

ناول نویس نے کہا "مگر تمھیں تو اسے سیدھا راستہ دکھانا چاہیے۔ اگر تم نے اس سے کچھ لیا ہے تو وہ واپس کر دو۔"

پٹواری بولا "تم بیٹھ کر اپنا ناول لکھو اور اگر ایسے ہی رحم دل ہو تو اپنی جیب سے ادا کر دو۔"

پٹواری بیٹھک سے نکل ہی رہا تھا کہ بابا آ گیا۔

www.pdfbooksfree.pk

پٹواری نے اس سے کہا "بابا تیرا کام ہو گیا۔ آج چٹ ڈاک سے بھیج دی۔ تجھے ایک دو روز میں مل جائے گی جا موج اڑا۔ سیدھا چند پہنچ جا نہیں تو چٹ گم ہو جائے گی۔"

بابا بولا "بڑی بڑی مہربانی جی' بڑی بڑی مہربانی، خداوند کریم تیرا رتبہ اور بلند کرے۔"

پٹواری دعائیں لے کر اوپر گیا، تو ناول نویس نے بابا کو اندر بیٹھک میں بلا کر کہا "بابا، ابھی تیرا کام نہیں ہوا۔ یہ سخت جھوٹا آدمی ہے، اس کے دھوکے میں نہ آنا۔"

ناول نویس پھر خود بھی بیٹھک بند کر میکلوڈ روڈ کا ایک چکر لگانے چلا گیا۔ بابا عشا کی نماز پڑھنے مسجد چلا آیا۔ نماز کے بعد جب سارے نمازی رخصت ہوئے' تو مسجد میں فقط دو آدمی رہ گئے، ایک موذن اور ایک وہ خود۔ موذن نے صفیں سمیٹ کر ایک کونے میں رکھ دیں اور قمیص اتار پنکھا ذرا تیز کر کے روٹی کھانے بیٹھ گیا۔ محلے سے اللہ واسطے کے نام کی آئی ہوئی روٹیاں اس کے سامنے تھیں اور ایک بڑا تانبے کا بغیر قلعی پیالہ جس میں گوشت، قیمہ، دال ارو، دال مسور اور ترکاریاں مل جل کر ایک عجیب سا سالن بن گئی تھیں۔ بابا پانچ گز پرے فرش پر لیٹا بار بار بھوکی نظروں سے موذن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ موذن بے چکچے نوالوں سے روٹی چبانے کی کوشش کرتے ہوئے چپڑ چپڑ کرتے وقت آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا' تو اسے محسوس ہوتا کہ ابھی وہ کہنے ہی والا ہے "آؤ بابا جی روٹی کھاؤ۔"

اسے اتنی شدید بھوک لگی ہوئی تھی کہ وہ موذن کے اسی فقرے کا بری طرح انتظار کر رہا تھا۔ آدھ گھنٹے کی مسلسل کاوش کے بعد جب موذن سے ساری روٹیاں نہ کھائی جا سکیں، تو اس نے پیالہ اٹھایا اور سارا سالن منہ لگا کر پی گیا۔ باقی روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ الماری میں رکھنے لگا، تو بابا نے کہنا چاہا، مولوی صاحب ایک روٹی مجھے دے دو، سخت بھوکا ہوں، مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ موذن نے الماری کو تالا لگا کر تالاب کے پانی سے ہاتھ دھوئے، کچھ پانی اپنے سر پر ڈالا اور عین پنکھے کے نیچے آ کر لیٹ رہا۔ بابا اپنی جگہ سے اٹھا اور موذن کے قریب ہی پنکھے کے نیچے لیٹنے لگا، تو وہ فوراً بولا "یہاں مسافروں کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔"

بابا بولا "ہمارے گاؤں میں کوئی مسافر آئے، تو ہم اسے مہمان سمجھ کر روٹی کھلاتے ہیں اور وہ مسجد میں سوتا بھی ہے۔"

موذن نے برہم ہو کر کہا "یہ شہر ہے بابا، گاؤں نہیں۔"

بابا اٹھا اور پٹواری والے مکان کے سامنے بنی دکانوں کے تھڑے پر لیٹ گیا۔ قیامت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ ہوا بالکل رکی ہوئی تھی۔ دن بھر کی تپتی زمین سے جلتے بخارات نکل رہے تھے۔ وہ جلتے ہوئے تھڑے پہ لیٹا، کروٹیں بدلتا سوچ رہا تھا کہ چٹ ملتے ہی زمین پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ پھر کھڑی فصل بھی اسے مل جائے گی۔

اسے قبضہ اور فصل ملنے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا اس بات کی کہ وہ بھی زمین والا ہو جائے گا۔ زندگی بھر وہ تیرے میرے کی زمین جوتتا رہا اور اب اس کے پاس زمین ہوگی۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس کے مرنے کے بعد دونوں پوتروں میں زمین تقسیم نہ ہو بلکہ وہ مل جل کر کاشت کریں، کھائیں لائیں۔ شدید بھوک اور گرمی کے باوجود اس کے تصورات میں بس اپنا ہونے والا کھیت بسا ہوا تھا۔ پگڈنڈی پہ اونچی پلیا پہ کھڑے ہوں تو سامنے شہتوت کے درخت تک اور دائیں ہاتھ رانا صاحب کے کنوئیں اور بائیں ہاتھ راجباہ تک! تھوڑی دیر بعد اسے کسی نے

www.pdfbooksfree.pk

جگایا، کوئی اس سے سرگوشی میں کہہ رہا تھا ''بابا! ابھی ترا کام نہیں ہوا، یہ سخت جھوٹا آدمی ہے۔ اس کے دھوکے میں نہ آنا۔'' وہ ساری رات اسی طرح انگاروں پر لوٹتا رہا۔

دوسرے دن نماز فجر پڑھتے ہی وہ دیوسماج کے دروازے پر جا بیٹھا۔ رفتہ رفتہ اپنی اپنی زمینوں کے قضیے چکانے والوں کا ہجوم ہوگیا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ بیسیوں عرضی نویس اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ کبھی عرضی نویسوں کے پاس دیوار کا سہارا لے کر بیٹھتا، کبھی ہجوم میں غائب ہو جاتا۔ پٹواری باہر آتا تو لوگوں کی اوٹ میں ہو جاتا، وہ اس پر اپنی موجودگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے تو کل ہی کہہ دیا تھا کہ چٹ ڈاک سے بھیجی جا چکی۔ پھر بھی پٹواری کے بھائی کی بات سن کر وہ سچ اور جھوٹ میں سے ایک کی تصدیق چاہتا تھا۔ دفتر بند ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ایک نیلی پتلون والا پٹواری اس کے پاس آیا اور بولا ''بابا پریشان کیوں ہے؟''

بابا نے سارا ماجرا سنایا۔ ساتھ ہی وہ کاغذ بھی دکھایا جس پر کل والے پٹواری نے اپنے گھر کا پتا لکھا تھا۔ آج کا پٹواری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ پہلے سے سفید قمیص پتلون والے پٹواری کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت فراہم کرنے کی فکر میں تھا۔ اس نے ایک عرضی نویس سے اس مفہوم کی درخواست لکھوائی کہ جناب تحصیل دار صاحب، آپ کے فلاں پٹواری نے مجھ غریب و نادار پردیسی پناہ گزین کے اتنے پیسے ہتھیا لیے ہیں۔ مہربانی کر کے اس کے خلاف کارروائی کی جائے اور میرے پیسے واپس دلائے جائیں۔ درخواست کے آخر میں اس نے بابا کا انگوٹھا لگوایا۔ پھر اسے اپنے ساتھ اندر لے جانے لگا تاکہ وہ تحصیل دار کی خدمت میں بہ نفس نفیس حاضر ہو کر درخواست پیش کر دے۔

بابا نے کہا ''پٹواری جی میں ایسا نہیں کروں گا، شریعت میں ہے کہ آدمی کو تین مرتبہ مہلت دو۔ اگر اس نے کل تک میرا کام نہ کرایا یا پیسے واپس نہ دیے تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔ میں بہت خراب آدمی ہوں، جھوٹے آدمی کو ننگا کر دیتا ہوں۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں، کل شکایت کروں گا۔'' یہ کہہ کے اس نے درخواست تہ کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

دفتر بند ہونے کے بعد وہ کافی دیر دیوسماج کے باہر بیٹھا رہا۔ سب لوگ چلے گئے، عرضی نویس بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا ''اچھا بچہ، شام کو تو گھر آئے گا ہی، وہاں پکڑوں گا۔'' وہ چلچلاتی دھوپ میں ایک ایک موڑ پر لوگوں سے پتا پوچھتا کواٹنڈی کی اسی گلی میں پہنچ گیا۔ بہت دیر تک تھڑے پر بیٹھا رہا، جب دھوپ اس کی ٹانگوں تک آ گئی، تو وہ اٹھا اور مسجد چلا گیا۔ ابھی نماز عصر میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

وہ پگڑی فرش پر رکھ تالاب کے کنارے جا بیٹھا۔ پہلے اس نے اپنی ٹانگیں ٹھنڈی کیں، پھر سر کے بال بھگوئے۔ موذن اذان دینے منار پر چڑھا، تو اس نے وضو شروع کیا۔ ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی ڈالنے کے بعد منہ صاف کیا، غرارے کیے۔ تیسری مرتبہ پانی منہ میں ڈالا تو بجائے کلی کرنے کے نگل گیا۔ ٹھنڈے پانی نے سینہ تر کر دیا۔ پھر تو وہ دونوں ہاتھوں سے چلو بھر بھر کے غٹا

نہ بابو تیرے سالن سے روٹی نہ کھاؤں گا، اس میں تیرا نمک ہے۔ اگر میں نے یہ نمک کھا لیا، تو پھر میں اس گھر کے خلاف شکایت نہیں کر سکتا۔

www.pdfbooksfree.pk

غٹ پانی پینے لگا۔ طبیعت کچھ سنبھل رہی تھی۔ جب بالکل ہی گنجائش نہ رہی تو اس کی گردن آپ ہی آپ اوپر کو اٹھی۔ اس نے زور کی لمبی ڈکار لی، منہ میں پکوڑوں کا مزا آگیا۔ بولا، ''سبحان اللہ، سبحان اللہ بھوک بھی کیسی عجیب شے ہے۔'' پھر نئے سرے سے خوشی خوشی ہاتھ دھوئے اور وضو مکمل کیا۔

نماز پڑھ کر وہ ناول نویس کی بیٹھک کے آس پاس ٹہلنے لگا۔ اس وقت وہ بڑے غصے میں تھا۔ وہ جلد از جلد پنواری کو پکڑ کر دوٹوک فیصلہ چاہتا تھا۔ کبھی گلی کے موڑ پر دیکھتا، کبھی بیٹھک کی کھڑکی میں سے پنواری کے بھائی کو گھورتا۔ ناول نویس اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر مشتعل تو نہ ہوا مگر خیالات کی ڈوری اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

آج کے باب میں وہ ہیرو ئن کو پہلے عاشق کے ساتھ پہلی بار شہر کے معروف باغ میں لے گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ سیر و تفریح کے لیے آئے جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خراماں خراماں باغ کے اندرونی احاطے کی طرف جا رہے تھے۔ ہیرو نے اپنا ہاتھ ہیرو ئن کے کندھے پر رکھا ہی تھا کہ ناول نویس کو بابا کی شکل نظر آگئی۔ اسے غصہ یوں نہیں آیا کہ اس وقت بابا کی شکل اسے اچھی لگی۔ وہ ہیرو اور ہیرو ئن کو اب ایک درخت کے نیچے بٹھانا چاہتا تھا۔ پھر ایسے رومانی جملے لکھتا کہ ناشر انھیں پسند کرے اور اس کا ضمیر بھی مطمئن رہے۔

اس نے ناول بند کر الماری میں رکھا۔ اوپر کیا جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کیے اور نیچے اترے۔ بابا نے آگے بڑھ کر پوچھا ''پنواری صاحب کس وقت آئیں گے بابو جی۔''

جواب دیا ''بس آتے ہی ہوں گے۔'' اس نے پھر غور سے بابا کی طرف دیکھا تو اسے اپنے دل میں ہمدردی سی محسوس ہوئی۔ اس نے بیٹھک سے چھوٹی چارپائی نکال دیوار کے سائے میں بچھائی اور بولا ''بابا لیٹو بیٹھو آرام کرو۔''

بابا نے بے حد ممنونیت کے ساتھ کہا ''بڑی بڑی مہربانی جی، بڑی بڑی مہربانی۔'' ناول نویس کو شدید جذبات سے بھرا جملہ سن کر عجیب و غریب خوشی محسوس ہوئی۔

وہ پھر میکلوڈ روڈ کے اس ہوٹل میں پہنچ جہاں شام کے وقت ہم عصر ادیب چائے پیتے تھے۔ ہوٹل پہنچا تو حسب معمول ادیبوں کا دل پسند موضوع چھڑا ہوا تھا، یہی کہ ہمارے ملک میں بے حد غربت ہے، بھوک ہے، بیماری ہے، جہالت ہے۔ وہ خاموش بیٹھا ادیب بھائیوں کے پرجوش دلائل سنتا رہا۔ اقتصادی نظام میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ سرمایہ داروں سے ساری دولت چھین کر مزدوروں اور کسانوں میں تقسیم کر دینی چاہیے۔ دولت کے وسائل کی مساوی تقسیم کے بغیر ملک میں خوش حالی نہیں آسکتی۔ وغیرہ وغیرہ۔

اچانک اسے دورہ سا پڑا اور بجلی سی آنکھوں کے آگے کوند گئی۔ بابا کی بھولی بھالی صورت سے اس کا تصور ٹکرا کر ملک کے کھیتوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں چلا گیا۔ دور دور تک پھیلے کھیتوں کے سلسلے اور ان میں کام کرتے لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے۔ اس نے جھرجھری لی اور اپنے آپ سے کہا ''یہ کتنا اچھا ہو، اگر میری ہیرو ئن نرس بن کر جگہ جگہ دیہات میں پہنچے، تو وہ اقتصادی انقلاب کے بارے میں میرے خیالات کی علامت بن جائے گی۔ کھیتوں سے زیادہ پیداوار کم سے کم محنت میں حاصل کرنے کے لیے وہ میرے نظریات کی تبلیغ کرے۔''

مگر اسے فوراً اپنی اس کمزوری کا احساس ہوا کہ آج

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

تک اس نے کھیت نہیں دیکھے تھے۔ ایک سے دوسرے شہر جاتے وقت گاڑی کی کھڑکیوں میں سے تو کھیت نظر آتے لیکن سچ مچ کے جیتے جاگتے کھیتوں میں، جن کے اندر سے آدمی کا رزق نکلتا ہے، اس نے آج تک چل کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے خیال آیا کہ بابا سے تعلق قائم کیا جائے۔

''دو چار دن اس کے گاؤں رہنے سے میں دیہی زندگی کے مسائل کا مشاہدہ کر سکوں گا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا کہ سوکھی گندم کی دانہ گندم میں جانے سے گل و گلزار کس طرح ہوتی ہے۔ پھر ناول میں ہیروئن کی نصف زندگی دیہی شفا خانوں کی میں بسر ہوتی ہے۔''

وہ بڑے بے تکلف انداز میں اپنے ہم عصر ادیبوں سے ہاتھ ملا کر جلدی جلدی گھر واپس آیا۔ بابا سر کے نیچے پگڑی اور دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے چارپائی پر لیٹا تھا۔ ناول نویس اس کے قریب گیا تو بابا احتراماً اٹھ بیٹھا۔

بابا نے پوچھا ''کیوں باؤ جی، پٹواری صاحب کس وقت آئیں گے؟ رات ہو گئی ہے، اب تک تو آئے نہیں۔''

ناول نویس بولا ''اوہو مجھے یاد آیا بابا، وہ آج نہیں آئے گا۔ آج ہفتہ ہے۔ وہ ہفتے کی رات اپنے یار دوستوں کے ساتھ رہا کرتا ہے۔ کل صبح آئے گا۔''

بابا بالکل مایوس ہو گیا ''یہ تو بہت بری بات ہوئی۔ اب کیا ہو گا؟''

ناول نویس نے ترس کھا کر پوچھا ''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔''

بابا تڑپ کر بولا ''ظالمو، خدمت کیا ہوتی ہے؟ مجھے روٹی تو کھلا دو، یہ شہر کیسا ہے، یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟ دو دن سے بھوکا پھر رہا ہوں۔ تیرے بھائی نے میرا ایک ایک پیسا چھین لیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بھوک نہیں اٹھائی۔ ساٹھ برس اپنے ہاتھ سے ہل چلایا ہے۔ اور دیکھ لے کہ میں دنیا کا سب سے غریب آدمی ہوں، پر مجھے دو وقت کی روٹی ہمیشہ ملتی رہی۔ دو دن میں کبھی بھوکا نہیں رہا۔ روٹی کا ٹکڑا تو کتے کو بھی دے دیتے ہیں۔''

ناول نویس کو ایک دم جھٹکا لگا۔ وہ چکرا گیا اور پھر دوڑتا ہوا اوپر گیا۔ اجلے دستر خوان میں چھ روٹیاں رکھیں اس خیال سے کہ دیہاتیوں کا پیٹ بڑا ہوتا ہے۔ پلیٹ میں سالن ڈلوایا۔ شیشے کے گلاس میں پانی لیا اور یہ سب چیزیں صاف ستھری ٹرے میں سجا کر نیچے اترنے لگا۔ زینے کے اندھیرے میں اسے محسوس ہوا کہ قدرت اپنا انتقام ترت لے لیتی ہے۔ کل جس شخص کو میں نے جانوروں کی طرح دھتکار دیا تھا، آج اسی کے لیے وہ کھانا لیے جا رہا ہے۔ اور کھانا بھی کیا، رشوت کی کمائی سے خریدی ہوئی گندم اور سبزی! ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپکا اور اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

اس نے ٹرے بابا کے سامنے رکھی۔ بابا نے جلدی سے دستر خوان کھول کر اوپر کی روٹی اٹھائی۔ دستر خوان اسی طرح رکھا رہا اور بڑے ناول نویس کی طرف مڑ کر بولا ''بس باؤ جی، میں نے اپنی قسمت کا حصہ لے لیا۔'' پھر ایک نوالہ توڑا اور پوپلے منہ میں چبانے لگا۔ سامنے والے کھمبے کی روشنی میں ناول نویس نے اس کی آنکھوں میں کچھ تڑپتے ہوئے دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ صدیوں سے بھوکا تھا۔

بابا نے دوسرا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ''مجھے اس وقت روٹی نہ ملتی تو شاید صبح تک مر جاتا۔ بڑی سخت بھوک لگی تھی۔ اپنی زندگی میں اتنی بھوک کبھی نہیں لگی۔''

ناول نویس نے سالن کی پلیٹ اس کے قریب کرتے ہوئے پیار کے ساتھ کہا ''بابا، سالن سے کھاؤ۔''

بابا نے پلیٹ اٹھا کر پھر ٹرے میں رکھ دی۔

www.pdfbooksfree.pk

ناول نویس نے اصرار کیا "لو نا بابا، تکلف نہ کرو، اسے اپنا گھر سمجھو۔"

بابا بولا "نہ بابو تیرے سالن سے روٹی نہ کھاؤں گا، اس میں تیرا نمک ہے۔ اگر میں نے یہ نمک کھا لیا، تو پھر میں اس گھر کے خلاف شکایت نہیں کر سکتا۔ روٹی کی بات اور ہے، یہ خدا کی دی ہوئی چیز ہے۔ میں نے مانگ کر کھا لی۔ سالن انسان کی بنائی چیز ہے۔ اور یہ میں بتا دوں بابو، تیرے بھائی کی شکایت ضرور کروں گا، چھوڑوں گا نہیں، اس نے مجھے ستایا ہے، میں اسے ستاؤں گا۔"

ناول نویس بالکل نئی دنیا میں داخل ہو رہا تھا...... نئی بصیرت، نیا شعور جہاں انقلابی تبدیلی پیدا کرتی ہے، وہ کھیت یا جنگل نہیں، انسان کا دل ہے۔ روٹی کی اصل قیمت کا اسے علم ہوا۔ اس کے سارے نظریات خیالات بکھر گئے۔ آدھی رات تک وہ اوپر والے کوٹھے پر بے قراری سے ٹہلتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں اپنی کہانیوں میں ایسا کردار کبھی تخلیق نہیں کر سکتا جس میں اتنی عظمت ہو اور جب میں ایسا نہیں کر سکتا تو پھر کہانیاں لکھنے کا کیا فائدہ؟ روٹی تو میں کوئی اور پیشہ بھی اختیار کر کے کما سکتا ہوں جس میں محنت بھی کم اٹھانی پڑے گی۔ میں کہانی لکھنے کے سوا کچھ اور کوئی کام نہیں کر سکتا مگر روٹی کمانے کے لیے اپنے کرداروں کو پست سطح پر لے جانا حد درجہ گھٹیا ہے۔ اگر میں کہانی نویسی ترک بھی کر دوں تو پھر......

وہ اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا، نیچے بابا جمال اپنی چارپائی پر لیٹا کروٹیں بدل رہا تھا۔ گلی میں چار پانچ چارپائیاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بچھی ہوئی تھیں۔ چوکیدار تھوڑی تھوڑی دیر بعد لاٹھی ٹیکتا بابا کے قریب سے گزرتا اور گلی کے دوسرے کونے پر جا کر واپس لوٹتا۔ ہر بار اسے یوں محسوس ہوتا کہ بابا اسے روک کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ آتا اور گزر جاتا۔ ایک دفعہ وہ قریب آ رہا تھا تو بابا اٹھا۔ اس نے پگڑی باندھی، پرانی جوتیاں پہنیں، چارپائی پٹواری کی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور جیب سے اس کی شکایت نکال کر پھاڑنے لگا۔

چوکیدار نے قریب آ کر پوچھا "بابا کیا بات ہے؟"

بابا نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا "کوئی بات نہیں۔"

چوکیدار اپنا سا منہ لیے گلی کے دوسرے سرے تک بڑھتا چلا گیا۔ بابا شکایت کے ننھے ننھے پرزے کرتا رہا۔ واپسی پر چوکیدار اس کے برابر سے گزرا تو بابا نے کہا "چوکیدار! یہ کنجی پٹواری صاحب کی ہے، میں نے تجھے سونپی، صبح اس کو حفاظت سے دے دینا۔" پھر اس نے منہ اٹھا کر دروازے کو مخاطب کیا "اچھا پٹواری صاحب، ہم نے اپنا معاملہ خدا کو سونپا۔"

یہ کہہ کر وہ گوالمنڈی سے نکل کر میو اسپتال کے چوک میں آ گیا۔ پھر تانگے والوں سے پتا پوچھتا پوچھتا دریا کے پل پر نکل آیا۔ وہاں سے سیدھا راوی کے پل پر پہنچا۔ پھر شاہدرے کے موڑ پر چائے والے سے پوچھ کر فیصل آباد جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ آہستہ آہستہ وہ بڑھتا گیا۔ چاروں طرف ہو کا سناٹا تھا۔ قیامت کی گرمی اور غضب کا اندھیرا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے کالے کالے درخت تھے۔ درختوں سے پرے دور دور تک کھیتوں اور باغوں کے سلسلے پھیلے تھے، نہریں اور جھیلیں تھیں۔ پہاڑ اور دریا تھے، قصبے اور بستیاں تھیں، مگر بابا کو اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا، سوائے اپنے بونے والے کھیت کے!

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

انسان کبھی آسانی سے نہیں بن پایا

ایماندار

اس شخص کا قصہ جو خیر و شر
کی پہلی لڑائی میں تو فتح یاب ٹھہرا
مگر دوسری سب کچھ ملیامیٹ کر گئی

سلطان جمیل نسیم

تیس برس پہلے ایسا ہوا تھا کہ میں اڑا دینے والی تیز ہوا کی زد سے نکل کر ایک پناہ گاہ میں پہنچ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس زمانے میں دسویں کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک دن پڑھتے پڑھتے دماغ شل ہو گیا۔ نظریں پتھرا گئیں۔ کتابیں کھلی ہوئی قبریں معلوم ہونے لگیں اور لفظ بے جان لاشیں۔ تب میں اپنے کمرے کی گھٹی ہوئی فضا سے گھبرا کے باہر نکلا۔ کچھ دیر گھر کے چھوٹے سے صحن میں کھلے آسمان کے نیچے کھڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پھر بغیر کسی ارادے کے باہر نکل آیا اور ٹہلتا ہوا اسٹیشن تک آ گیا۔

چھوٹے شہروں میں [illegible] تفریح گاہ ریلوے اسٹیشن ہی ہوا کرتا تھا (یا شاید اب بھی ہو) کہ فرلانگ بھر چلے اور پہنچ گئے۔ کسی ریل کے آنے کا وقت ہوا، تو مسافروں کی چہل پہل دیکھ کر تکان رفو چکر ہوئی۔ ورنہ ویران اسٹیشن، دو چار آوارہ کتے، نیم غنودگی کے عالم میں کسی بینچ پر لیٹا ہوا خوانچہ فروش یا مسافر، بس! اگر یہی ویرانی پلاٹنگ پیپر کی طرح [illegible] اور بیزاری چوس لیتی۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اگر اتفاق سے ایکسپریس کے آنے کا وقت ہوا، تو سماں ہی دوسرا نظر آتا۔ ریل کے رکنے کا وقت دو چار منٹ مگر معلوم ہوتا کہ گاڑی ساری زندگی یہیں ٹھہری رہے گی۔ آنے جانے والوں کے لیے دگنی تعداد میں قلی موجود۔ خوانچہ فروشوں کی آواز میں اشکارے مارتی ہوئی امید۔ ریلوے کا مختصر مگر متحرک عملہ..... شہر بھر کے تانگے یوں تو مسافر گاڑیوں کی آمد پر جمع ہو ہی جاتے تھے، لیکن ایکسپریس کے وقت ان کی چونچالی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ سواریوں کو لبھانے کے لیے بنے سنورے تانگوں کے پائدانوں پر کھڑے ہو کر ایسی آوازیں لگاتے جیسے روٹھی قسمت منا رہے ہوں۔ اس وقت شہر کے چند منچلے بھی اپنے صاف ستھرے لباس میں اسٹیشن پر ضرور موجود ہوتے۔ وہ زنانے ڈبوں کے سامنے سے بار بار گزرتے وہیں رک کر آپس میں باتیں کرتے۔ جیب سے کنگھی نکال کر بالوں پر پھیرتے۔

میں جب اسٹیشن پہنچا، تو ایکسپریس کو روانہ ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی۔ وہاں پھیلی ہوئی رونق نے ابھی پوری طرح اپنی صورت نہیں بدلی تھی۔ میں جاتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہوا سیمنٹ کے تھڑے پر جا بیٹھ گیا جو کثرت استعمال سے خاصی چکنی ہو گئی تھی۔ اس تھڑے پر بیٹھے ہوئے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ مجھے احساس ہوا جیسے میرے پیروں کے پاس کچھ ہے۔ شاید کوئی خارش زدہ کتا یا سہمی ہوئی بلی۔

میں نے بے اختیار اپنے پیر سمیٹ کر اوپر اٹھا لیے اور جھک کر دیکھا۔ آنکھیں یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ وہاں ایک پلاسٹک کی ٹوکری رکھی تھی۔ بلا ارادہ میں نے اٹھا کر اپنے قریب رکھ دی۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور ایک کرمچ کی گیند اوپر ہی رکھی دکھائی دی۔ اس میں پڑی ہوئی دوسری چیزیں دیکھنے سے پہلے میں نے ریلوے اسٹیشن پر نظر دوڑائی۔ ذرا دیر پہلے کی رونق کو نگل کر ویرانی اس طرح انگڑائی لے رہی تھی جیسے کوئی درندہ شکار سے پیٹ بھرنے کے بعد پاؤں پھیلا کر سوتا ہے۔

میں نے گیند اٹھا کر ٹوکری میں چونکا تو مجھے زنانہ پرس کی جھلک دکھائی دی۔ دل چاہا کہ پرس کو فوراً نکال لوں مگر اپنی خواہش پر جلد قابو پا لیا۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں پرس کے اوپر رکھ گئیں، تو ایک میلے سے دوپٹے میں لپٹے ہوئے دو سینڈل بھی نظر آئے۔ میں نے کرمچ کی گیند ٹوکری میں رکھی۔ مڑ کر دیکھا، اندھیرا پھیل رہا تھا اور اسٹیشن کے باہر کھڑے دو ایک تانگوں کی ٹمٹماتی بتیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں اٹھا، ٹوکری کو اٹھایا اور جس راستے سے آیا تھا، اس کی مخالف سمت چلنے لگا۔ پلیٹ فارم ختم ہوا۔ کچا راستہ..... پھر ٹوٹی ہوئی دیوار..... پھر ویران سڑک..... پھر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی گلی۔ پھر میرا گھر..... اپنے گھر میں چوروں کی طرح داخل ہوا۔ کمرے میں پہنچا۔ دروازہ بند کرکے لالٹین کی بتی اونچی کی۔ ہاتھ میں اٹھائی ٹوکری کو چارپائی پر رکھا۔ پہلے گیند نکالی۔ پھر اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں، پھر زنانہ پرس کھولا۔

اس میں دو سونے کی چوڑیاں تھیں..... ایک تڑے مڑے پوسٹ کارڈ کے ساتھ دس دس روپے کے چند نوٹ۔ کچھ ریزگاری، دو ہیئر پن..... پرس میں سے کوئی چیز نکالے بغیر میں نے اسے چارپائی پر رکھا۔ دوپٹے میں لپٹے ہوئے سینڈل بھی ٹوکری سے نکالے۔ اب کسی بچے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کی نیکر اور قمیص کے سوا اس میں کوئی اور چیز نہ تھی۔

میں نے پرس اٹھا لیا۔ اس میں سے نوٹ نکالے۔ چھے نوٹ تھے۔ ان نوٹوں کے ساتھ وہ تڑا مڑا پوسٹ کارڈ بھی باہر آ گیا۔ میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی..... ساٹھ روپے..... اتنی تو ابا کی پنشن ہے۔ سارا گھر چلتا ہے اس پر! اماں نے میری امتحانی فیس دینے کے لیے پتا نہیں کب کی جمع جتھا نکالی تھی۔ وہ بھی ان ہی ساٹھ روپوں میں سے بچت کر کے رکھی ہو گی..... یہ دو چوڑیاں بھی ہیں، یہ اماں کو دے دوں گا۔ لیکن کیا کہہ کر؟ اور یہ ہیں کس کی؟! اس نوکری سے تو کچھ اتا پتا نہیں چل رہا۔

اللہ میاں شاید اسی طرح غیب سے دیتے ہیں۔

اماں چوڑیاں پہن کر کتنی خوش ہوں گی۔ مگر جو انھوں نے پوچھ لیا کہ کہاں سے آئیں؟ نہیں ابھی چھپا لوں۔ میٹرک کے بعد نوکری کروں گا، پہلی تنخواہ کے ساتھ اماں کو دوں گا۔

> جب میں ان کے گھر سے نکلا، تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں تیز ہواؤں کی زد سے نکل کر دوبارہ [illegible] میں آ گیا ہوں

کچھ دیر تک میں سوچ میں ڈوبا رہا۔ چوڑیاں ہتھیلی پر رکھ کر ان کے وزن کا اندازہ کرتا رہا۔ پھر انھیں پرس میں رکھا۔ پھر پرس میں رکھتے رکھتے ہی وہاں سے پاس پڑا ہوا وہ پوسٹ کارڈ بھی اٹھا لیا۔ ارادے اور تجسس کے بغیر اس کی سلوٹیں درست کیں۔ پتا پڑھا۔ ارے یہ تو عزیز بھائی کے نام ہے۔ ہاں ولدیت کے ساتھ ان کا پتا لکھا ہے۔ ان کے باپ کا نام رحیم الدین ہے اور یہ کارڈ جہاں بھیجا گیا ہے، آج کل عزیز بھائی وہیں تو ملازمت کر رہے ہیں۔ یہاں اسی محلے میں تیسرا مکان ہے ان کا.....

خط کا مضمون پڑھا۔ ان کے والد کی طرف سے تھا۔ دو مہینے پہلے کی تاریخ..... کیا وہ چھٹی پر آئے ہوئے تھے اور آج چھٹیاں ختم کر کے گئے؟ ان کا ایک بیٹا ہے، دو ڈھائی سال کا، یہ نیکر، یہ قمیص، یہ گیند اسی کی ہو گی..... اور یہ چوڑیاں ان کی بیوی کی۔ ان کے والد میرے ابا کے دوست ہیں۔ دن ڈھلے دونوں ہر روز ملتے ہیں۔ اماں تو یہ چوڑیاں پہچان لیں گی۔ اگر اماں نہ بھی پہچانیں اور ان لوگوں نے اماں کو پہنے دیکھ لیا؟ یہ ساٹھ روپے، یہ تو خیر میرے بہت کام آئیں گے۔ مگر ان سینڈلوں کا کیا ہو گا، کہاں پھینکوں گا ان کو..... اور اس قمیص اور اس نیکر کو..... اور اس ٹوکری کو۔

میں نے پیسے اور پوسٹ کارڈ پرس میں رکھے۔ پرس کو اسی طرح ٹوکری میں ڈالا۔ بالکل پہلے کی طرح اوپر گیند اور کاغذ میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دروازہ بند کرنے سے حبس ہو گیا تھا۔ پسینا بہنے لگا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ہوا کمرے میں آئی تو لالٹین میں جلتی ہوئی لو ذرا تھرتھرائی اور جب ہوا ساکن ہوئی تو پھر پہلی طرح ایک سی لو دینے لگی۔ میں ٹوکری اٹھا کر جب عزیز بھائی کے گھر پہنچا، تو وہ چبوترے پر موجود تھے اور ان کے والد ابا کے ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر ابا نے پوچھا "کیا ہے؟"

میں نے آہستہ سے کہا "میں اسٹیشن گیا تھا۔ وہاں بنچ کے ساتھ یہ ٹوکری رکھی تھی۔ یہ شاید عزیز بھائی کی ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

یہ سنتے ہی ان کے والد نے میرے ہاتھ سے نوکری جھپٹ لی۔ چیزوں کو الٹ پلٹ کے دیکھا اور کہا "ہاں، اسی کی ہے، آج ہی تو ایکسپریس سے گیا ہے۔ بہو ہماری بڑی بے پروا ہے..... دیکھو، نوکری اسٹیشن پر چھوڑ دی۔ کسی اور کے ہتھے چڑھ جاتی، تو..... پتا نہیں کیا کیا رکھا ہے اس میں..... لے بیٹے..... اندر جا کے اپنی چاچی کو دے آ۔"

جب میں ان کے گھر سے نکلا، تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں تیز ہواؤں کی زد سے نکل کر دیوار کی آڑ میں آ گیا ہوں۔

دوسری مرتبہ آج..... آج جب کہ میرا بیٹا ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ بیٹی اپنے گھر میں خوش و خرم ہے۔ باقی بچے بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور میں اپنی ملازمت سے آنے کے بعد ٹیوشن بھی پڑھانے لگا ہوں۔

ٹیوشن کا قصہ یوں ہے کہ انسان کی ضرورتیں جب پاؤں پسارتی ہیں، تو آمدنی کی چادر سکڑ جاتی ہے۔ میں نے اپنی سرکاری ملازمت کے دوران شادی کی..... بچوں کا خرچہ اٹھایا..... قرض کے فرض سے سبکدوش ہوا..... لیکن کبھی محسوس نہیں کیا کہ آمدنی کم ہے یا کوئی ضرورت پوری ہونے سے رہ گئی۔

مگر جب بچوں نے میرے پھٹے ہوئے کوٹ کو نظر انداز کر کے نئی یونیفارم کا تقاضا کیا، بیوی نے مہینے سے پہلے تنخواہ ختم ہو جانے پر پہلے حیرت ظاہر کی، پھر احتجاج شروع کیا، تو مجھے احساس ہوا کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ سر ڈھکنے سے پاؤں کھلنے لگے ہیں۔ چناں چہ ٹیوشن پڑھانے لگا۔ وکیل صاحب کے دو بچوں کو پڑھانے جاتا ہوں۔ ایک بینک افسر کی بیٹی کو پڑھاتا ہوں۔ یوں ضرورتوں کے منہ میں لگام ڈال دی۔

ان تین بچوں کو پڑھاتے ہوئے جب ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا، تو وکیل صاحب کی پرزور سفارش پر میں ارشد کے والد سے ملا جنھوں نے بہت ہی ملتجیانہ لہجے میں اپنے بیٹے کو پڑھانے کی درخواست کی۔ میں نے بھی یہ سوچ کر کہ وکیل صاحب کے گھر سے واپسی پر راستے ہی میں ان کا مکان ہے، اقرار کر لیا۔

میں نے فیس کبھی طے نہیں کی۔ خدا کا شکر ہے کہ معاوضہ ہر جگہ سے معقول ہی ملا۔ مہینا بھر پڑھانے اور بچوں کی باتوں سے گھریلو حالات کا اندازہ لگانے کے بعد اپنے ذہن میں فیس کا تعین کر لیتا۔ اور ہمیشہ توقع سے زیادہ پایا۔ ارشد کو بھی چند روز پڑھانے کے بعد میں نے اندازہ کر لیا کہ یہاں سے تیس چالیس روپے سے زیادہ نہیں ملیں گے۔ مہینے کے اختتام پر ارشد نے ایک بند لفافہ لا کر دیا۔ میں نے عادت کے مطابق کھولے بغیر جیب میں رکھ لیا۔ گھر جا کر دیکھا تو پچاس روپے تھے۔

بیوی نے بڑی ناک بھوں چڑھائی کہ وکیل صاحب تو دو بچوں کے ڈھائی سو روپے دیتے ہیں۔ دوسری جگہ سے بھی ایک بچی کو پڑھانے کے ڈیڑھ سو ملتے ہیں اور یہاں سے صرف پچاس روپے! بیوی کے کہنے سے فیس مجھے بھی کم معلوم ہوئی۔ لیکن یہ سوچ کر خاموش رہا کہ ارشد کے والد کسی نجی ادارے میں معمولی درجے کے ملازم ہیں اور میں اپنی دونوں جگہ کی ٹیوشن کے مقابلے میں یہاں نصف وقت بھی نہیں دیتا۔ پھر وکیل صاحب کی سفارش بھی ہے۔

دوسرے مہینے بھی یہی ہوا۔

کل تیسرے مہینے کے اختتام پر جب ارشد نے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

مجھے لفافہ دیا، تو گھر آنے کے بعد اسی طرح وہ بیوی کے سپرد کر دیا۔ جب ہاتھ منہ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھا، تو بیوی نے کہا ''جس حساب سے مہنگائی بڑھتی ہے اور خرچہ بڑھتا ہے۔ تنخواہ کیوں نہیں بڑھتی؟'' میں ہنس دیا۔

وہ بولی ''آج کلثوم کا خط آیا ہے۔ اتوار کو آ رہی ہے۔ اسی مہینے کو بچوں کی امتحانی فیس بھی جاتی ہے۔ یہ دو ڈھائی سو روپے کا خرچہ ہے اور فیس بڑھتی ہے صرف دس روپے۔''

''دس روپے! کس کی فیس بڑھی ہے؟''

''آج جو لفافہ دیا ہے اس میں ساٹھ روپے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے لفافہ نکالا۔ دس دس روپے کے چھے نوٹ تھے۔ میں نوٹ گننے کے بعد خاموش ہو گیا۔ وکیل صاحب نے بھی جب فیس بڑھائی تھی، تو اسی طرح لفافے میں پچاس روپے کا اضافہ کر دیا تھا۔ مگر وکیل صاحب نے تو سال بھر کے بعد اضافہ کیا تھا۔ تین ہی مہینے دس روپے بڑھا دینے پر مجھے حیرت اس لیے نہیں ہوئی کہ میں نے ان تین مہینوں میں کم وقت دینے کے باوجود ارشد پر پوری توجہ دی تھی۔ جن مضامین میں وہ کمزور تھا خاص طور پر ان پر۔ اب وہ اپنی ذہانت اور میری محنت کے باعث جماعت کے اچھے طالب علموں میں شمار ہونے لگا تھا، تو ممکن ہے کہ سہ ماہی رپورٹ دیکھنے کے بعد اس کے والد نے یہ اضافہ کیا ہو۔ ویسے آج کل کے زمانے میں ساٹھ روپے میں کون پڑھاتا ہے۔

آج جب میں وکیل صاحب کے بچوں کو پڑھانے کے بعد ارشد کے گھر پہنچا، تو وہ دروازے پر میرا منتظر تھا۔ مجھے لے جا کر اسی کمرے میں بٹھایا جہاں وہ ہمیشہ پڑھتا ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ آج اس کی توجہ پڑھائی کی طرف روز جیسی نہیں، وہ بار بار بند دروازے کو دیکھ رہا ہے۔

دو کمروں کے اس مکان میں، ارشد اپنے والدین اور چھے بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کی عمر بارہ برس کے لگ بھگ ہے، لیکن اپنی عمر کے بچوں کے مقابلے میں وہ بہت سنجیدہ ہے۔ میں اس وجہ سے واقف ہوں جو کم عمری میں حساس بچوں کو سنجیدہ کر دیتی ہے کہ میں بھی اس عمر میں ایسا ہی تھا۔

> میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ یہ پچاس روپے آمدنی میں شامل ہونے کے بعد کتنے چھوٹے چھوٹے اخراجات کی چھت کے ستون بن گئے تھے؟

ہر مرتبہ کتاب اٹھاتے وقت اس کی آنکھیں میری جانب اٹھتیں اور لڑکھڑا کے جھک جاتیں۔ ہونٹ ایسے لرزتے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ اس کی کشاکش محسوس کرتے ہی مجھے یہ خیال آیا، اب کیونکہ وہ خاصا پڑھ گیا ہے جس کے سبب وہ اپنی جماعت میں پیچھے تھا۔ بچہ ذہین ہے اور محنتی بھی۔ مگر گھریلو حالات ایسے نہیں کہ مستقلاً ٹیوشن کا بوجھ اٹھا سکے۔ اسی لیے آج وہ مجھ سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں کل سے نہ آؤں...... اور شاید اسی لیے کل مجھے دس روپے زیادہ دیے گئے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ یہ پچاس روپے آمدنی میں شامل ہونے کے بعد کتنے چھوٹے چھوٹے اخراجات کی چھت کے ستون بن گئے تھے؟ اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ یہ ٹیوشن اتنے مختصر عرصے کے لیے ہے، تو میں میڈیکل اسٹور والوں کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

بچے کو پڑھانے سے انکار نہ کرتا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کا گھر دور ہے۔ آنے جانے میں ہی گھنٹا بھر نکل جاتا۔ لیکن ارشد کے مقابلے میں فیس بھی تو دوگنی ہوتی یا شاید اور زیادہ، یہ خیال میرے ذہن میں تاسف کے جالے بنانے لگا۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ میں اپنی ضرورتوں کو اپنے دکھ کی طرح تماشا بنانے کا عادی نہیں۔ اس لیے ایک ٹیوشن چھٹ جانے پر کسی سے کبھی نہیں کہوں گا کہ مجھے فوراً اس کا بدل چاہیے...... ہاں...... یہاں سے جاتے وقت میڈیکل اسٹور کے سامنے سے ضرور گزروں گا۔ پندرہ بیس پچیس پیسے والی کوئی گولی خریدنے اندر چلا جاؤں گا۔ اگر ان کو اب بھی ضرورت ہوئی تو خود ہی کہیں گے اور اگر انھوں نے کوئی بات نہ کی، تو کل ڈاکٹر صاحب سے ضرور تذکرہ کروں گا۔ کل یوں ہو گا کہ ان کے میڈیکل اسٹور سے نکل کر ان کے مطب چلا جاؤں گا۔ ایسے وقت میں مریضوں کا تو ہجوم لگا رہتا ہے۔ جانے میں کیا کہہ سکوں... یہی مناسب ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے ٹیوشن کی ضرورت کا ذکر کیا جائے۔

میں نے ارشد کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے اپنی معصوم اور خوفزدہ نظروں سے تکے جا رہا تھا۔ مجھے ایسے ذہین بچے کی ٹیوشن چھوٹ جانے کا افسوس محسوس ہونے لگا۔

وقت ختم ہو کر گزر رہا تھا۔ ارشد کا دل پڑھائی کی جانب تھا نہ میں کوئی سبق پڑھا رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور ارشد نے کتاب بند کی۔ اسی وقت دروازے کی دوسری جانب سے اس کی والدہ کی آواز آئی "ارشد! تم نے بات کی ماسٹر صاحب سے؟"

ارشد نے کوئی جواب دیے بغیر میری جانب نظریں اٹھائیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم دونوں کا دکھ مشترک ہے۔ اسے اپنی پڑھائی اور مجھے آمدنی چھٹ جانے کا صدمہ ہے۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے بیٹے؟"

ارشد خاموش رہا۔ دروازے کے قریب اس کی والدہ اس انتظار میں رہیں کہ ارشد کچھ کہے۔ جب انھوں نے سمجھ لیا کہ ارشد میں بات کرنے کی ہمت نہیں تب انھوں نے آہستہ سے مجھے مخاطب کیا "ماسٹر صاحب! ایک بات عرض کرنی ہے۔ برا نہ مانیے گا۔"

میں سمجھ چکا تھا کہ اب وہ مجھے کل سے "زحمت نہ فرمانے" کے لیے کہیں گی۔ آدمی جب خود مجبور ہو، تو دوسرے کی مجبوری بجا جواز مجھے لگتا ہے۔ میری کیفیت ایسی ہی تھی۔

انھوں نے کہا "ارشد کے ابا کی بندھی تنخواہ ہے جس کے ایک ایک پیسے کا ہمارے پاس حساب ہے۔ کل آپ کو جو فیس دی ہے، شاید آپ نے دیکھی ہو۔ اسی سے پوچھ رہی ہوں... اس میں دس روپے زیادہ تو نہیں آ گئے؟"

ارشد کی والدہ کا کپکپاتا ہوا لہجہ میرے اندازے کے خلاف ہوتے ہی ایک سناٹا میرے وجود میں ہوا کے تیز جھونکے کی طرح گھسنے لگا۔ ارشد میری طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی والدہ نے مجھ پر کوئی سنگین الزام لگا دیا ہو۔ میں نے جیب کی ... کے سہارے رکھی اپنی چھڑی اٹھائی اور آہستہ سے کہا "جی، میں نے گن لیے تھے۔ پورے پچاس تھے۔"

جب میں اس مکان سے نکلا، تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری پناہ گاہ مسمار ہو گئی اور میں تیز آندھی کی زد میں ہوں۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

"ارے بیٹا! ذرا یہاں آنا......" میں باورچی خانے میں تھی کہ ابا جی کی آواز کان میں پڑی۔ میں ان کے کمرے میں گئی، تو پوچھنے لگے کہ میری لاٹھی کہاں ہے، ابھی تو یہیں رکھی تھی؟ یہ سن کر میں مسکرائی۔ سوچا، ابھی یہاں میری دانشور بیٹی موجود نہیں ورنہ وہ کہتی، لاٹھی سے تو دھوبی گدھے کو مارتا ہے۔ دادا ابو! چھڑی کو لاٹھی کیوں کہتے ہیں؟ اور اس وقت وہی لاٹھی غائب تھی۔

میں نے کہا "چولہا بند کر کے آتی ہوں ... پھر ڈھونڈتی ہوں۔"

باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے میری نظر انہی محترمہ پر پڑی جو بڑے انہماک سے لاٹھی ہاتھ میں لیے سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے کہا "دادا ابو لاٹھی کے لیے پریشان ہیں اور تم یہاں ہاتھ میں لیے کھڑی ہو!"

وہ بولی "میں دیکھ رہی ہوں کہ یہ چارج کیسے ہوتی ہے؟"

میں نے کہا "ارے بے وقوف، یہ کوئی موبائل ہے جو تم چارج کر رہی ہو... جاؤ جلدی سے دے کر آؤ۔"

وہ لاٹھی دے کر باورچی خانے میں میرے پاس آ گئی۔ میں نے پوچھا "یہ کیا مسئلہ تھا؟ کیا دیکھ رہی تھیں

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

آپ لاٹھی میں؟"

بولی "میں نے آج اخبار میں پڑھا کہ جہاں افسر سیلاب زدگان کو امداد دے رہے تھے، وہاں لاٹھی چارج ہوا ہے۔ مگر امی! لاٹھی میں تو کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو میں سوچ میں لگاتی۔"

یہ سن کر مجھے بہت ہنسی آئی۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ لاٹھی سے مار پیٹ کو لاٹھی چارج کرنا کہتے ہیں۔

ہماری بٹیا ہیں تو محض چھے سال کی، لیکن اردو پڑھنا سیکھنے کے بعد ہر چیز پڑھ ڈالتی اور ہمارے لیے سوالات کا ایک پلندہ تیار کر لیتی ہیں۔ ایک دن گھر میں کھانسی کا شربت آیا۔ بے پر درج معلومات پڑھنا، تو اب لازم تھا لہٰذا توجہ سے پڑھا اور پھر سوال کر ڈالا۔ "امی کیا کھانسی کے بھی "کلر" ہوتے ہیں؟"

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آپ خود سوچیں کبھی ایسا سوال آپ سے کیا ہوگا کسی نے؟

اس نے مجھے ڈبا دکھایا جس پر لکھا تھا "کالی کھانسی میں مفید ہے۔" پھر پوچھا "کھانسی کے کلر کا پتا کس طرح چلتا ہے؟" اب میں اسے کیا سمجھاؤں بھلا۔۔۔۔

ان کا ایک شوق اخبار پڑھنا ہے، باریک بینی کے ساتھ وہ بھی باآواز بلند! بعض دفعہ نامناسب الفاظ والی خبریں بھی زور و شور سے پڑھ جاتی ہیں اور ہم روکتے ہی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اخبارات میں شائع اشتہارات بھی تمام جزئیات کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آج کے بچے بہت چلبلی فطرت کے ہیں۔ متحرک اور پرتجسس! ہماری مائیں ہم سیدھے سادے بچوں کو خطرات سے بچانے کے لیے کچھ باتیں سمجھاتی تھیں، مثلاً کسی کے گھر جائیں، تو چیزیں نہ چھیڑیں، کمروں میں نہ جھانکیں یا اجنبی افراد سے دور رہیں۔ یہ فریضہ ہر دور میں حالات کے مطابق مائیں انجام دیتی ہیں۔ آج کے دور میں، تو گھر سے باہر دنیا میں بچوں کے لیے کئی قسم کے خطرات منہ پھاڑے کھڑے ہیں۔ ان کی شدت اور تناسب بھی بہت بڑھ چکا۔ ایک دن میں نے محترمہ کو سمجھانے کی غرض سے سوال کر ڈالا۔ "اگر کوئی اجنبی آپ کو کوئی کھانے کی چیز دے، تو آپ کیا کریں گی؟"

بولی "میں تو نہیں لوں گی۔"

میں نے پوچھا "کیوں نہیں لیں گی؟"

فوراً جواب دیا "اس لیے کہ وہ سمجھے گا میں ندیدی ہوں۔"

میں بھی تیار تھی، نیا سوال کر دیا "اچھا اگر وہ زبردستی آپ کو کھلائے تو؟"

جواب آیا "تو میں آپ سے پوچھ کر لے لوں گی۔"

میں نے اب نئی صورت حال سامنے رکھ دی۔ "اگر میں یا گھر والوں میں سے کوئی بھی آپ کے پاس نہ ہو، تو کیا کریں گی؟"

اب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پھر میں نے بتایا کہ بسکٹ، ٹافی اور جوس جیسی چیزوں میں بے ہوشی کی دوائیں ملا کر اجنبی لوگ بچوں کو دیتے ہیں۔ جب بچے بے ہوش ہو جائیں، تو انھیں اٹھا لے جاتے ہیں۔ وہ بچوں کی زبان کاٹ دیتے ہیں تاکہ اپنے گھر کا پتا کسی کو نہ بتا سکیں اور ہاتھ پیر توڑ اپاہج بنا دیتے ہیں تاکہ ان سے بھیک منگوا سکیں۔"

میں نے بہت ہی بھیانک نقشہ کھینچا، "بچے سمجھتے ہیں، یہ ہمارا دوست ہے جب ہی تو ہمیں مزے کی چیزیں دے رہا ہے۔ لیکن وہ دشمن ہوتا ہے۔ بچے بھیک مانگ کر پیسے جمع کریں، تو وہ آدمی سارے پیسے لے جاتا ہے۔ بتاؤ فائدہ کس کو ہوا؟ کھانے والے بچے کو یا اس آدمی کو؟"

اب وہ بات سمجھ گئی تھی، بولی "جو مفت میں کچھ کسی کو دے رہا ہے، تو فائدہ اسی آدمی کو ہوگا جو دے رہا ہے۔ میں سمجھ گئی۔ اب تو کبھی کسی سے کوئی چیز نہیں لوں گی۔ اور جوتا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہے نا! میری دوست، اسے بھی بتا دوں گی۔"

اس کے جواب سے میں مطمئن ہو گئی کہ میرا پیغام صحیح طور پر منتقل ہو چکا۔ اس بات کو دو دن گزرے تھے کہ دیکھا اخبار ہاتھ میں لیے سوالیہ نشان بنی بیٹھی ہیں۔ اس عظیم "مفکرہ" کو دیکھ کر ہنسی آئی اور تھوڑا غصہ بھی کہ بھلا آج کے زمانے میں جب لوگ اخبار بینی سے کترانے لگے ہیں۔ اخبار بھی قتل و غارت گری سے بھرے ہوئے ہیں، ان کو گہرائی سے بھلا مطالعہ کرنے کی کیا چیز نظر آ گئی؟ بہرحال میں پاس آ کر بیٹھی، تو سوالات تیار تھے۔

"امی دیکھیں، اشتہار میں لکھا ہے کہ اگر پٹرول یا سی این جی یہاں سے ڈلوائیں تو آئس کریم مفت ملے گی۔"

"اچھا! تو میری بیٹی کا دل آئس کریم کھانے کو چاہ رہا ہے۔" میں نے پیار سے کہا۔

جواب ملا "نہیں، وہ تو ہر وقت ہی دل چاہتا ہے اور ابو تو کھلاتے بھی ہیں۔ لیکن میں ایک بات سوچ رہی ہوں۔ آپ نے کہا تھا، کوئی اجنبی مفت کچھ کھلائے، تو کھانے والوں کو نقصان اور کھلانے والے کو فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انھیں کون سا فائدہ اور ہمیں کون سا نقصان ہو رہا ہے؟"

یہ سن کر میں حیرت زدہ ہو گئی۔ اپنے بھولپن میں اس نے کتنی مشکل بات کہہ دی تھی۔ کتنا کٹھن سوال کر ڈالا تھا۔ اس نے تو چند جملوں میں مفت خوری اور لالچ کی پوری نفسیات کو آشکار کر دیا۔ یہ حقیقت ہی تو ہے کہ وطن عزیز میں بعض کمپنیاں عوام کو مفت خور بنا کر سبز باغ دکھا رہی ہیں۔ پھر ہماری حالت بھی اس بچے جیسی ہو جاتی ہے جس کی زبان کاٹ دی گئی ہو کہ وہ اپنا پتا اور اپنی شناخت بھی نہ بتا سکے۔ کھلانے والے کے ان احسانات کی زد میں آ کر ایک مفت خور اپنی ہر صلاحیت، وقار اور عزت گروی رکھ دیتا ہے۔

ماضی میں ہمارے گھروں میں یہ تربیت عموماً دی جاتی تھی کہ جس چیز میں تمھاری محنت شامل نہ ہو، وہ تم نہیں ہے۔ دھونس، زبردستی تو دور کی بات، نظر اٹھا دیکھنے سے منع کیا جاتا تھا...... یہی وجہ ہے، جب چھوٹے تھے اور کسی کے گھر جاتے، تو وہاں کوئی کچھ ہوتا۔ تب ہمیں بڑی شرم آتی اور ہم نظریں چرا لیتے۔ مبادا کوئی ندیدہ سمجھ لے۔ مگر آج یہ مفت خوری ت دے کر سکھائی جا رہی ہے۔

اخبارات و رسائل میں بچوں کے لیے مختص ص محنت میں عظمت کی کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ اسکول اور نصاب میں بھی محنت اور جدوجہد کو اجاگر کرنے والے ا ملتے ہیں۔ لیکن جب یہی نسل عملی زندگی میں قدم ر اسے "مفتے کے چیک" تھما دیے جاتے ہیں۔ بلامحنت کسی چیز کو حاصل کرنے کے نشے اور اس سے ملنے والی خو زندگی کا حاصل قرار دے دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ برگر ہو، مسالے، برقی آلات ہوں یا موبائل فون کے پرکشش پ برگر کے ساتھ کولڈ ڈرنک مفت، تین پیکٹ مس لیں، تو چوتھا فری، پکانے کا تیل خریدیں، تو انگلی میں ی ایک انگوٹھی مفت، پردے کا کپڑا لیں، تو اس کی مفت وغیرہ وغیرہ۔

یہ نہیں معلوم کہ اس "مفت پروگرام" سے کیسے ہوتا ہے؟ کمپنیاں صارفین کو جو لاکھوں کی تعداد ہیں۔ بہرحال سوچتی رہی، یا اللہ! میں اس بچی کو کیا ج دوں؟ شاید پوری کتاب بھی لکھ دوں تو جواب تشنہ ہی رہے۔ مجھے کچھ دیر خاموش دیکھ کر وہ بولی "امی! مجھے تو کچھ لگتی ہے؟ ہم یہاں نہیں جائیں گے۔ جب ابو ہمیں خو آئس کریم کھلا دیتے ہیں، تو اجنبی سے لے کر کیوں کھائیں؟"

میں نے تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں بیٹا! ہم نہیں جائیں گے۔" اب وہ مطمئن ہو گئی کہ اس کا پیغام مجھ تک منتقل ہو چکا۔

◆◆

www.pdfbooksfree.pk

کھیل کھلاڑی

مفادات کی جنگ یا انا کا ٹکراؤ

کھیلوں سے کھلواڑ

پاکستانی سپورٹس کی ترقی و ترویج کے ذمہ داروں نے باہمی رقابت اور سازشوں سے کرکٹ ہاکی اور اسکواش جیسے کھیلوں کو بھی تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا جن میں کبھی ہمارا طوطی بولتا تھا..... چشم کشا رپورٹ

محمد توفیق

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ایک خاتون بازار سے بیلن خرید لائی تو خاوند نے کہا "گھر میں کھانے کو کچھ نہیں اور تم اسلحہ خرید لائی ہو۔" ممکن ہے کچھ ایسا ہی معین خان کے ساتھ ہوا ہو۔ آخر بیگم کے آنسو دنیا کی سب سے بڑی آئی قوت ہیں جن کے ہاتھوں مجبور ہو کر معین خان وی آئی پی لاؤنج اور ان کی اہلیہ کیسینو میں جوا کھیلنے میں مصروف تھیں۔ کیسینو میں موجودگی کا جواز یہ بتایا گیا کہ وہاں حلال کھانا کھانے گئے تھے۔ یہ کھانا ہی ہے جس کے لیے دن میں تین مرتبہ پیٹ اور کئی مرتبہ دوسروں کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔

پاکستانی شائقین کرکٹ سکتے کے عالم میں ہیں۔ ان پر یہ تلخ حقیقت پوری سفاکی کے ساتھ آشکار ہو چکی ہے کہ ورلڈکپ ان کے لیے ایسا ورلڈکپ بن کر رہ گیا ہے۔ ورلڈکپ جیتنا تو کجا کوارٹر فائنل تک رسائی کے لیے بھی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ مارٹن نے کہا تھا "مایوس انسان کا آدھے سے زیادہ نقصان ہو چکا ہے۔" کچھ ایسا ہی حال پاکستانی ٹیم کا ہے کہ ایسے تو کھلاڑی ناقص! اوپر سے بغدادی ناقدین نے اپنے اپنے پرانے کھلاڑیوں کو ری سائیکل کرنے کے لیے توپوں کے دہانے کھول دیے ہیں۔ ہر چینل پر نام نہاد ماہرین کی ایک فوج ظفر موج ہے جو ٹیم کے لتے لے کر تسکین حاصل کرنے میں مصروف ہے۔ کھلاڑیوں کی کارکردگی پر یقیناً ہر پاکستانی کا دل دکھی ہے لیکن تنقید کی آڑ میں ذاتیات پر حملے اور الزامات کی وہ بوچھاڑ ہے کہ خدا کی پناہ! جیسے کئی لاوے ابل پڑے ہیں۔ سرفراز نواز جیسے لوگ ایسے مواقع کی تاک میں رہتے ہیں۔

پاکستان نے گزشتہ ۶۸ سالوں میں کرکٹ بورڈ کے ۲۸ صدور اور کرکٹ ٹیم کے ۳۳ کپتان بدلے ہیں۔ پاکستان کرکٹ بورڈ کا سربراہ کبھی بھی میرٹ پر مقرر نہیں ہوا بلکہ حکومت وقت کا منظور نظر جرنیل، سفارت کار، بزنس مین، سیاست دان، بیوروکریٹ مقرر ہوتا رہا ہے۔ ہمارا المیہ یہ رہا ہے کہ ہم نے ملک کے دوسرے اداروں کی طرح کرکٹ بورڈ کو بھی ذاتی پسند ناپسند کی بنیادوں پر لوٹا۔ یہ جملہ میں پوری ذمے داری کے ساتھ لکھ رہا ہوں۔ دو سال میں چار ارب کا بجٹ، ۹۴۰ مفت خوروں کا عملہ، وقار یونس کو ۱۵ لاکھ ماہانہ معاوضہ کن خدمات کے عوض دیا جا رہا ہے؟ ہم کب تک عوام کے ٹیکس کا پیسا اور ادھار کا چارا کھلا کر قومی بھینسوں کو دودھ پلاتے رہیں گے؟ کرکٹ کا المیہ دیمک کا ایک دانت ہے۔ پاکستان اسپورٹس میں جاری مفاد کی جنگ میں جھانکیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہمارے رویے نے عالمی شہرت یافتہ کوچ وولمر کی جان لے لی۔ ڈیوڈ واٹ مور اور رچرڈ پائبس کو کوچ منیجر کے عہدوں سے ان کے سابقہ کھلاڑیوں کے مافیا نے اتنا ہراساں کیا کہ ان کے پاس پاکستان کو خدا حافظ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ آج محسن حسن خان، انتخاب عالم، ہارون رشید، وسیم باری، عمران نذیر کرکٹ بورڈ پر گزشتہ برسا رہے ہیں لیکن ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو بورڈ میں نوکری کی درخواست لیے ہر سفارش کو بروئے کار نہیں لاتے رہے؟ یہ ہمارا منافقانہ قومی رویہ ہے۔ سارا دن امریکا برطانیہ مردہ باد کے نعرے لگاتے ہیں اور شام کو ان کے سفارت خانوں کے باہر ویزا لگوانے قطار میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی کھلاڑی ڈالروں کی برسات میں نہانے کے لیے ہر وقت آئی پی ایل کی بھارتی ٹیموں کی کوچنگ کو کمر بستہ رہتے ہیں لیکن پاکستانی ٹیم کی کوچنگ کی باری آئے تو عذر لنگ تراش لیتے ہیں کہ کرکٹ بورڈ نے ان کی خدمات حاصل نہیں کیں۔

پاکستان کرکٹ بورڈ کا زوال اس افسوس ناک منظر نامے کا محض ایک پہلو ہے جو آشکار کرتا ہے کہ وطن عزیز میں بیشتر سرکاری اسپورٹس اداروں کا بیڑا غرق ہو چکا۔ وہاں بھی سیاست، کرپشن اور عہدوں کی بندربا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

، بالا ہے جبکہ کھیلوں و کھلاڑیوں کی بہتری کے لیے قدامات نہیں کیے جاتے۔
ی دلدوز صورت حال کی منظر کشی جناب محمد توفیق پنی تحریر میں کی ہے۔ یہ ان پاکستانی کھیلوں کا مرثیہ ہن میں ہمارے کھلاڑی کبھی شاندار کارکردگی تے تھے مگر اب وہ عہد رفتہ کی یادیں بن چکے۔ لیجیے اسپورٹس اداروں کی داستان الم ملاحظہ فرمایئے جس میں شکست و ریخت کا شکار بنا ڈالا۔

☆☆☆

مارک ٹوین نے کہا تھا "میں نے دو مقامات کے دنیا کی کافی سیر کر لی، ایک جنت جہاں مجھے جانے دیا جائے گا اور دوسرے دوزخ جہاں میں جانا نہیں "۔ ذوق سیاحت سے محروم انسان میرے نزدیک اس ے کے مانند ہے جس نے کبھی پرواز نہیں کی۔ تجسس ا، میں جنوں نے سر اٹھایا تو اپنے لنگوٹیے ظفر اقبال ہمراہ یورپ کی طوفانی سیاحت پر روانہ۔ ۳۵ دنوں میں ہم نے پندرہ ممالک کے چونتیس شہروں کی خاک چھانی۔ اٹلی کے شہر روم سے شروع ہونے والی آوارگی ہمیں کشاں کشاں آسٹریا، سلواکیہ، جرمنی، سوئٹزر لینڈ، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، ہالینڈ، بیلجیم، لکسمبرگ، فرانس، اسپین، پرتگال اور دیتی لے گئی۔

سوئٹزر لینڈ میں قیام کے دوران اہم مصروفیت لوزان میں واقع آئی او سی (انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی) کے ہیڈ کوارٹر میں اس کے صدر ژاک روگ سے ملاقات تھی۔ لوزان شہر کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو اولمپک کے "لوگو"...... دنیا کے پانچ براعظموں کی نمائندگی کرتے آپس میں باہم پیوست پانچ گولائیوں والے چھلوں نے استقبال کیا۔ بس کے ذریعے ہم کم گنجان آبادی والے آخری اسٹاپ پر اترے۔ قریب ہی پھولوں سے لدا باغ تھا۔ نزدیک گئے تو پتا چلا قبرستان ہے۔ خیال نے سر اٹھایا، یہاں موت بھی کتنی خوبصورت ہے۔ ہم نے وطن

مصنف کا تعارف

جناب محمد توفیق کھیلوں کے شعبے میں عالمی سطح کے براڈ کاسٹر، سفرنگار، کالم نگار، مبصر اور مصنف ہیں۔ انہیں 60 سے زائد ممالک کی سیاحت کا منفرد اعزاز حاصل ہے۔ 28 ممالک میں بحیثیت منیجر پاکستان اسکواش، ٹینس، والی بال اور ہاکی ٹیم ملک کی نمائندگی کر چکے۔ ٹیلی ویژن پر 30 کھیلوں کی کمنٹری اور فٹبال ورلڈ کپ، اولمپک گیمز کی نشریات کی میزبانی بھی کر چکے۔ 14 کتابوں کے مصنف ہیں اور اڑھائی ہزار سے زائد کالم تحریر فرما چکے۔ کھیلوں کے عالمی اور ملکی موضوعات پر ان کی گہری جزیاتی نظر ہے۔ پاکستان سپورٹس کی زبوں حالی اور اس کی وجوہ پر ان کا زیر نظر چشم کشا تحقیقی مضمون قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے اپنے دامن میں بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔

ممتاز ادیب اور شاعر، امجد اسلام امجد آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

"محمد توفیق سے میری ملاقات نئی بھی ہے اور پرانی بھی، وہ یوں کہ میں نے انہیں گذشتہ دس برس میں ٹیلی ویژن سکرین پر کئی بار دیکھا اور سنا ہے اور گاہے بگاہے ان کے اخباری کالم بھی میری نظر سے گزرتے رہے لیکن بالمشافہ ملنے یا بات چیت کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں برادرم سلیم بٹ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دو کناروں کو ملانے والے پل کا کام کیا اور چند روز قبل توفیق صاحب سے میری ملاقات کرادی۔ اب جو میں نے ان کا مضمون "پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن

www.pdfbooksfree.pk

عزیز میں زندگی کو کتنا بدصورت بنا ڈالا ہے کہ جیتے تو ایرے غیرے، مرے تو وغیرہ وغیرہ!

چند فرلانگ پیدل مٹرگشت کرتے اور اوور ہیڈ برج کے نیچے سے گزرتے ہم باؤنڈری وال سے محروم کشادہ سبزہ زار پہنچے جس کے وسط میں دو منزلہ مختصر سی عمارت آئی او سی کا صدر دفتر ہے۔ دنیائے کھیل کے حوالے سے اہم ترین فیصلے وہیں ہوتے ہیں۔ صدر دفتر کی لابی میں جہاں جدید اولمپک کے بانی فرانسیسی ماہر تعلیم پیری کوبرٹن کا سیاہ مجسمہ نصب تھا، یاک روگ کو اپنی تصانیف پیش کیں۔ انھوں نے ''کھیلوں کے ارتقائی سفر'' اور ''اولمپک اور فٹ بال'' کو گراں قدر تخلیقی کاوشیں قرار دیتے ہوئے اسے وہیں واقع عجائب گھر اور اولمپک لائبریری کا حصہ بنانے کا حکم دیا۔

بارہ منٹ پر محیط اس مختصر ملاقات میں دو مرتبہ انھوں نے پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے باہمی اختلافات، حکومتی مداخلات اور ممکنہ پابندی کے خدشات کا دردمندی سے ذکر کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ ۲؍مئی ۱۹۴۲ء کو بلجیم کے شہر گھنٹ (Ghent) میں پیدا ہونے والے ۷۲ سالہ رومن کیتھولک آرتھوپیڈک سرجن یاک روگ (Jacques Rogge) نے ۱۶؍جولائی ۲۰۰۱ء کو ماسکو میں اسپین کے سفارت کار یوان انتونیو سامارانچ کی سبکدوشی کے بعد بطور آئی او سی کے آٹھویں صدر کا عہدہ سنبھالا۔ ۲۰۱۱ء میں ''فوربس میگزین'' نے انھیں دنیا کے ۶۸ طاقت ور ترین افراد میں ۶۷ واں نمبر دیا۔

شائستہ اطوار، مہذب اور نفیس ذوق کے خوش لباس یاک روگ اولمپک تحریک میں اخلاقی اقدار، ثقافت کے علمبردار اور کھلاڑی دوست کی شہرت رکھتے ہیں۔ ۲۰۰۲ء کے سالٹ لیک سرمائی اولمپک میں ایتھلیٹس کے ساتھ قریبی رابطہ رکھنے اور اولمپک کمیٹی کے ارکان پر سے ''امرا کے کلب'' کا ٹھپہ ہٹانے کی غرض سے اولمپک ولیج میں ہی قیام کرنے والے پہلے صدر بنے۔

۲۰۱۲ء کے لندن اولمپک کی افتتاحی تقریب میں چالیس سال قبل میونخ اولمپک میں گیارہ اسرائیلی کھلاڑیوں

کی اندرونی کشمکش، چشم کشا حقائق'' دیکھا تو مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں کہ اس پاکستان میں سپورٹس کے حوالے سے ان جیسی ''جامع الصفات'' اور ''صاحب کمال'' شخصیت اگر کوئی ہے تو کم از کم مجھے اس کا علم نہیں۔ بیک وقت اتنے کھیلوں کی نوعیت، قوانین، تاریخ اور کارناموں پر ایسی گہری نظر رکھنے کے ساتھ بیک وقت قلم اور آواز کا دھنی ڈھونڈنے کے لیے ہمیں مولانا روم کے اس شعر سے رجوع کرنا پڑے گا کہ

دی شیخ با چراغ ہمیں گشت گرد شہر　　　　دام دو دو ملولم و انسانم آرزوست

''محمد توفیق کی جس خصوصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ ان کی خوبصورت نثر ہے کہ ہزاروں سال پرانی تاریخ کا ذکر ہو یا آج کے کسی سپورٹس چیمپئن کے کارناموں کا، وہ ان کے بارے میں دلچسپ معلومات کے ساتھ ساتھ سپورٹس رائٹرز، فلسفیوں، شاعروں اور نامور ادیبوں کی ایسی کوٹیشنز انتہائی روانی سے اور ایسے برمحل انداز میں لکھتے چلے جاتے ہیں کہ خود ان پر ایک باقاعدہ دانشور ہونے کا گمان یقین میں بدلنے لگتا ہے۔ اس پر طرہ امتیاز یہ کہ نادر اور تاریخی تصاویر کا ذخیرہ آنکھوں کو خیرہ کر ڈالتا ہے۔

''محمد توفیق نے جس محنت اور جانفشانی سے ''پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کی اندرونی کشمکش کے بارے میں تاریخی شواہد جمع کیے ہیں اور جس خوبی اور خوبصورتی سے اعداد و شمار کی بے رنگی کو نیرنگی میں تبدیل کیا ہے اسے دیکھ کر کسی کا مشہور سارنگی نواز استاد نتھو خان کے بارے میں کہا ہوا یہ جملہ یاد آجاتا ہے

استاد نے سارنگی کو سو رنگی بنا دیا ہے''

www.pdfbooksfree.pk

کی ہلاکت کی یاد میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ افتتاحی تقریب جیسا خوشگوار ماحول ایسی سوگواریت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

انھوں نے دنیا کے تیز ترین انسان، جمیکا کے یوسین بولٹ کے بیجنگ اولمپک میں ریس کے دوران کامیابی کا جشن منانے والے انداز کو دوسرے دوڑاکوں کی عزتِ نفس کے لیے غیر مہذب قرار دیا۔ اتنے معتبر عہدے پر براجمان باکردار شخصیت کے خدشات کو طاقِ نسیاں پر نہیں دھرا جا سکتا تھا۔ پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن میں جوتیوں میں بٹتی دال کا سرسری احوال تو ہمیں معلوم تھا لیکن معاملات اس نہج تک پہنچ چکے، اندازہ نہ تھا۔ اس صورت حال پر پاکستان اسپورٹس کے کرتا دھرتا حسبِ روایت شتر مرغ کی طرح سر ریت میں دبائے خوابِ غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ لیکن ۲۰۶ ممالک کی نمائندہ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے سربراہ نے دردمندی اور تشویش کا اظہار کیا۔

وطن واپسی پر میں نے گہرائی سے حقائق کی مخلصانہ کھوج کی کہ ڈیوجانس کلبی کے بقول "میں صداقت کا اس طرح پیچھا کرتا ہوں جس طرح شکاری کتا شکار کا۔" سچ کی تلاش کے اس سفر میں مجھے بریگیڈیئر عارف صدیقی کی پرجوش اور دیانتدارانہ رفاقت میسر رہی۔ بریگیڈیئر موصوف اس سارے کھیل کے چشم دید گواہ اور گھر کے بھیدی ہیں۔ عارف حسن اور اکرم ساہی، دونوں کو منظر عام پر لانے اور انتخابات کروانے کے پس پردہ ان کا زرخیز دماغ کارفرما رہا۔ درحقیقت انھوں نے اس سارے معاملے میں "بادشاہ گر" کا کردار ادا کیا۔

ان چشم کشا انکشافات کے بعد میں اسے اپنی قومی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ حقائق کو مکمل غیر جانبداری کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کروں۔ مقصد کسی کی کردارکشی یا تضحیک نہیں نہ ہی کسی فریق کی طرفداری، دلداری یا ناراضی مقصد ہے۔ مقصود صرف اصلاحِ احوال اور آئندہ نسلوں کے کسبِ علم کے لیے حقائق کو محفوظ کرنا ہے تاکہ وہ سر منڈ رکھیں تو معلوم ہو کہ ہر بلندی پستی کی زد میں ہے۔

قائداعظم نے ۲۳ اپریل ۱۹۴۸ء کو پہلے قومی کھیلوں کا افتتاح کیا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

یہ مضمون کیوں شائع کیا گیا؟

کھیل خصوصاً نئی نسل کی جسمانی و ذہنی نشوونما میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماضی میں کئی پاکستانی کھلاڑیوں نے عالمی منظر نامے میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۴ء کے ایشین گیمز میں پاکستان کی "چوتھی" پوزیشن تھی۔ جبکہ بھارت اس سے پیچھے رہا۔

اسی طرح ۱۹۶۴ء کے کامن ویلتھ گیمز میں بھی پاکستان کو "چوتھا" نمبر ملا۔ اولمپکس کی تاریخ میں پاکستانی کھلاڑیوں نے بہترین کارکردگی روم اولمپک (۱۹۶۰ء) میں دکھائی۔ تب پاکستان "۲۰ نمبر" پر براجمان تھا۔ جبکہ بھارت کہیں نیچے ۳۲ پوزیشن پہ آیا۔

لیکن آج پاکستانی سپورٹس بہت زوال پذیر ہو چکی۔ لندن اولمپکس (۲۰۱۲ء) میں پاکستانی کھلاڑی ایک تمغہ بھی نہیں جیت سکے۔ (درحقیقت ۱۹۹۴ء سے تمغوں کا قحط چلا آ رہا ہے)۔ ۲۰۱۴ء کے ایشین گیمز اور اسی سال منعقد ہونے والے کامن ویلتھ گیمز میں پاکستان کی "۲۳ ویں" پوزیشن آئی۔ ان دونوں عالمی مقابلوں میں بھارت کا درجہ بالترتیب "۸ واں" اور "۵ واں" تھا۔

وطن عزیز میں سپورٹس کے زوال کی ایک وجہ کھیلوں کی سرکاری تنظیموں کے باہمی اختلافات بھی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں اسی خانہ جنگی کی تاریخ اجمالاً بیان ہوئی ہے۔ یہ تحریر اسی لیے شائع کی گئی کہ وہ وجوہ عیاں ہو سکیں جن کے باعث عالمی و قومی سطح پر پاکستانی کھیل زبوں حالی کا شکار ہو گئے۔

نیز یہ خیال بھی پیش نظر تھا کہ پاکستانی کھیلوں کی ترقی و ترویج کے لیے اب کس قسم کے تعمیری اقدامات کیے جائیں۔ اگر پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کی موجودہ قیادت یا کوئی بھی صاحب اپنا نقطہ نظر پیش کرنا چاہیں، تو اردو ڈائجسٹ کے صفحات حاضر ہیں۔

قول و فعل کا یہ کھلا تضاد جسے دیکھ کر انھیں یونان کا ڈیماستھینز یاد آ جاتا جس نے شجاعت کے بارے میں اتنی شاندار تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی انھیں سن کر میدان جنگ میں جان پر کھیل گئے۔ جب وہ خود میدان جنگ میں پہنچا تو موقع ملتے ہی فرار ہو گیا۔ یہ فرار ہمیں آج ہر ناصح، محتسب، مصلح اور قائدین زندگی میں ملتا ہے۔ ہمارے بڑوں نے محض ذاتی مفادات کی جنگ اور اپنی چودھراہٹ میں قومی مفادات کا اتنی سفاکانہ اور بے رحمی سے قتل عام کیا کہ وہ بوڑھا ریڈ انڈین سردار یاد آ جاتا ہے جو اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے بتا رہا تھا "بیٹا! ہم میں سے ہر شخص کے اندر خیر و شر کے دو بھیڑیے ہوتے ہیں جو آپس میں مسلسل برسر پیکار اور گتھم گتھا رہتے ہیں۔ جو جیت جائے وہ ہمارے اندر حکمرانی کرتا ہے۔"

"لیکن جیتتا کون سا بھیڑیا ہے؟" بیٹے نے معصومیت سے پوچھا۔

ریڈ انڈین نے جواب دیا "دونوں میں سے وہ بھیڑیا جیت جاتا ہے جسے ہم زیادہ خوراک کھلاتے ہیں۔"

یہاں والٹیئر کے الفاظ کی سچائی واضح ہوتی ہے جس نے کہا تھا "تاریخ انسانی جرائم کی زندہ تصویر ہے۔"

آج کے دور میں کسی معاشرے کی اجتماعی ترقی کا اندازہ لگانا ہو تو زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، اولمپک اور ایشین گیمز میڈل ٹیبل پر نظر دوڑا لیجیے، حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ اولمپکس میں چین، امریکا، روس اور ایشیائی کھیلوں میں چین، کوریا اور جاپان

www.pdfbooksfree.pk

سرفہرست نظر آئیں گے۔ ہمارے خطے میں بھارت اپنی آٹھ فیصد ترقی کو کھیلوں میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور بیڈمنٹن کی انٹرنیشنل لیگ کے احیا کے ذریعے کامیابی سے ''شوکیس'' کر رہا ہے۔

عہد حاضر میں معیشت کو کسی ملک کے عالمی منظرنامے پر مقام، وقار اور اہمیت کا پیمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ بھارت کے کارپوریٹ ملٹی نیشنل سیکٹر نے خطیر سرمایہ اسپانسرشپ کی شکل میں جھونک کر کھیلوں کو انڈسٹری کا درجہ دے ڈالا ہے۔ اس مربوط پالیسی کے باعث ایک جانب اس کے کھلاڑی کروڑوں روپے میں کھیلنے لگے، تو کھیلوں کی عالمی تنظیموں میں اثر و رسوخ میں بے پناہ اضافہ ہوا تو دوسری جانب اس نے اپنی اجارہ داری کو بدنیتی سے زیر اثر پاکستان کو عالمی تنہائی کا شکار بنانے کے لیے استعمال کیا۔

دولت کی اس ریل پیل نے کھیلوں کو بھارت میں ایک منافع بخش صنعت اور پیشہ ورانہ معیاری بلندی کی جانب گامزن کر دیا۔ اس کی ایک مثال مہندرا سنگھ دھونی ہے۔ انڈین ریلوے سے بطور ٹکٹ چیکر کیریئر کا آغاز کرنے والا دھونی آج دنیا کا پانچواں امیر ترین کھلاڑی بن چکا۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ دولت کی اس اندھی دوڑ نے کھیلوں میں اخلاقیات اور شفافیت کو مشکوک بنا دیا کہ زر ہمیشہ شر ہے کر آتا ہے۔ انڈین اولمپک کمیٹی کے صدر سریش کلماڈی کو کرپشن اور بھارتی کرکٹ بورڈ کے سربراہ سری نواسن کو اپنے داماد کے آئی پی ایل میں جوئے میں ملوث ہونے کے باعث ہزیمت اٹھانی پڑی۔ لیکن اس آفاقی حقیقت سے بہرحال نظریں نہیں چرائی جا سکتیں کہ ''Money makes the Mayor go''۔ (پیسا ہی کاروبارِ زندگی چلاتا ہے)۔

ہمیں کسی غلط فہمی اور خودفریبی کا شکار نہیں رہنا چاہیے کہ بھارت گزشتہ دہائی کے دوران کھیلوں کے میدان میں ہم سے کوسوں آگے نکل چکا۔ اس نے کھیلوں کے عالمی نظام پر اپنی گرفت اور شکنجہ خاصا مضبوط کر لیا ہے۔ عالمی اور ایشیائی معیار تو خیر اب ہماری گرفت سے باہر ہیں، ہمیں بھارت کے ہم پلہ بننے کے لیے بھی ٹھوس بنیادوں پر برسوں کی لگن، یکسوئی اور جنون درکار ہے۔ دیگر کھیلوں کا تو ذکر ہی کیا ہم، ان کھیلوں میں بھی جو کبھی ہمارا طرۂ امتیاز ہوا کرتے تھے، پھسل کر زوال پذیر ہو چکے۔

محمد توفیق لیجنڈری اسکواش کھلاڑی، جان شیر کے ساتھ

آج ہاکی میں ہم دسویں نمبر، اسکواش میں ۹ ویں نمبر، کرکٹ میں ۷ ویں نمبر اور فٹ بال میں ماشاءاللہ دنیا میں ۱۸۸ ویں اور ایشیا میں ۳۲ ویں نمبر پر پہنچ چکے۔ لندن اولمپکس ۲۰۱۲ء میں ۲۰۵ ممالک نے شرکت کی۔ ۱۲۰ ممالک کوئی بھی میڈل حاصل نہ کر سکے جن میں پاکستان بھی شامل تھا۔ ۲۰۱۴ء کامن ویلتھ گیمز میں ۷۱ ممالک نے شرکت کی۔ پاکستان ۲۳ ویں نمبر پر رہا۔ حالیہ ایشیائی کھیلوں میں ۴۴ ممالک نے شرکت کی۔ پاکستان کا نمبر ۲۳ رہا۔

اخلاقی دیوالیہ پن تو اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ پاکستان کرکٹ بورڈ محمد عامر کو واپس لا کے بڑی کامیابی قرار دے کر بغلیں بجا رہا ہے جس نے ملکی وقار اور سبز ہلالی پرچم کی حرمت کو چند ٹکوں کے عوض جواریوں کو فروخت کر ڈالا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

اس صورتِ حال کا ادراک کرنے کے بجائے پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن عدالت کچہری کا کھیل کھیلنے اور اقتدار کی غلام گردشوں میں اپنی کرسیاں پکی کرنے کے مکروہ دھندے میں سرگرمِ عمل ہے۔ کھیل معاشرے کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ ہم گراوٹ کے جس ترقی معکوس پر سفر کر رہے ہیں، کھیل بھی اس کا آئینہ ہیں۔

گرو تو ساتھ گرے شانِ شہسواری بھی
زوال آئے تو پورے کمال میں آئے

پاکستان میں کھیلوں کے شائقین اور تجزیہ کار دونوں متفق ہیں کہ وطنِ عزیز میں کھیل تیزی سے زوال کا شکار ہیں۔ اولمپک اور کامن ویلتھ گیمز میں پاکستان کی نمائندگی محض نمائشی جبکہ ایشیائی کھیلوں میں چند کھیلوں تک محدود ہو چکی۔ اس بتدریج زوال کے بہت سے اسباب ہیں۔ ان میں ملک کی امن عامہ کی صورتِ حال، غیرملکی ٹیموں کا پاکستان آنے سے گریز، کھیلوں کے لیے اسپانسر شپ میں کمی، تعلیمی اداروں سے کھیل کی سرگرمیوں کا معدوم ہو جانا اور ملک میں کھیلوں کے میدانوں کا رہائشی پلازوں میں ڈھل جانا شامل ہے۔

لیکن سب سے بڑی نشاندہی مقصود ہو تو وہ کھیلوں کی فیڈریشنوں میں جاری باہمی جوتم پیزار اور اندرونی سیاست ہے۔ آج بدقسمتی سے ہر فیڈریشن دھڑے بندیوں اور دو متوازی فیڈریشنوں میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ ان میں اتھلیٹکس، سائیکلنگ، باکسنگ، جمناسٹک، باسکٹ بال، والی بال، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس، کراٹے، تائیکوانڈو، ٹگ آف وار اور ووشو شامل ہیں۔

کھیلوں کی تنظیمیں اگر قابل اور درد دل رکھنے والے منتظمین کے ہاتھ میں ہوں تو وہ کھیل کو عبادت کا درجہ دے ڈالتے ہیں۔ معاملہ اس کے برعکس ہو تو عبادت بھی کھیل بن جاتی ہے۔ پاکستان میں کھیلوں کی سیاست بدقسمتی سے ایسی ہولناک تصویر پیش کرتی ہے جہاں سالہا سال سے مختلف فیڈریشنوں پر قابض پیرِ تسمہ پا مافیا غیرملکی دوروں، منظورِ نظر کھلاڑیوں کو نوازنے اور ہر نئی سوچ پر دروازہ بند رکھنے کی روایتی پالیسی پر کاربند ہے۔

پاکستان میں کھیلوں کی تنظیمیں ماضی میں کبھی بطور ادارہ منظم، نظم و ضبط، ذہن اور اصولوں پر نہیں چلائی گئیں۔ مشہور فلسفی مونٹسکیو نے کہا تھا "عظیم دانش کے انسان ہی ادارے بناتے ہیں اور پھر ان اداروں میں عاقل و فہیم لوگ جنم لیتے ہیں۔" چند قابل اور بے لوث منتظم البتہ ضرور گزرے ہیں جنھوں نے اپنے جذبہ جنوں اور اخلاص سے نئے افق تراشے اور اپنی ذات، مفادات اور تعصبات سے بلند ہو کر کھیلوں کی آبیاری کی۔ فوری طور پر جو ایسے چند نام ذہن پر دستک دیتے ہیں ان میں بریگیڈیر راڈھم، بریگیڈیر سرفراز، ایئر مارشل نورخان، بریگیڈیر عاطف، بریگیڈیر حمیدی، پروفیسر انور چودھری، اسلم بٹ، اسلم روڈا اور ڈاکٹر حسین سید نمایاں ہیں۔

یہ وہ عظیم لوگ تھے جنھوں نے گمنامی میں رہ کر پاکستان کے کھلاڑیوں کے لیے امکانات کے نخلستان تخلیق کیے۔ یہ تمام نابغہ روزگار شخصیات تھیں۔ آج پاکستان اسپورٹس قحط الرجال کا شکار ہے۔ مختار مسعود لکھتے ہیں: "قحط میں موت ارزاں ہو جاتی ہے اور قحط الرجال میں زندگی! مرگِ انبوہ کا جشن ہو تو قحط، حیاتِ بے مصرف ہونے کا ماتم ہو تو قحط الرجال۔ اس وبا میں آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ مردم شماری ہو تو بے شمار، مردم شناسی ہو تو نایاب!"

پاکستان میں کھیلوں کا شعبہ بھی ذاتی مفادات اور مصلحتوں کا یرغمال بنا ہوا ہے۔ اس کی بدترین مثال پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے معاملات ہیں جن کا غیر جانبدارانہ چشم کشا تجزیہ ایک جانب اگر ہمارے اخلاقی دیوالیہ

http://www.booksstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

پن کا مرثیہ ہے تو دوسری جانب احساس زیاں اور اصلاح احوال کے لیے ایک نادر موقع! سالہا سال سے جنرل عارف حسن گروپ اور جنرل اکرم ساہی گروپ کے درمیان یہ تنظیم ایسی تقسیم در تقسیم کا شکار رہی کہ ۲۰۱۴ء میں انٹرنیشنل اولمپک ایسوسی ایشن اس پر پابندی لگانے کے بہت قریب آچکی تھی۔

پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن سے ملک کی ۴۰ کے لگ بھگ مختلف کھیلوں کی فیڈریشنوں کا الحاق ہے۔ اس اعتبار سے یہ ملک میں کھیلوں کی برادری کی ایسی چھتری ہے جس کے تلے پاکستان اسپورٹس کے بہترین اذہان روشن مستقبل کی جدید سائنسی بنیادوں پر منصوبہ بندی اور حکمت عملی مرتب کرنے جیسی اہم اور حساس قومی ذمے داری نبھاتے ہیں۔

لیکن ہمارے ہاں کیا ہوتا رہا، اس کی مختصر روداد پڑھ کر شاید آپ کو جھرجھری آ جائے اور یونانی المیے کے ڈرامائی سین یاد آجائیں۔

آئیے احساس زیاں کرتے ہوئے اصلاح احوال کی خاطر اس منجمد جھیل میں ایک اور پتھر پھینکتے ہیں کہ فرانسس بیکن کے بقول "انسانوں کو جان لینا چاہیے کہ انسانی معاملات کے تھیٹر میں صرف دیوتا اور فرشتے ہی تماشائی ہوسکتے ہیں۔"

پاکستان کے خالق قائداعظم محمد علی جناح نے پہلی اولمپک گیمز کے موقع پر اپنے پیغام میں نوجوان نسل کے لیے اولمپک کی اہمیت واضح کرتے ہوئے فرمایا تھا "صحت مند دماغ کے لیے صحت مند جسم لازم ہے۔ اسی لیے اقوام عالم جسمانی تربیت اور کھیلوں کے فروغ کو خصوصی اہمیت دیتی ہیں۔ پہلے اولمپک کھیل کے موقع پر میں پاکستانی قوم کو اولمپک کے نمائندہ ماٹو "بلندتر، تیزتر اور مضبوط تر" کو اپنانے کا پیغام دیتا ہوں۔"

کیا پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن ان اعلیٰ مقاصد کے حصول سے انصاف کر پائی؟ وطن عزیز کی چالیس فیڈریشنوں کی ماں اور چھتر چھایا ایسوسی ایشن میں گزشتہ دس بارہ برس سے کیا کھلواڑ جاری ہے، اس کے ادراک کے لیے تاریخی حقائق کے اجمالی جائزے پر نظر دوڑانا ضروری ہے۔ تاہم طوالت سے بچنے کے لیے غیر ضروری تفصیلات سے دانستہ اجتناب برتا گیا ہے۔

☆اس داستان ہوشربا کا آغاز ۲۰۰۰ء سے ہوتا ہے جب سابق صدر جنرل پرویز مشرف نے کھیلوں کے گرتے معیار کی وجوہ جاننے کے لیے اعلیٰ سطحی اجلاس بلایا۔ اس وقت سید واجد علی شاہ ۲۸ برسوں سے تنظیم کی صدارت پر براجمان تھے۔ اولمپک ایسوسی ایشن کی سرگرمیاں ۲ ٹمپل روڈ، اولمپک ہاؤس لاہور کے دفتر میں محدود، منظور نظر افراد کو مختلف فیڈریشنوں کے کلیدی عہدوں کی ریوڑیاں بانٹنے اور اپنا کلہ مضبوط رکھنے تک محدود تھیں۔ غرض راوی ہر طرح چین ہی چین لکھتا تھا لیکن اسی اجلاس نے منجمد جھیل میں پہلا کنکر پھینک کر اس میں ارتعاش پیدا کر دیا۔

ہاکی کے مایہ ناز پاکستانی کھلاڑی سمیع اللہ اور صلاح الدین

صدر مشرف نے کھیلوں کی ناقص کارکردگی کی دیگر وجوہ کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی وجہ فیڈریشنوں پر سالہا سال سے چند مخصوص خاندانوں کی اجارہ داری بتایا گیا تو ان کے عسکری ذہن نے معاملات سدھارنے اور سمت متعین کرنے کی غرض سے بطور پہلا قدم حقیقت پسندانہ قومی اسپورٹس پالیسی کی تشکیل کے احکامات جاری کیے۔

☆پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن سالہا سال سے جمود کا شکار اور عضو معطل بنی ہوئی تھی جہاں تازہ خیالات اور نئے خون کی آمد یکسر شجر ممنوعہ تھی۔ پاکستان کے بڑے

http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

صنعت کار اور پیکیجز کے نیک نام مالک جناب مراتب علی شاہ کے صاحب زادے سید واجد علی شاہ ۴۸ برس سے اس کی صدارت پر براجمان تھے۔ ان کے صاحب زادے، شاہد علی آج بھی انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے ۱۰۸ ارکان میں شامل ہیں۔ لیکن "اسٹیٹس کو" کی عملی تصویر بنی اس بانجھ تنظیم کے پاس سیف گیمز جیسے مقابلے کروانے کی صلاحیت تھی نہ وژن۔

☆۱۹۴۸ء میں شروع ہونے والی پاکستان اولمپک گیمز اور موجودہ دور کی (ہر دو سال بعد منعقد ہونے والی) نیشنل گیمز جس کی پہلی ٹرافی محترم قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی جانب سے بخش دی تھی، آج تک پاک فوج ہی جیتتی آئی ہے۔

☆افواج پاکستان نے جہاں دوسرے کئی شعبوں میں قومی خدمت اور کار خیر انجام دیے، وہیں کھیلوں کے شعبے میں بھی وہ نوجوان نسل کی تربیت اور کردار سازی میں ہمیشہ صف اول میں رہی۔

☆دنیائے کھیل کے بڑے بڑے ہیرو، ہاکی کے دارا، حمیدی، عاطف، ظفر حیات، ظفری، بشیر، رشید سینئر، مشتاق، ذاکر، مدثر اصغر اور اتھلیٹکس کے رازق، خالق، مبارک شاہ، یونس، عزیز، جلال، اللہ دتہ، اقبال، رمضان، صادق اور میلبورن ۱۹۵۴ء میں ۴۴۰ میٹر ہرڈلز میں طلائی تمغہ جیتنے والے مرزا خان پاک فوج ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور پھر کھیل کی دنیا کے بہترین منتظم اور منیجر بریگیڈیئر دارا (مرحوم)، بریگیڈیئر حمیدی، بریگیڈیئر عاطف (مرحوم) اور بریگیڈیئر سرفراز آرمی ہی سے آئے۔

☆دیگر اداروں کی نسبت پاک فوج وہ واحد ادارہ ہے جو ہمیشہ سے ملک اور معاشرے کے لیے کھلاڑی خود تیار کرتا آیا ہے۔ شروع میں ملٹری کالج جہلم کی بوائز اسکیم (Boys Scheme) اور بعدازاں ۱۹۹۱ء سے شروع ہونے والی ینگ بوائز اسکیم (Young Boys Scheme) میں پورے ملک سے چنے گئے بارہ سال کے بچوں کو ۵ سال کی تربیت کے بعد ایک سپاہی اور کھلاڑی بنانا مقصود تھا۔ یہ اسکیمیں بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔

۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائیوں کے متعدد ہیرو ملٹری کالج جہلم کی بوائز اسکیم کی پیداوار تھے۔ ۲۰۰۲ء میں کامن ویلتھ گیمز مانچسٹر کے باکسنگ کے گولڈ میڈلسٹ حیدر علی اور باکسنگ کے عالمی برانز میڈلسٹ نعمان کریم اور بے تحاشا قومی چیمپئن اور قومی ریکارڈ ہولڈر اسی بوائز اسکیم کی پیداوار ہیں۔

☆میکسم گورکی نے کہا تھا "ہاتھوں کو مسلح کرنے سے پہلے دماغوں کو مسلح کرنا ضروری ہے۔" اسی فلسفے کے تحت اب بھی پاکستان آرمی اسپورٹس ڈائریکٹوریٹ کے زیراہتمام ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۶ء کے دورانیے کے لیے ایک سو نوجوانوں کو اعلیٰ درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ اتھلیٹکس، جوڈو، جمناسٹک، تائیکوانڈو میں مستند کوچوں کی زیرنگرانی تربیت دی جا رہی ہے۔

☆پاک افواج میں یہ احساس بڑی شدت سے پروان چڑھ رہا تھا کہ پاکستان کے اسپورٹس ٹیلنٹ کی تربیت اور اسے عالمی سطح پر متعارف کرانے کے لیے جس وژن، فعالیت اور جذبے کی ضرورت ہے، وہ پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن میں مفقود ہے۔ سو اب اس کے معاملات درست اور شفاف انداز میں چلانے کے لیے نئی سوچ اور قومی جذبے سے سرشار قیادت وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

☆وزارت کھیل کے زیر اہتمام بریگیڈیئر مرحوم صولت عباس، ڈی جی اسپورٹس بورڈ کی زیرنگرانی مختلف اسٹیک ہولڈرز سے مشاورت اور ان کی آرا کی روشنی میں قومی اسپورٹس پالیسی کو حتمی شکل دی گئی۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

☆ ۲۰۰۲ء میں قومی اسپورٹس پالیسی کی تشکیل عمل میں لائی گئی جو درست سمت میں اچھا آغاز تھا۔ بہ چند یہ پالیسی معروضی حقائق سے کسی قدر کٹی ہوئی اور بہت سے نقائص سے پر تھی۔ اس میں بڑی خامی پاکستان کے مختلف اداروں کو جو کھلاڑیوں کے اصل والی وارث اور ان کے نان نفقہ روزگار کا ذریعہ تھے، "مین اسٹریم" سے نکال کر انتہائی اہم مقابلوں تک محدود کر دینا شامل تھا۔ لیکن اس نے اصل مرض کی تشخیص بھی بڑی حد تک کر ڈالی۔ وہ کھیلوں کی فیڈریشنوں کے صدور، سیکرٹریوں اور خزانچی کی چار چار سال یا اس سے زائد مدت انتخاب پر پابندی تھی۔ اس پابندی سے کھاب گیر مافیا کو واضح پیغام چلا گیا کہ ان کا کھیل ختم ہو چکا۔

☆ ۲۰۰۲ء میں کابینہ سے باقاعدہ منظوری کے بعد قومی اسپورٹس پالیسی کا نوٹیفکیشن بے اثر کر کے جاری کیا گیا۔

☆ قومی اسپورٹس پالیسی میں فیڈریشنوں کے عہدے داروں کو چار سال کے دو ادوار تک محدود کرنے والی شق کو اولمپک چارٹر کے خلاف قرار دے کر پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن نے لاہور ہائی کورٹ کے پنڈی بنچ سے سٹے آرڈر حاصل کر لیا۔

☆ حکومت پاکستان، منسٹری آف اسپورٹس اور پاکستان اسپورٹس بورڈ نے اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا اور چپ سادھنے میں عافیت جانی۔

☆ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۲۰۰۱ء میں پاکستان میں منعقد ہونے والی سیف گیمز بھارتی سرحد پر کشیدگی کی وجہ سے ملتوی ہوتی گئیں اور یوں ۲۰۰۲ء، ۲۰۰۳ء اور پھر ۲۰۰۴ء میں ان کا منعقد ہونا ٹھہرا۔ سیف گیمز کو منعقد کرنے کے لیے (۱۹۸۹ء) کی طرح دوبارہ آرمی اسپورٹس کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں آرمی اسپورٹس کے سینئر جنرل آفیسر یعنی تب کے ڈپٹی چیف آف جنرل اسٹاف، میجر جنرل عارف حسن، آرمی اسپورٹس ڈائریکٹوریٹ کے عملے کے ساتھ سیف گیمز کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

گو کہ یہ گیمز ملتوی ہوتی گئیں اور اس دوران جنرل عارف ترقی پاتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل بن کے پہلے کمانڈر ۱۰ کور (پنڈی) اور بعد ازاں ملٹری سیکرٹری (جی ایچ کیو) تعینات ہوئے اور ان کی جگہ نئے ڈپٹی چیف آف جنرل سٹاف مقرر کر دیے گئے۔ لیکن سیف گیمز کی آرگنائزنگ کمیٹی کے چیئرمین کی ان کی حیثیت کو بوجوہ تجریہ قائم رکھا گیا۔ یوں ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں لیفٹیننٹ جنرل عارف حسن کھیل کی دنیا میں پہچانے جاتے تھے۔

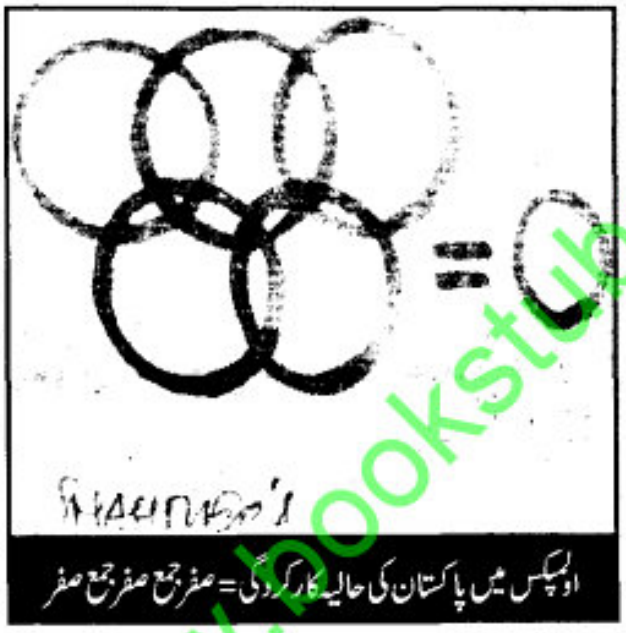

اولمپکس میں پاکستان کی حالیہ کارکردگی = صفر جمع صفر جمع صفر

☆ ستمبر ۲۰۰۳ء میں بریگیڈیئر صولت عباس کے ریٹائرڈ ہونے پر اس وقت کے ڈائریکٹر آرمی اسپورٹس بریگیڈیئر عارف محمود صدیقی کو ڈائریکٹر جنرل پاکستان سپورٹس بورڈ مقرر کیا گیا۔ نئے ڈی جی کو اس عہدے کی مبارکباد دیتے ہوئے صدر پرویز مشرف نے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ اس توقع کا اظہار بھی ہوا کہ ان کی آمد سے کھیل میں بہتری آنی چاہیے اور پھر اس خواہش کا اظہار بھی کہ ۲۰۰۴ء کے دوران پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے انتخابات کے لیے

www.pdfbooksfree.pk

جنرل عارف بہت موزوں امیدوار ہیں۔

فوج میں سینئر کی خواہش ایک حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر کھیل کی دنیا کا مایوس کن ماحول اور ترقی کی راہ میں بے تحاشا رکاوٹیں دیکھتے ہوئے جنرل عارف حسن اس وقت کے مطابق ایک بہت صائب نام تھا۔ پاک آرمی ملک میں کھیلوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی مکمل صلاحیت رکھتی تھی۔

☆ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ انہی دنوں ہمارے ایک ہمسائے اور سیف گیمز کے میزبان نیپال اولمپک ایسوسی ایشن کے الیکشن میں انتخابات کو بوجوہ حکومت مداخلت کالعدم قرار دے دیا گیا۔ یوں نیپال کو پاکستان میں منعقد ہونے والی گیمز میں حصہ لینے کی اجازت نہ ملی۔ پاکستان کی دنیائے کھیل میں ان دنوں اس خبر کا بہت چرچا تھا۔ پھر یہ پتا چلا پاکستان کی اولمپک ایسوسی ایشن نے بھی کچھ اور بڑھا چڑھا کے پیش کیا۔

☆ سیف گیمز منعقد ہونے میں تھوڑا ہی عرصہ بچا تھا لیکن پاکستان میں کھیل کے دونوں بڑے ادارے یعنی پاکستان اسپورٹس بورڈ اور پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن باوجود اسپورٹس پالیسی اور پھر گورنمنٹ کے نئے آرڈر کی وجہ سے تقریباً دست و گریباں تھے اور شاذ و نادر ایک دوسرے سے ہمکلام ہوا کرتے۔ واجد علی شاہ (مرحوم) باوجود علالت اسپتال میں تھے ان کی غیر موجودگی میں تمام لطیف بٹ اولمپک کے کرتا دھرتا بن گئے۔ واجد علی شاہ کے صاحبزادے، شاہد علی شاہ جو آئی او سی کے رکن بھی تھے۔ (دنیا میں صرف ۱۰۸ آئی او سی ارکان انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کے تمام بڑے فیصلوں میں شامل ہوتے ہیں) سین پر موجود تھے۔

☆ نئے ڈی جی اسپورٹس بورڈ کھیل کی تیاریوں کے علاوہ ٹیموں کی تیاری میں بھی مصروف ہو گئے۔ سیف گیمز کا انعقاد ۲۹/ مارچ ۲۰۰۴ء کو ہونا مقصود تھا۔ پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے الیکشن جولائی میں متوقع تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واجد علی شاہ کی بیماری کا عذر پیش کرتے ہوئے پی او اے (پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن) نے آئی او سی سے جلد الیکشن کی اجازت لے لی۔ یوں پی او اے کے الیکشن ۱۳/ مارچ کو منعقد کرنے کی اطلاع سب کو ایک ماہ پہلے یعنی ۱۳/ فروری کو دے دی گئی۔

یہ انتخابات بہت نازک وقت میں ہو رہے تھے کہ چند ہی روز بعد کئی برس سے التوا کا شکار سیف گیمز منعقد ہونا تھیں۔ انڈین اولمپک ایسوسی ایشن اور اولمپک کونسل آف ایشیا کے سیکرٹری جنرل راجا رندھیر سنگھ کی بے تحاشا کوششوں سے نیپال کی حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور یوں فروری میں نیپال کی اولمپک ایسوسی ایشن کو آئی او سی نے بحال کر دیا۔

☆ اس بحالی کو اولمپک چارٹر کی فتح قرار دے کر پورے ماحول کو یہ باور کرایا گیا کہ اولمپک کے معاملات میں گورنمنٹ کی مداخلت کتنی مہنگی پڑ سکتی ہے۔ پی ایس بی (پاکستان اسپورٹس بورڈ) کے لیے ۱۳/ مارچ کو پی او اے کے الیکشن میں بغیر ظاہری مداخلت کے جنرل عارف حسن کو کامیاب بنانا پل صراط پر چلنے کے مترادف تھا۔

☆ پاکستان اسپورٹس بورڈ نے صدرِ مملکت کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے جنرل عارف حسن کی کامیابی کے لیے کوششیں کیں۔ گورنمنٹ کی تمام مشینری کو بہت مہارت سے استعمال کیا گیا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اس وقت کے کھیلوں کے سرکاری اداروں جیسے آرمی، نیوی، ایئرفورس، ریلوے، واپڈا، پولیس، ایچ ای سی کے علاوہ بے تحاشا فیڈریشنوں کے صدور کا تعلق سروسز کے علاوہ سرکاری اداروں خاص طور پر ایف بی آر سے تھا۔ چناں چہ ان محکموں سے مکمل مدد حاصل کی گئی اور پھر الیکشن جیتنے کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

مطلوبہ ووٹ حاصل ہو گئے تو جنرل موصوف نے الیکشن لڑنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ بلا مقابلہ جیتنا چاہتا ہوں۔ آخرکار پنجاب حکومت کی آشیرباد سے یہ مسئلہ بھی خاموشی سے حل ہو گیا۔ ۱۳/مارچ کو جنرل عارف الیکشن جیت گئے۔ موقع کی نزاکت مدنظر رکھتے ہوئے لطیف بٹ کو سیکرٹری رہنے دیا گیا۔

☆ جنرل عارف حسن کی بلامقابلہ انتخاب کی فرمائش بجالانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اس حکم نادر شاہی کی تعمیل میں بریگیڈیئر عارف کو کئی پاپڑ بیلنے پڑے۔ کسی فریق کی ناراضی مول لیے بغیر گوہر مقصود حاصل کرنا بڑی معاملہ فہمی اور دوراندیشی کا متقاضی تھا۔ چنانچہ ایک جناب سید واجد علی شاہ کی طویل [illegible] حالات کو جواز بنایا [illegible] جانب اس مہم میں [illegible] وقت کے وزیراعلیٰ پنجاب جناب پرویز الٰہی سے ملاقات ضروری ٹھہری۔ ان کے گوش گزار صدارتی فرمائش کی گئی تو کرم [illegible] ماہر جہاندیدہ پرویز الٰہی نے چند لمحے توقف کے بعد پوچھا ”کون سے واجد علی شاہ، جنھوں [illegible]“ وسیع دسترخوان اور میزبانی کی شہرت رکھنے والے میزبان [illegible] منتظم جس میں مشکل آسان کروائی ”بریگیڈیئر صاحب، چائے [illegible] جائے گا۔“

☆ سیف گیمز کا انعقاد ۲۹/مارچ تا ۹/اپریل ۲۰۰۴ء بخیر و خوبی ہو گیا۔ پاکستانی دستے نے سیف گیمز کی تاریخ میں ایک بہت اچھی پرفارمنس دی۔ پوری قوم کے علاوہ حکومت پاکستان خاص کر صدر مملکت اور تب کے وزیراعظم ظفراللہ خان جمالی نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ وزیراعظم نے دریادلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھلاڑیوں کو بے مثال انعام و اکرام سے نوازا۔

☆ جنرل عارف حسن نے پاکستان آرمی کی افرادی اور لاجسٹک اسپورٹ سے نہ صرف سیف گیمز کا کامیاب انعقاد کیا بلکہ ان کے کریڈٹ پر ورلڈ پولو کوالیفائنگ مقابلوں کے علاوہ کئی انٹرنیشنل مقابلے اور اسلام آباد گن کلب کا قیام شامل ہے۔ انھوں نے ہیرو کارڈ اسکیم کے کامیاب اجرا کی بدولت حاصل کردہ خطیر فنڈز کھیلوں کے انفراسٹرکچر کی بہتری اور فیڈریشنوں کے مالی وسائل میں بہتری کے لیے استعمال کیے۔ ان کے بہت سے معترف اور معترض ملتے ہیں۔ ذاتی طور پر وہ ایک عمدہ منتظم، نرم خو، شائستہ، مہذب اور جاذب نظر نفیس شخصیت کے مالک انسان ہیں۔

پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے موجودہ سربراہ جنرل (ر) عارف حسن

☆ سیف گیمز کے فوراً بعد پی ایس پی پی او اے سے توقع تھی کہ گورنمنٹ کی پالیسی پر عملدرآمد کرتے ہوئے دو ادوار سے زیادہ والے صدور اور سیکرٹریوں کو گھر بھیجا جائے اور پھر حکومت کے خلاف حاصل کردہ سٹے آرڈر فوراً واپس ہونا چاہیے۔ لیکن پھر صدر پرویز مشرف کے بااعتماد دوست جنھیں [illegible] اسپورٹس پالیسی لاگو کرنے کے لیے خاص طور پر چنا گیا تھا اور حکومت کے مکمل تعاون سے اس مقام پر لایا گیا تھا، نامعلوم وجوہ کی بنا پر لیت و لعل میں مصروف ہو گئے۔ حکومت کے خلاف سٹے قائم رہا اور حکومت کی پالیسی کی خلاف ورزی کرنے والے [illegible]۔ پاکستان کا اسپورٹس مافیا اپنے مفادات کے تحفظ میں انتہائی سفاک ہے۔ کئی صاحبان زندگی میں کسی بھی کھیل کے بھی نزدیک نہ گئے اور محض جوڑ توڑ سے عہدہ حاصل کرلیا۔ پھر کچھ ایسا بھی ہوا

www.pdfbooksfree.pk

کہ ایک کھیل کے دس سال صدر رہنے کے بعد آٹھ دس سال کے لیے دوسرے کھیل میں چلے گئے۔ کچھ لوگ ساری زندگی تو کچھ اور کھیلتے رہے، عہدے کے چناؤ کے لیے کسی اور کھیل کا انتخاب کر لیا۔

☆ ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۴ء کو صدر پاکستان کے پنڈی کیمپ دفتر میں کھیلوں کی حکمت عملی پر پی ایس بی اور پی او اے نے بریفنگ دی۔ اس کے فوراً بعد بریگیڈیئر عارف صدیقی نے صدر مملکت کو آگاہ کیا کہ سات ماہ کی مدت گزرنے کے باوجود پی او اے نے حکومت کے خلاف سٹے آرڈر واپس نہیں لیا جس پر صدر مملکت نے برہمی کا اظہار کیا۔ ان کے حکم پر جنرل عارف نے ۵/نومبر ۲۰۰۴ء کو یہ آرڈر واپس لے لیا۔

اسی بریفنگ کے دوران ڈی جی پی ایس بی نے صدر مملکت کو یہ بتایا کہ جنرل عارف نے گورنمنٹ کی اسپورٹس پالیسی پر کوئی عملدرآمد نہیں کیا۔ جنرل صاحب نے صدر پرویز مشرف سے کہا کہ انھیں اگر سال ڈیڑھ سال کی مہلت دی جائے تو وہ بہت خوش اسلوبی سے ان تمام لوگوں کو نکال دیں گے۔ صدر مملکت نے کھیلوں کی نئی پالیسی کو پسند کیا اور اسے منظوری کے لیے کابینہ کے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا۔

☆ جولائی 2005ء کو اسپورٹس پالیسی شوکت عزیز کی کابینہ میں پیش کیا گیا۔ اسی دوران اسپورٹس پالیسی ۲۰۰۴ء میں مناسب تبدیلیاں کی گئیں لیکن عہدوں پر تقرری کی مدت کا تعین برقرار رکھا گیا۔

☆ بریگیڈیئر عارف کی بار بار یاددہانیوں کے باوجود جنرل عارف حسن ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس دوران جن انتخابات کا انعقاد ہوا ان میں بیشتر میں پی ایس بی کی کوششوں کے عوض نئے لوگ آ گئے۔

پاکستان میں آئی او سی کے واحد رکن اور (پولو کھلاڑی) ریسلنگ کے صدر شاہد علی شاہ بھی الیکشن ہار گئے۔

☆ ڈیڑھ سال بعد مارچ ۲۰۰۶ء میں قومی اسپورٹس پالیسی کے نگہبان بریگیڈیئر عارف صدیقی سبکدوش ہو گئے۔ اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے تابع مہمل، کرنل صلاح الدین کو ڈی جی اسپورٹس بورڈ بنا معاملہ پھر سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ ڈی جی اسپورٹس گریڈ ۲۰ کی پوسٹ ہے جس پر پہلی مرتبہ کسی کرنل کو تعینات کیا گیا۔

☆ ۲۰۰۸ء میں امیر حمزہ گیلانی مرحوم نے ڈی جی اسپورٹس بورڈ کا عہدہ سنبھالا تو اپنی ذمے داریوں سے وفا کرتے ہوئے قومی اسپورٹس پالیسی کے مردہ گھوڑے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ اس پر فٹ بال، ہینڈ بال، بیس بال، جمناسٹک اور چند دیگر فیڈریشنوں کو جاشیری دے کر دوبارہ الیکشن کروا کے سٹے آرڈر لے لیا گیا۔ واقفان حال بتاتے ہیں کہ ان کٹھ پتلیوں کی ڈوریاں پس پردہ جنرل عارف کے ہاتھوں میں تھیں۔

☆ ماضی کے برعکس اس مرتبہ پاکستان اسپورٹس بورڈ نے پیچھے ہٹنے کے بجائے سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

☆ فروری ۲۰۰۸ء میں جنرل عارف حسن دوسری مرتبہ چار سال کے لیے پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہو گئے۔

☆ اسی اثنا میں پیپلز پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی جس کے نتیجے میں جناب ظفر اللہ جمالی و کھر کا رستہ دکھا کر ان کو چیئرمین اور بھیتے قاسم ضیا کو پاکستان ہاکی فیڈریشن کا صدر بنا دیا گیا۔ وہ پی او اے کی صدارت کے بھی خواب دیکھنے لگے۔

☆ فروری ۲۰۱۲ء میں جنرل عارف حسن نے پی او اے کی صدارت کے آٹھ سال مکمل کر لیے۔ غالب امکان

یہی تھا کہ وہ نئے امیدوار کے حق میں انتخابی عمل سے دستبردار ہو جائیں گے۔ لیکن دو باثر سابق آئی بی پولیس کے اکسانے پر انھوں نے ذہن بدل لیا اور میدان نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔

☆ دوسری جانب پاکستان آرمی کے نمائندے کے طور پر پاکستان ایتھلیٹکس فیڈریشن کے صدر اور لانگ جمپ میں قومی ریکارڈ ہولڈر، میجر جنرل اکرم ساہی کو میدان میں اتارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ادھر قاسم ضیا بھی جو برسوں سے پی او اے کی صدارت کی خواہش دل میں پال رہے تھے، انتخابی اکھاڑے میں کود پڑے۔

☆ افواج پاکستان کے دو سینئر ترین افسران کے مابین مقابلے کے ناپسندیدہ ممکنہ منظر سے بچنے کے لیے نئے امیدوار، جنرل ساہی کی نامزدگی کی باقاعدہ منظوری اس وقت کے آرمی چیف جنرل کیانی سے لی گئی۔ اس موقع پر یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جنرل عارف کو تیسری مرتبہ انتخابی عمل سے دستکشی کا پیغام اعلیٰ سطح پر دیا جائے۔ کیا وہ پیغام کس ذریعے سے پہنچایا گیا یا نہیں، یہ اب تک ایک سربستہ راز ہے۔

میجر جنرل (ر) اکرم ساہی

☆ جنرل ساہی کو میدان میں لاتے وقت کھیلوں کے حلقوں کو بخوبی علم تھا کہ جنرل عارف حکومت کی مدد سے اسپورٹس پالیسی لاگو کرنے آئے تھے اور خود تیسری باری نہیں لینا چاہتے۔ بہرحال اس وقت تک جنرل ساہی کو میدان میں نہ لایا گیا جب تک جنرل کیانی نے آشیرباد نہ دے دی ورنہ دو جنرل آفیسرز کو ایک دوسرے کے مقابل لانا لازماً فوج کے لیے نامناسب صورت حال تھی۔ لاہور میں منعقد ہونے والی پریس کانفرنس میں ڈائریکٹر آرمی اسپورٹس بریگیڈیئر اقتدار نصیر نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ میجر جنرل (ریٹائرڈ) اکرم ساہی فوج کے نمائندہ ہیں۔

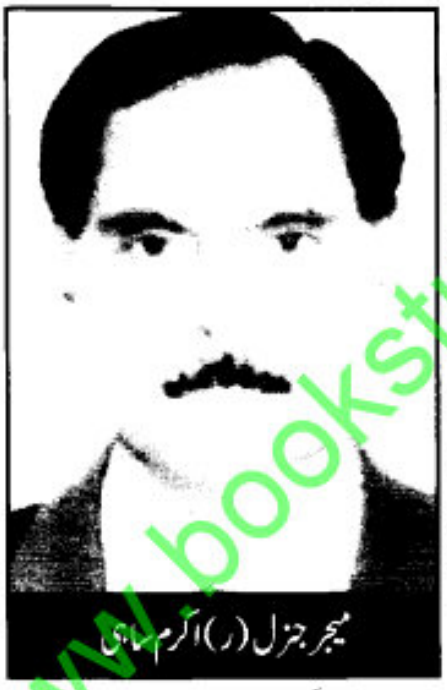

☆ ۱۴ فروری ۲۰۱۲ء کو پی او اے کے انتخابات ہوئے۔ جنرل عارف تیسری مرتبہ صدر منتخب ہو گئے۔ ناقدین کے مطابق الیکشن میں عارف حسن گروپ کی مخالف کئی فیڈریشنوں کو مختلف حیلے بہانوں سے ووٹنگ کے حق سے محروم کر دیا گیا اور ان کے اعتراضات بھی الیکشن کمیشن نے مسترد کر دیے۔ جنرل عارف گروپ نے ۳۸، جنرل ساہی نے ۳۱ جبکہ قاسم ضیا نے ۲۲ ووٹ حاصل کیے۔

☆ حالات نے یکایک ایک اور موڑ لیا، سپریم کورٹ نے حکومت کے حق میں فیصلہ دے دیا جس کی رو سے دو سے زیادہ مرتبہ منتخب ہونے والے تمام عہدے دار غیر قانونی قرار دے دیے گئے۔

☆ اس فیصلے کے اگلے ہی روز پاکستان اسپورٹس بورڈ نے غیر قانونی فیڈریشنوں پر پابندی لگانے کا اصولی فیصلہ کر لیا۔ لیکن آخری لمحات میں وزارت کھیل نے پابندی کا معاملہ پی ایس بی کی ایگزیکٹو کمیٹی میں پیش کرنے کے خیال سے تجویز کیا۔ پاکستان اسپورٹس بورڈ کی ایگزیکٹو کمیٹی تنازع میں الجھنے سے بچنے کے لیے تجاہل عارفانہ سے کام لیتی رہی اور جنرل عارف نے اس موقع کو غنیمت جانا۔

☆ جنرل عارف جو پاکستان حکومت کی مکمل اسپورٹ سے اس عہدے پر پہنچے تھے، آئی او سی میں چلے گئے۔ آئی او سی نے اپنے چارٹر کے مطابق ہمیشہ کی طرح

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

س دفعہ بھی حکومت کی مداخلت کو ناجائز تصور کیا۔ صحافیوں کی مخصوص لابی نے یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی کہ اس مقدمے میں حکومتی دلچسپی سے پاکستانی دستے کو لندن اولمپکس (جولائی ۲۰۱۲ء) سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ یوں یہ معاملہ موخر کر دیا گیا تاکہ اولمپکس میں پاکستان کی شمولیت ممکن ہو سکے۔ اور پھر حکومت کی ملی بھگت سے سارا معاملہ طاق نسیاں پر رکھ دیا گیا۔

☆ ۱۲ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو لاہور ہائی کورٹ نے فروری ۲۰۱۲ تک اولمپکس کے الیکشن میں جنرل عارف کے علاوہ تمام عہدے داروں کو نااہل قرار دے دیا۔ یوں مئی ۲۰۱۲ء کے سپریم کورٹ کے آرڈر اور اکتوبر ۲۰۱۲ء کے لاہور ہائی کورٹ کے آرڈر کے تحت اولمپکس کے عہدہ داران نااہل قرار پائے۔

☆ جنرل عارف گروپ نے دسمبر ۲۰۱۲ء میں نیشنل گیمز کا لاہور میں انعقاد کیا۔ ان کھیلوں سے وفاق اور پنجاب حکومت نے سپریم کورٹ فیصلے کے نتیجے میں مکمل لاتعلقی کا اعلان کیا۔ آرمی، واپڈا، ائیرفورس، اسلام آباد، بلوچستان کے علاوہ ۱۳ نیشنل فیڈریشنز یعنی اتھلیٹک، سائیکلنگ، باکسنگ، جمناسٹک، باسکٹ بال، ہاکی، کبڈی، نیٹ بال، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس اور جوڈو نے کھیلوں میں حصہ نہ لیا۔ یوں یہ قومی کھیل نہ تو نمائندہ رہے نہ کامیاب۔

☆ اولمپک قیادت کے خلا کو پُر کرنے کے لیے بعدازاں حکومت کی اجازت سے پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے دوبارہ انتخابات ۳ جولائی ۲۰۱۳ء ہوئے جس میں جنرل ساہی کو صدر اور خواجہ فاروق سعید کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ حکومت نے اس انتخاب کو اپنی آشیرباد دی۔ بعدازاں حکومت کی مکمل سرپرستی کے باعث جنرل عارف گروپ کو اولمپک ہاؤس لاہور سے بے دخل کر کے اس کا قبضہ جنرل ساہی گروپ کو دلوا دیا گیا۔ لیون ٹراٹسکی نے کہا تھا "زندگی اور سیاست کسی احسان مندی یا شکر گزاری کو نہیں مانتی۔" ولڈ سمتھ کے بقول "ضمیر بزدل ہوتا ہے۔ جن برے کاموں سے یہ روک نہیں سکتا، ان کا جواز تلاش کر لیتا ہے۔"

☆ کھیلوں کے لیے جنرل عارف کی خدمات اور جنون کے بدترین ناقدین بھی معترف ہیں لیکن زندگی کی بھرپور اننگز کھیلنے کے بعد گریز سے آبرو مندانہ رخصتی بھی وقار میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ذات سے بلند ہو کر مشکل بروقت فیصلہ ایک بڑا امتحان بھی ہوتا ہے اور آزمائش بھی۔ نیلسن منڈیلا نے کہا تھا "ہر راہنما کی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اس کے لیے اپنے ساتھیوں سے آگے نکلنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ کوئی سمت تلاش کر سکے۔ سیاستدان اگلے الیکشن اور لیڈر اگلی نسل کے بارے میں سوچتا ہے۔"

☆ [illegible] ڈرامے کا ڈراپ سین غیر متوقع انداز میں یوں ہوا کہ حکومت نے برسوں کے اصولی موقف اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے باوجود ۱۸۰ ڈگری پر یوٹرن لیتے ہوئے زہر [illegible] تسلیم کر لیا۔ وزیر کھیل ریاض پیرزادہ نے عارف حسن گروپ کے جائز اور منتخب اولمپک ایسوسی ایشن ہونے کا اعلان فرما دیا۔ اولمپک ہاؤس لاہور تا حال اکرم ساہی گروپ کے پاس ہے۔ اس کا قبضہ حاصل کرنے کے لیے عارف حسن گروپ نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔

آج ہوا معلوم مجھے اس شہر کے چند سیانوں سے
اپنی راہ بدلتے رہنا سب سے بڑی دانائی ہے

ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ حکومتی مداخلت سے جنرل عارف حسن کو پاکستان اسپورٹس کو دو ٹکڑوں کے مانند

www.pdfbooksfree.pk

چمٹے خون چوسنے والے مافیا سے نجات کے کارِ خیر کے لیے خصوصی طور پر لایا گیا تھا۔ لیکن وہ کانِ نمک میں نمک ہو کر نہ صرف اس کا حصہ بن گئے بلکہ اسی کے کندھوں پر سوار ہو کر حکومتی مداخلت کو جواز بنا تیسری مرتبہ کرسیِ صدارت پر براجمان ہو گئے۔ اسی لیے کہتے ہیں، سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

اس ساری کشمکش سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وطنِ عزیز میں کھیلوں کی تنظیموں میں اکھاڑ پچھاڑ شفاف جمہوری عمل کے بجائے کبھی برہنہ حکومتی مداخلت تو کبھی پسِ چلمن نادیدہ قوتوں کی مرضی ہی سے عمل میں آتی ہے۔ اور اس سارے گھناؤنے کھیل میں جمہوریت، اخلاقیات اور اصول پسندی کا کہیں دور دور تک واسطہ نہیں کیونکہ جمہوریت تو بڑی غیرت مند اور حاسد دلہن ہے، اس کے اوپر سوتن کا سایہ بھی پڑ جائے تو یہ گھر جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

پاکستان سپورٹس بورڈ کے سابق سربراہ
بریگیڈیئر عارف صدیقی

مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ میری یہ معروضات یقیناً کئی پیشانیوں پر ناگوار شکنیں ابھارنے کا باعث بنیں گی، لیکن حقیقت میں غیر جانبداری تو میری نگاہ میں منافقت ہے کہ حضرت ضحاک بن مزاحم کے الفاظ میں "میں ایک پوری رات ایسا لفظ تلاش کرتا رہا جس کو سن کر بادشاہ راضی ہو اور اللہ خفا نہ ہو لیکن وہ نہیں ملا۔"

ایسے وقت جب پاکستان پر دہشت گردی کے گہرے سائے منڈلا رہے ہیں اور پاکستان کھیلوں کے حوالے سے نو گو ایریا بن چکا، کھیل دنیا میں وطنِ عزیز کی نیک نامی اور "سافٹ امیج" کا باعث بن سکتے ہیں۔ ہمیں نوجوانوں کے ہاتھوں میں بم کے بجائے بلا دینے کی ضرورت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ "پنگ پانگ" اسپورٹس ڈپلومیسی کے ذریعے ہی امریکا اور چین میں تعلقات بحال ہوئے۔ جنرل ضیا نے برصغیر پر منڈلاتے جنگ کے بادل بھارت جا کر میچ دیکھنے کے بہانے ٹال دیے۔

لیکن بدقسمتی سے پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن اور پاکستان اسپورٹس بورڈ کے مابین ۲۰۰۵ء سے جاری کھینچا تانی اور اقتدار کی اندرونی کشمکش کے باعث عملاً پاکستان میں کھیل "کومے" کی حالت میں ہیں۔ فریقین اپنی انا اور مفادات کے اسیر بنے مورچہ بند ہیں۔ دلائل کے انبار مگر عمل خیر سے عاری! اس صورت حال کی بہترین تصویر کشی گوئٹے کے اس قول سے ہوتی ہے "سب سے بڑا خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب نصف عقل ایک طرف اور نصف احمق دوسری طرف۔" پاکستان کا بہترین ٹیلنٹ آج ایک نشیب میں اس جوہر میں گر رہا ہے جسے ہم بیوروکریسی کہتے ہیں۔

پاکستان اسپورٹس بورڈ کھیلوں کو نوجوانوں کی توانائیوں کو مثبت سمت دینے اور معاشرے میں سماجی تبدیلی کا پیش خیمہ بنانے میں یکسر ناکام رہا ہے۔ ان برسوں میں پاکستانی اسپورٹس کو ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا۔ لیکن کیا اب بھی کسی کو احساسِ زیاں ہے اور کوئی پاکستان اسپورٹس کے مستقبل کے لیے "روڈ میپ" بنانے میں سنجیدہ ہے؟ پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے دو متحارب گروپوں کے مابین جاری غیر مقدس جنگ میں پاکستان اسپورٹس بورڈ نے پیس میکر کے بجائے معاملات مزید بگاڑ کی جانب لے

www.pdfbooksfree.pk

نے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔
عالمی اولمپک کمیٹی کے واضح اشاروں کے باوجود اس
، ۲۰۱۳ء میں اکرم ساہی گروپ کے تعاون سے قومی
یلوں کا خطیر سرمائے سے انعقاد کیا۔ حالانکہ محض چھے
ل عارف حسن گروپ نسبتاً کم خرچ پر قومی کھیلوں کا
اد کروا چکا تھا۔ پاکستان اسپورٹس بورڈ دو سال گزر جانے
، باوجود اپنی نگرانی میں ہونے والی قومی کھیلوں کا بجٹ
ت کروانے میں ناکام
۔ وہ قومی اسپورٹس
ریشنوں کو خطیر گرانٹ
ی کرنے سے پہلے
تقبل کی منصوبہ بندی
حوالے سے واضح لائحہ
ں دینے سے قاصر رہا
۔ یہ کرکٹ
س نہیں کہ ہوتی
نت میں ترجیح ایسی
ریشنوں کو ملنی چاہیے
وی سطح پر باقاعدگی
اسپورٹس کیلنڈر کے تحت مقابلے منعقد کروائے اور عالمی
ر مقابلوں میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہیں لیکن
ں گنگا الٹی بہ رہی ہے۔
ماضی میں بے شمار مثالیں ایسی ہیں جب منظور نظر
ثر و رسوخ رکھنے والی نئی فیڈریشنیں کسی قابل ذکر
ردگی کے بغیر اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتی رہی ہیں۔
ں جو کسی بھی مہذب معاشرے کی پہچان اور سر کا تاج
رتے ہیں، پاکستان میں ان کی حیثیت ایک بیسوا کی
رہ گئی ہے۔ کسی ستم ظریف نے کیا خوب کہا تھا

"پاکستان میں کھیل وہ یتیم بچہ ہے جو پیدائش کے فوراً بعد بردہ فروشوں کے نرغے میں چلا گیا اور تا حال انھی کی حراست میں ہے۔"

پاکستان اسپورٹس بورڈ کی عمارت ۷۰ء کی دہائی میں عظیم چینیوں نے پاکستان کو بطور تحفہ بنا کر دی تھی تاکہ مستقبل میں یہاں ایشیائی کھیل منعقد ہو سکیں۔ یہ خواب تو شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا البتہ افسر شاہی کو اپنے اللے تللے اور غیر ملکی دوروں کے جواز کے طور پر ایک مستقل سائبان میسر آ گیا۔ کاش ہم بھی دیوار چین اور اہل دیوار والی سوچ اپنا سکیں جہاں جو کام پہلے دیواروں سے لیا جاتا تھا اب دیوانوں سے لیا جاتا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ پاکستان اسپورٹس بورڈ ایک شفاف نظام کے تحت ایسے اقدامات

۱۹۴۸ء کے لندن اولمپکس میں شرکت کرنے والا پہلا پاکستانی دستہ

اٹھائے جن کی بدولت غیر ملکی میڈل پاکستان لانے والی فیڈریشنوں کی حوصلہ افزائی ہو۔
ہمیں بھارت سے سبق سیکھنا چاہیے جس نے ایک مربوط پالیسی کے تحت کرکٹ، ہاکی، ٹینس، بیڈمنٹن اور فٹ بال میں غیر ملکی کھلاڑیوں کو خطیر سرمائے کی ترغیب دے کر اپنے ملک میں لیگ سسٹم پر کھیلوں کی ترقی کی دور رس منصوبہ بندی کی ہے۔ کاش سفید ہاتھی بنے پی ایس بی کو جرمنی، چین یا برطانیہ کے فنی تعاون سے پاکستان کی پہلی اسپورٹس یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا

www.pdfbooksfree.pk

جائے تاکہ اسے قومی وسائل پر پلنے والے چند سو کلرک بابوؤں کے بجائے ایسے قابل اور ماہر کوچ، ٹرینر، جسمانی تعلیم کے ماہر اساتذہ ڈھالنے کے کام میں لایا جا سکے جو ملک کے گوشے گوشے میں تعلیمی اداروں میں نوجوان نسل کو جدید سائنسی تحقیق کی بنیاد پر اعلیٰ سطح کے اتھلیٹ، جمناسٹ اور کھلاڑیوں کی نئی نسل کی تیاری میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

نسٹ کے بریگیڈیئر عارف محمود صدیقی نے بڑا پست جنٹری کی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر تیمور کو ڈالے اشتراک [illegible] ت اسپورٹس کے [illegible] میں ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی [illegible] تعلیم کو ممکن بنانے کی [illegible] پہلا مخلصانہ قدم اٹھایا [illegible]۔ خدا کرے یہ پہل منڈ [illegible] چڑھ سکے۔ رمضان ساز [illegible] نسٹ کی یہ بامعنی کاوش پاکستان اسپورٹس کے لیے [illegible] چیلنج [illegible] اور [illegible] ثابت ہو سکتی ہے [illegible] ہماری یونیورسٹیوں سے [illegible] کردہ ڈگریاں تو تعلیمی اخراجات کی رسیدوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

عمران خان اور راقم الحروف

اب پاکستان اسپورٹس بورڈ اور پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کے دفتروں میں بیٹھ کر [illegible] اور طوطا مینا بنانے والے آتش بیان بابوؤں کا راج [illegible] تیزی سے گزرتا زمانہ کسی آتش فشاں کی تلاش میں ہے۔ وہ شخصیات جنھوں نے پس پردہ رہتے ہوئے اپنے ذاتی تعصبات، ترجیحات اور مفادات سے بالا ہو کر پاکستان کو عالمی چیمپئن دیے، اب نہیں رہے۔ ہمارے حصے میں تو بس ایک ہجوم آیا سرگشتہ اور برگشتہ! قدرت کا سارا نظام اصولوں کے تابع ہے۔ بڑے آدمیوں کی پیدائش کے بھی تو کچھ اصول ہوں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے آدمی انعام کے طور پر دیے اور سزا کے طور پر روک لیے جاتے ہیں۔ عطا تو اسی کے حق میں ہوتی ہے جو حقدار ہو۔ آخر قدرت ایک بے حس ناشکر قوم کو بڑے آدمی کیوں عطا کرے؟ اسے اپنے عطیے کی رسوائی اور بے قدری ناگوار گزرتی ہے۔ شاید اسی لیے گزشتہ تیس برسوں میں مائیں صرف افسر اور تاجر ہی جنتی رہیں۔ ممکن ہے قدرت اس فیاضی کا جو اس نے ۶۰ء کی دہائی میں دکھائی تھی، حساب لے رہی ہو۔ جو ملک اور قومیں اس میزان پر پوری اتریں، انھیں مزید بڑے آدمی عطا ہوئے اور جو ناکام رہیں، انھیں سزا کے طور پر ایسے لوگ ملے جو شامت اعمال ہوا کرتے ہیں۔

[illegible] زاری کا نتیجہ بے جہتی کی صورت ہی میں سامنے آتا ہے اور جہاں نہ شعر گزار اور بے [illegible] ہو جائیں، وہاں منافقت کا دور دورہ رہتا ہے۔ پاکستان اسپورٹس کو آج قحط الرجال کی اسی صورت کا سامنا ہے۔ نتیجتاً

ہمارے شہروں میں پست قدوں کی حکمرانی ہے
جو ان کے سر سے اونچا ہو، وہ باقی نہیں رہتا
کئی دن سے مجھے بس اپنے گھر کی فکر لاحق ہے
منافق جس میں لمٹے ہوں وہ گھر باقی نہیں رہتا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ایک پری رونے لگی جب

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

نکاح کا وعدہ

ں باتوں میں ایک سفید پوش حسینہ کو دل دے دینے والے مریض عشق کی داستان

ان دنوں کا قصہ ہے جب آتش جوان تو راقم آتش فشاں تھا۔ پورے ناظم آباد میں ہماری ذہانت اور جسامت کا ڈنکا بجتا تھا۔ خود سر اتنا کہ

ں اکبر الٰہ آبادی۔

موج نصیحت اک طرف، سیل کی روانی اک طرف
کل شیخوپورا اک طرف، میری جوانی اک طرف

ہماری آل ناظم آباد" شہرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم فٹ بال" کے مایہ ناز کھلاڑی ہونے کی حیثیت سے اپنے محلے کے ہیرو تھے۔ ایک بار ہماری ٹیم ایک ٹورنامنٹ کے فائنل میں تھی۔ کھیل بڑے زور و شور سے جاری تھا۔ تماشائی میدان میں سوکھے چھلکے پھینک پھینک (بلکہ مار مار کر) کھلاڑیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ ہم سینٹر فارورڈ کی پوزیشن پر کھیلتے ہوئے دشمن کے گول پر تابڑ توڑ ناکام حملے کر رہے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ کھیلتے کھیلتے اچانک ہمارا سر چکرانے لگا

www.pdfbooksfree.pk

۔ پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ واقعی زمین گھومتی ہے، بلکہ اس وقت خود ہمارے گرد گھوم رہی تھی۔ ہم لڑکھڑا کر "گراؤنڈ بوس" ہوا چاہتے تھے کہ ایک ساتھی سہارا دے کر باہر لے آیا۔ گھر پہنچنے تک جسم میں بخار کی حرارت ہو چلی تھی۔ بزرگوں کے منع کرنے کے باوجود ہم نے ٹھنڈے پانی سے غسل عرض کیا اور دفع حدت کے لیے پنکھے کے نیچے لیٹ گئے۔

بس پھر کیا تھا، بخار کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہوتا گیا اور تھرمامیٹر اس کی پیمائش سے عاجز نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب بلوائے گئے۔ انھوں نے کئی گھنٹے کا اوقات نامہ مرتب کر کے دوائیں تجویز کیں اور شیڈول کے لحاظ سے فیس (ٹی اے، ڈی اے) لے کر رخصت ہوئے۔ تاہم مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ والد صاحب کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلانا چاہتے تھے مگر والدہ کے بے حد اصرار پر ہمیں اوقات سے قریب ایک نجی اسپتال کے نیم پرائیویٹ کمرے میں داخل کرا دیا گیا جہاں ہنگامی علاج شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موت اور زندگی کے درمیان کشمکش کا آغاز ہو گیا صبح ہونے تک زندگی پوائنٹس پہ جیت گئی۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ اہل خاندان نے بستر کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تسبیح تھی، کسی کے ہاتھ میں دم کیے ہوئے پانی کی بوتل، کوئی جوس پکڑے کھڑا تھا، تو کوئی بغیر کسی روحانی آلے کے یونہی آہ و واویلے سے لو لگائے ہوئے تھا۔ سب کے چہروں پر پریشانی، تشویش اور تھکن کے آثار تھے لیکن دور کونے میں ایک چاند چہرہ ستارہ آنکھیں قسم کی انجان حسینہ تازگی اور فرحت کا پیغام لیے مسکرا مسکرا کر ہمیں دعوت نظارہ دے رہی تھی۔

ہم تمام افسردہ چہرے نظر انداز کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت ٹرے تھی جس میں غالباً ناشتا تھا۔ لیکن ہمارے لیے ناشتے سے زیادہ ناشتے والی میں کشش تھی جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خراماں خراماں معطر معطر ہماری طرف بڑھ رہی تھی۔ عیادت کے لیے آنے والے دوسرے لوگ ہٹتے گئے، فاصلے گھٹتے اور عالم سوچ کے بندھن کٹتے گئے۔

چند ہی لمحوں میں جب وہ خوبرو رو برو ہوئی تو عقدہ کھلا کہ نرس تھی اور ہمارے لیے دوائیں لائی تھی۔ ایسا حسین مہربان نوجوان اور فیاض تیمار دار دیکھ کر ایک لمحے کے لیے خود پر بڑا طیش آیا کہ پہلے کبھی اتنے بیمار کیوں نہ پڑے؟ یہ کیا کہ "بندہ" ایک دو دن گھر ہی میں لوٹ پوٹ کے کھڑا ہو جائے۔ قریب پہنچ کر اس عفیفہ نے بڑے پیار سے اپنا نرم و نازک ہاتھ ہماری کلائی پر رکھ دیا۔ اس نے نبض کی رفتار گننی شروع کی اور ادھر یہ کیفیت ہوئی کہ مومن کے الفاظ میں:

"اس نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا
ہاتھ سے میرے میرا دل بھی چلا

پھر اس دواں دشمن نے کمال شائستگی سے ایک انجکشن ہمارے بازو میں گھونپ دیا۔ ہمیں تکلیف کے بجائے ایک گونہ راحت کا احساس ہوا۔ بعد ازاں چند ایک کڑوی کسیلی گولیاں دو دو کر کے کسیلے مکسچر کے ساتھ ہمیں دی گئیں جنھیں ہم ایسے مزے سے کھا گئے جیسے جلیبیوں کو شہد میں گھول کر نوش جاں کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نیند کی وادیوں میں جا پہنچے لیکن حالت یہ رہی:

آنکھیں کھولیں کبھی بند کبھی کیں
وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

دوپہر کے قریب کسی کے نرم و گداز ہاتھوں کا لمس پیشانی پر محسوس ہوا۔ آنکھ کھلی تو اسی قاتلہ عالم کی یہ گوہر افشانی سنی "اٹھیے۔ آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔"

آواز کی شیرینی سے یوں لگا گویا ملکہ ترنم (جو اس

www.pdfbooksfree.pk

وقت حیات تھیں) یہ نفس نفیس اس کے گلے میں رہائش پذیر ہوں۔ "لیکن خالی پیٹ نہیں" یہ کہہ کر اس نے یخنی کا پیالہ ہماری طرف بڑھایا جسے ہم نے سقراطی انداز سے حلق میں انڈیل لیا۔ شام تک طبیعت کچھ کچھ سنبھل چکی تھی۔ گھر والوں کے چہروں کی بشاشت بھی لوٹ آئی...... لیکن محض عارضی طور پر۔ رات گئے پھر سانس اکھڑنے لگی اور حالت غیر ہوگئی۔

ہنگامی ڈیوٹی کے ڈاکٹر کی تلاش ہوئی اس لیے کہ ہم "کوما" میں چلے گئے تھے۔ رشتے داروں کے بیان کے مطابق ڈاکٹر صاحب اگر تاخیر سے پہنچتے کہ اگر تھوڑی دیر ورنہ آتے، تو کومے کی جگہ "فل اسٹاپ" لگ جاتا۔ پوری ات کباب سیخ کی طرح ہم کروٹیں بدلتے گزری۔ صبح وپری رو غالب کے اس شعر کی مجسم تفسیر بن کر پھر آ پہنچی

لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں

اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

اس وقت تک کچھ بغدادی قسم کے معالج بھی آ چکے تھے جنھیں عرف عام میں "اسپیشلسٹ" کہا جاتا ہے۔ وہ مارے علاج کے سلسلے میں باہم صلاح مشورہ کرنے لگے رہم نیم بے ہوشی کے عالم میں رضی اختر شوق کا شعر زیر ب بڑبڑا رہے تھے

ایک طرف میں جاں بہ لب تار نفس شکستنی

بحث چھڑی ہوئی ادھر چارہ گروں کے درمیاں

ڈاکٹر نے نسخے میں ایک نیا شربت بڑھا دیا اور ہم ں کے شربت دیدار سے پیاس بجھاتے رہے۔ تاہم ں شربتوں نے مل کر ما۔ العلم دو آتشہ کا کام کیا اور ہر تک ہمیں اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہماری محسنہ نے تیمار داری حق ادا کر دیا تھا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ٹمپریچر، نبض، بلڈ شر وغیرہ چیک کرتی اور دل نشین انداز میں تسلی دیتی۔ ہی جسم میں بات چیت کی قوت آئی، ہم نے پوری

صاحب مضمون

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی دہلی میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان عمل میں آیا، تو والدین کے ہمراہ کراچی چلے آئے۔ تعلیم پانے کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلی تحریر ۱۹۶۲ء میں مجید لاہوری کے رسالے نمکدان میں شائع ہوئی۔ اب تک مزاح اور دیگر موضوعات پر ۲۳ کتب چھپ چکی ہیں۔ چھتیس برس تک محکمہ سندھ سوشل سیکیورٹی سے وابستہ رہے اور بحیثیت ڈائریکٹر ریٹائرڈ ہوئے۔ آپ کی مزاحیہ تحریریں پڑھتے ہوئے ہولے ہولے قاری کی چٹکیاں بھرتی اور اسے مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں

نیاز مندی سے اس کا نام پوچھا۔

"شگفتہ" اس نے والہانہ انداز میں جواب دیا اور چہکی "اب آپ کیسے ہیں؟"

ہم نے ایسے موقع کے لیے مخصوص مرزا نوشہ کا مشہور و معروف شعر (ان کے دیکھے سے جو......) پڑھنا شروع ہی کیا تھا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید اسے غالب سے کچھ زیادہ عقیدت نہیں ورنہ شعر تو برمحل تھا۔ لیکن جناب وہ تو آفتاب احمد خان سے زیادہ غالب شناس نکلی۔ بولی "ایسا نہ کہیے، اب آپ کا حال واقعی اچھا ہے۔"

اس نے پھر ہماری کچھ تفصیلات جان کر اپنے ذخیرۂ علم میں اضافہ کیا۔ یہ وہی تفصیلات تھیں جو عموماً شادی کے فارم میں "درج گزٹ" کی جاتی ہیں یعنی روزگار، آمدنی، مشاغل وغیرہ جو ہم اپنی نحیف و نزار آواز میں اسے بتاتے رہے۔ بات جب خاندان اور حسب نسب تک پہنچی، تو ہم نے پنڈت گلزار دہلوی کا یہ شعر پڑھا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سنتے ہیں عشق نام کے گزرے ہیں اک بزرگ
ہم لوگ بھی فقیر، اسی سلسلے کے ہیں

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی گویا اور بھی شگفتہ ہوگئی۔ یہ اس کے ساتھ ہمارا پہلا باقاعدہ ڈائیلاگ تھا۔ پھر تو نواز، زرداری کی طرح "بے فضول" ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب جوں جوں ہماری حالت نارمل ہوئی، گھر والوں کے چہروں پر خوشی اور ہمارے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی، مگر ہم ایسے "سازگار" ماحول میں شفایابی کے لیے ہر گز تیار نہ تھے۔ حضرت داغ بھی شاید ایسی ہی حالت سے دوچار ہوئے تھے جس نے ان سے کہلوایا۔

داغ کے نام شفا سن کے زہے خواہشِ مرگ
منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

ہمیں اسپتال آئے دس دن ہو چکے تھے۔ شگفتہ کا بیشتر وقت ہماری تیمارداری پر صرف ہو رہا تھا اگرچہ وہاں اور مریض بھی تھے۔ یوں تو نرسیں بھی کئی اور تھیں لیکن شگفتہ کی بات ہی کچھ اور تھی۔

وہ آتی تھی تو ہر اک مردہ تن میں جان آتی تھی
وہ جاتی تھی تو اس کے ساتھ سب کی جان جاتی تھی

ایک روز معمول کے "جامع مذاکرات" کے دوران ہم نے اس سے کہا کہ وہ ہمارے جملہ کوائف، شجرۂ نسب اور ذات برادری سے کما حقہ آگاہی حاصل کر چکی، اب کچھ اپنے بارے میں بھی ہماری جانکاری میں اضافہ کرے۔ یہ سننا تھا کہ اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اشکوں کا سیلاب پلکوں کا بند توڑ کر باہر ابل پڑا۔

ہم نے تسلی تشفی دے کر خاموش کرایا، تو اس نے اپنی دل خراش روداد اتنے رقت آمیز لہجے میں سنانی شروع کی کہ نو جوانی کی فلم "بابل" کے آخری مناظر آنکھوں میں گھوم گئے۔ امداد باہمی کے اصول پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے۔ خلاصہ کلام یہ تھا کہ اس کا گھر تقسیم ہند کے ہنگاموں میں تباہ ہو گیا۔ باپ، بھائی اور کئی عزیز بھی آزادی پر قربان ہو گئے۔ وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے بے سروسامانی کے عالم میں پہلے لاہور اور پھر کراچی پہنچی۔ گھر غریب آباد میں ہے، لیکن وہ ہاسٹل میں رہتی اور خاندان کی واحد کفیل ہے۔ یہ داستانِ غم سن کر ہمارا ننھا سا جیا بل کھانے لگا۔ چناں چہ محض حقوق انسانی کے جذبات سے مغلوب ہو کر ہم نے اسے پیشکش کی۔

آؤ مل جل کے علاج غم دوراں کر لیں
زندگی بھر کے لیے عیش کا ساماں کر لیں

اس نے نظریں جھکا لیں، گویا خاموشی نیم رضا۔ ہم نے اسے بتادیا کہ وہ ہماری ہوگئی، تو اس کے خاندان کی کفالت ہمارے ذمے ہوگی۔ ساتھ ہی اس سے وعدہ لیا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بحیثیت شریک حیات اپنی تمام توجہ اور محبت ہمارے لیے وقف کر دے گی۔ اب ہم دونوں کو اندیشہ تھا کہ ہمارا یہ انقلاب آفریں فیصلہ شاید دونوں کے اہل خاندان فوری طور پر قبول نہ کریں۔ لہٰذا طے پایا کہ سب کچھ خفیہ طریقے سے کرنا ہوگا، بزرگوں کو بعد میں منالیں گے۔

ہمیں ڈر تھا کہ ایسا نہ کیا، تو دونوں اپنے اپنے گھروں میں "مائنس ون فارمولا" کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ تقریباً دو ہفتے بعد ہمیں ڈسچارج سلپ مل گئی۔ شگفتہ نے یقین دلایا کہ اسی دن ملازمت کو خیر باد کہہ کہ دوسرے دن علی الصباح نرسنگ ہاسٹل کے کمرے میں ہمارا انتظار کرے گی۔ پروگرام کے مطابق ہمیں لاہور روانہ ہونا تھا تا کہ ایک جگری دوست کے تعاون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کے بعد ہم گھر آئے جہاں دن بھر مبارک باد دینے والوں کا تانتا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بندھا رہا۔ رات کے پچھلے پہر کچھ سکون نصیب ہوا۔ اب دھڑکتے دل کے ساتھ ہم نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے ضروری سامان اکٹھا کیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ رات ہم پر شب عاشور کی طرح بھاری تھی۔ بالآخر تقریباً چار بجے صبح جب تمام گھر والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، ہم بہت مختصر سامان لیے دبے پاؤں چوروں کی طرح گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ''نیٹ اینڈ کلین آپریشن'' تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے ٹیکسی میں بلاوجہ گھومنے کے بعد سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی ہم اسپتال پہنچے اور اپنی بجنی کے کمرے میں شاہانہ وقار کے ساتھ وارد ہوئے۔

یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ شگفتہ اطمینان سے ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے حلیے اور سامان کی ترتیب سے قطعاً اندازہ نہ ہوتا تھا کہ اُسے ہمارے ساتھ زندگی کے ایک عظیم سفر پر روانہ ہونا ہے۔ ہم نے قدرے ترش روئی کے ساتھ اسے مخاطب کیا ''یہاں تو رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں کٹا ہے اور تم نے ابھی تک کوئی تیاری نہیں پکڑی؟''

''کیسی تیاری؟'' اس نے بے رخی کے ساتھ سوال پہ سوال مارا۔

ہم نے اُس کی بے نیازی نظر انداز کرتے ہوئے اسے جھنجھوڑا ''خدا کے لیے شگفتہ، مذاق مت کرو۔ ابھی کل ہی تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ۔۔۔''

''کون سا وعدہ؟'' اس نے پہلے سے بھی زیادہ روکھے پن سے ہماری بات کاٹی۔

ہم نے تقریباً گا کر اسے یاد دلایا ''وہی وعدہ 'نکاح' کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔''

ہماری اس بے تکلفی پر وہ آگ بگولا ہو کے کرجی

''مسٹر! میرے خیال میں آپ جسمانی طور پر تو صحت یاب ہو گئے ہیں لیکن ذہن میں فتور ابھی باقی ہے۔ میں نے آپ کی تیمارداری فرض شناس نرس کی حیثیت سے کی تھی۔ آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور انتہائی شدید نفسیاتی ہیجان کے باعث آپ پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ لہٰذا میرا فرض تھا کہ آپ کی دل جوئی کروں ورنہ آپ کا بچنا محال تھا۔ لیکن آج کل جس کی طرف ذرا مسکر کر دیکھو وہ بوریے بستر سمیت چلا آتا ہے۔''

''تو یہ تمہارا دوسرا روپ ہے؟'' ہم نے دانت پیستے ہوئے طنز کا تیر چھوڑا۔

''میرا ایک اور صرف ایک روپ ہے یعنی پیشہ ور نرس اور بس!'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ساتھ ہی تنبیہہ کی ''اور سُنیے مسٹر دس نمبر، احمقوں کی جنت سے باہر نکل کر حقائق کا مقابلہ کرنا سیکھیے۔''

''اچھا تو اب میں دس نمبری بھی ہو گیا؟'' ہم نہایت اچار لہجے میں منمنائے۔

''نہیں یہ بات نہیں'' اس نے وضاحت کی ''دراصل ہم لوگ مریضوں کو ان کے کمرے یا بیڈ کے نمبر سے پہچانتے ہیں۔''

اب اس کے پاس کہنے کے لیے صرف دو الفاظ رہ گئے تھے یعنی ''گیٹ آؤٹ'' جس کا ہم نے اسے موقع نہیں دیا۔

جب ہم منہ لٹکائے قسمت کا ماتم کرتے، اپنا سوٹ کیس سنبھالے، بوجھل قدموں کے ساتھ اس جفاشعار کے کمرے سے خروج کر رہے تھے، تو دیکھا کہ ایک صاحب 'سونڈ بوز' گردن اکڑائے، سر پر ہیٹ لگائے اور منہ میں سگار دبائے اسی کمرے میں داخل ہونے لگے۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں بھاری بھاری صندوق تھے! ◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

وطن سے دور اجنبیوں کے درمیاں گھری

ایک پاکستانی ماں انگلستان میں

گوروں نے اپنی خوبیوں کے عملی مظاہروں سے اس کو قدم قدم پر حیران و پریشان کر ڈالا

تیسرا حصہ

راشدہ علوی

حوصلے بلند تھے۔ باغ کی شکل و صورت نکھر رہی تھی۔ کمروں میں صوفوں اور کرسیوں پر شیشوں والی گدیاں سجائیں۔ یہاں وہاں گلدان رکھ کر ان میں پھول پتے اٹکائے۔ یوں مکان گھر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اب سجاوٹ کے نئے نئے خیالات جنم لینے لگے۔

ایک دن سیل سے بلور کا فانوس خرید لائی۔ فانوس لگانے کے لیے مقامی اخبار سے چھانٹ کر ایک الیکٹریشن کو فون کیا۔ اس نے دس دن بعد کی تاریخ

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

دی۔ انتظار کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ ہمیں پتا چل چکا تھا کہ یہاں لوگ آج اور کل کے سہارے نہیں جیتے، بات ہفتے دو ہفتے کی ہوتی ہے۔ ڈائری اگلے سال تک کی بھری ہوگی چاہے ماں کے ساتھ کھانا یا بھائی کے ساتھ بازار کا چکر لگانا ہی ہو۔ الیکٹریشن تو ویسے بھی مصروف لوگ تھے، وہ کل کی بات کیسے کر سکتے تھے؟

حسب وعدہ الیکٹریشن صاحب تشریف لائے۔ ڈبا کھول کر فانوس نکالا، تو معلوم ہوا وہ ٹوٹا پڑا ہے۔ صدمے سے جان نکل گئی۔ بندہ دمڑی دمڑی جوڑ رہا تھا اور رام ٹپے لنڈھانے پر کمربستہ تھے۔ الیکٹریشن بولا "جا کر بدلوا لیجیے۔"

بات کچھ سمجھ میں نہ آئی۔ اب اُس نے مکمل جملہ بولا: "فانوس دکان پر واپس لے جائیے اور ان سے کہیں یہ ٹوٹا ہوا ہے، اسے بدل دیں۔"

منہ سے تو کچھ نہ نکلا لیکن دل میں ضرور آئی کہ لو اور سن لو، کہیں ٹوٹا ہوا مال بھی کسی نے واپس لیا ہے؟ دکاندار چیز بیچ چکا، پیسے وصول کر لیے، اب اس کی ذمے داری ختم۔ اب یہ چیز ہماری تھی۔ ہم توڑیں یا سنبھال کر رکھیں ہماری مرضی یا ہمارے نصیب، اس کا کیا تعلق؟ پھر بھی اوپرے دل سے پوچھا "وہ واپس لے لے گا؟!"

اس نے بڑے زعم سے کہا "وہ یقیناً بدلے گا، آپ لے کر تو جائیں۔"

پرانے تجربات کی روشنی میں ادھر اب بھی تردد تھا۔ مگر اس نے کہہ دیا "بی بی اس وقت آنکھیں کھول کر لینا تھا، ہمیں کیا پتا خود ہی پھینک پھانک کر توڑ ڈالا ہو، ہم کیوں واپس لیں۔" تو بڑی ناموسی ہوگی۔ الیکٹریشن اب بھی بضد تھا۔ بولا "فانوس بدل کر مجھے فون کر دیں، میں آ کر لگا دوں گا۔"

وہ چلا گیا، تو کانپتے ہاتھوں سے دکاندار کو فون کیا۔ اس نے جھٹ سے کہہ دیا "ہاں بدل دیں گے۔" پھر بھی یقین نہ آیا۔ لیکن حالت تذبذب میں بوجھل دل سے بھاری ڈبا اٹھا گھر سے نکلی۔ خیال یہی تھا کہ وقت ضائع کر رہی ہوں۔ کبھی ٹوٹی ہوئی چیز واپس ہوئی ہے؟ کس طرح یقین دلاؤں گی کہ فانوس میں نے نہیں توڑا۔

راستے بھر فانوس کے پہلے سے ٹوٹا ہونے کے ثبوت ڈھونڈتی اور اپنی معصومیت کے افسانے گھڑتی رہی۔ کبھی ذہن میں تاریخ کے وہ درخشندہ قاضی آ جاتے جو شکل دیکھتے ہی پہچان لیا کرتے تھے کہ آدمی بے گناہ ہے۔ تمنا ہوئی کاش یہ دکاندار ویسا ہی صاحب بصیرت نکلے۔ کبھی اپنے رزق حلال کے زیاں پر دل کڑھتا۔ غرض بے قصور ہونے کے باوجود سارا راستہ احساس جرم طاری رہا۔ دکان میں داخل ہوئی تو دل حلق میں اٹکا ہوا تھا۔ سامنے ہی ایک سیلز مین کھڑا تھا، دیکھتے ہی بولا "مسز علوی؟"

"ہاں" کہتے ہی اس نے ڈبا میرے ہاتھ سے لیا اور پوچھا "دوسرا فانوس چاہیے یا پیسے واپس لیں گی؟"

حق تو یہ تھا کہ سوال سن کر میں تعجب اور حیرانی سے بےہوش ہو جاتی...... انہونی ہو رہی تھی۔ لیکن خود کو سنبھالا، حلق تر کیا اور دوسرا فانوس مانگا۔ وہ ہنس کر بولا "اس دفعہ ٹھوک بجا کر سو فیصدی ثابت فانوس دوں گا۔ پہلی دفعہ ٹوٹا ہوا دینے پر معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو دوبارہ آنے کی زحمت ہوئی، اس کے لیے شرمندہ ہوں۔"

اب بتائیے کوئی بولے تو کیا بولے!

تجربات کی بھٹی

انگلستان میں بچوں کو اسکول لے جانا اور واپس لانا مسلسل ہے۔ اور کسی ماں کو اس مشقت سے مفر نہیں۔ یہ آپ کو بزور گھر سے باہر نکالنے کا ذریعہ ہے۔ آمدورفت کی یہ ورزش تجربوں کی بھٹی ہے جو آپ کو کندن بنانے کے لیے دہکتی ہے۔ اب آپ کی قسمت کہ سونا بن کر نکلتے ہیں یا راکھ کا ڈھیر۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material

بچوں کو چھوڑتے ہوئے کار سے اترے بغیر بھی کام چل جاتا' لیکن واپسی پر اکثر و بیشتر اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر چھٹی ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ وقت دوسری ماؤں سے میل جول بڑھانے اور گپ شپ کا ہوتا ہے۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ جونہی میں اسکول پہنچی، ایک کے بعد دوسری ماں نے پوچھا، مسز علوی ہو نا؟ اقرار پر بتایا کہ ڈائیا تمھیں پوچھ رہا تھا۔ چھٹی ہوتے ہی بچوں کی استانی باہر نکلی اور بولی ''مسز علوی آپ کا کوئی خط آیا ہے۔ جا کر ڈاک خانے سے لے لیجیے۔''

یا اللہ خیر، یہ کیسا خط آیا ہے کہ پورے شہر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اگلے روز بچوں کو اسکول چھوڑتے ہی ڈاک خانے پہنچی۔ وہاں کافی ہجوم تھا۔ اپنی باری پر کاؤنٹر پر کھڑے آدمی کو اپنا نام ہی بتا پائی تھی کہ وہ بولا ''ایک منٹ مسز علوی'' اور غائب ہو گیا۔ پھر اندر سے ایک لفافہ لا میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا ''مسز علوی پہلے تو میں پوسٹ آفس کی طرف سے معافی کا طلب گار ہوں کہ خط پہنچانے میں تین دن کی تاخیر ہوئی۔ امید ہے اس وجہ سے آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہو گا۔ آپ کے خط پر پتا مکمل نہیں تھا اور غالباً آپ اس علاقے میں نئی ہیں اور زیادہ لوگ آپ کو جانتے بھی نہیں۔ ہمیں کئی اسکولوں میں جا کر پتا کرنا پڑا کہ علوی نام کا کوئی بچہ وہاں پڑھتا ہے، اسی باعث اسکول میں آپ کے لیے پیغام چھوڑا ہے۔ لیجیے اپنا خط۔''

سرسری نگاہ ڈالتے ہی سمجھ آ گیا کہ میری دوست گھر کا نمبر لکھنا بھول گئی ہیں۔ خط ہاتھ میں لیے چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ بڑی مشکل سے شکریے کے الفاظ منہ سے نکلے۔ اس بے چارے کو کیا پتا کہ ہم لوگ ایسے سلوک کے ہرگز عادی نہیں۔

ہمیں تو ڈانٹ پلا کر بھی خط دیا جاتا، تو اف نہ کرتے۔ ہمارے حساب سے اول تو اس خط کو منزل تک پہنچنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بلکہ اس کی اطلاع بھی نہ ملتی۔ بس دوست شکوہ کرتی کہ خط لکھا تھا، جواب نہیں دیا۔ میں شک کرتی کہ جانے لکھا بھی تھا یا نہیں اور بات ختم ہو جاتی۔

اگر کہیں ڈاکیا خط لے ہی آتا، تو پہلے ایک ڈانٹ پلاتا کہ آپ کے دوست عجیب گھامڑ لوگ ہیں، پتا بھی ڈھنگ سے نہیں لکھ سکتے۔ ساتھ طعنے الگ سننے پڑتے کہ آپ کے خط کی وجہ سے تین دن ضائع ہو گئے۔ ہمیں صرف ایک ہی خط تو نہیں پہنچانا ہوتا اور بھی کام ہوتے ہیں۔ طعنوں کے بعد یہ توقع ہوتی کہ یہ احسان کم از کم ہماری سات پشتیں مانیں۔ چونکہ وہ ممکن نہیں اس لیے انھیں انعام و اکرام سے نوازا اور اپنی جائداد کا حصے دار بنایا جائے۔ آخر وہ اپنا فرض پورا کر رہے ہیں۔

عجیب تماشا ہے، یہاں گنگا الٹی بہہ رہی ہے!

ہوا کا خوشگوار جھونکا

میں بچوں کو اسکول سے لینے بس میں جاتی۔ اس دن جہاں مجھے جگہ ملی، وہاں نشست پر ایک دبلی پتلی سفید بالوں والی میم بیٹھی تھی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا ''اس علاقے میں نئی ہو؟''

میرے اقرار پر اس نے بتایا، وہ کئی دنوں سے مجھے دیکھ رہی ہے، لیکن بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر وطن کا پوچھا۔ اس نے پاکستان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ ''کتنا عرصہ ہوا انگلینڈ آئے؟ انگریزی کہاں سیکھی؟'' مختصر یہ کہ سوال پہ سوال کرتی چلی گئی یہاں تک کہ میرا اسٹاپ آ گیا۔ اس کے بعد اکثر ملاقات ہونے لگی۔ آخر میں نے اسے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ آ تو گئی لیکن آتے ہی سب سے پہلے پوچھا ''اتنی جلدی کسی پر اعتبار کیسے کر لیتی ہو کہ گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ انگریز تو کبھی اتنی سرسری ملاقاتوں پر دعوت نہ دے۔''

فرانسس ساٹھ سے اوپر کی چست و توانا خاتون تھی۔

http://www.bookstube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کسی فیکٹری میں جز وقتی کام کرتی۔ اس کا گھر بچوں کے اسکول کے قریب تھا جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ بچاری بے اولاد تھی۔ فرانسس میں انگریزوں والی کوئی بات نہ تھی۔ پہلے تو یہی کہ بڑی باتونی تھی، سوال کرنے کی شوقین، دوسروں کے معمولات میں دخل اندازی کی حد تک دلچسپی لینے والی۔ سچی بات ہے، مجھے اس کی یہی عادتیں اچھی لگیں ورنہ گھر کے دونوں جانب ''خالص'' انگریز ہمسائے رہ رہے تھے۔

ایک نے تو پہلے دن ہی ہیلو کے جواب میں دھمکی دے دی ''اگر ہماری سامان لانے والی وین ان کے [illegible] پتھر سے چھوئی تو وہ ہم پر مقدمہ دائر کر دیں گے۔'' ان کا باغیچہ ہمارے باغیچے سے چھ انچ اونچا تھا۔ اس اونچائی کو پتھروں نے سہارا دے رکھا تھا جنھیں بچانے کے لیے وہ دھمکیوں پر اتر آئے۔

دوسری جانب [illegible] تو نہ تھی لیکن اس نے بھی صاف [illegible] لفظوں میں بتا دیا ''آج تک میں نے نہ کوئی غیر ملکی دیکھا ہے نہ ان سے پالا پڑا۔ اس لیے مجھے کچھ پتا نہیں کہ میرے ساتھ کیا سلوک [illegible]۔''

ان کے مقابلے میں فرانسس کی ذات ہوا کا [illegible] جھونکا تھا، بے تکلف ہونے میں ذرا وقت نہ لگا۔ وہ ہر طرح کا سوال کرتی [illegible] ذاتی، سیاسی، سماجی، کھانے پینے، رہن سہن اور لباس، پاک و ہند کی تاریخ اور مذہب پر۔ پھر ہمی اختلافات پر خوب حیران ہوتی۔ اس نے پہلی بار جب ہمارے گھر سے فون کیا اور پیسے دینے کی کوشش کی، تو

لندن کا ایک ڈاک خانہ

میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ حیران ہو کر اس دریا دلی پر مرعوب ہوئی۔

دس پینی کے اس تحفے پر اس نے مجھے امیر الامرا کا خطاب دیا۔ پہلی بار چائے کے ساتھ کیک پیش کیا، تو کچھ ہچکچائی پھر بولی ''میں اس طرح کی خاطر تواضع ''افورڈ'' نہیں کر سکتی، اس لیے کیک نہیں کھاؤں گی۔'' میں نے بس کر یقین دلایا کہ میں بدلے میں ایسی چائے نہیں مانگوں گی۔ پھر وہی حیرانی...... اتنا بڑا دل؟

کچھ باتوں پر حیرانی جائز تھی۔ برصغیر کے متعلق اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بس یہ علم تھا کہ انگریزوں کی وہاں کافی عرصہ حکومت رہی۔ اپنا مادر وطن بتانے کے لیے اسے کچھ تاریخ بتانی پڑی۔ جب اسے پاک و ہند کے رقیبانہ تعلقات کا یقین ہو گیا تو اس نے بڑی رازداری سے پوچھا ''کیا بھارت میں سچ مچ راجے، مہاراجے ہوتے ہیں؟ اور ان کے محل سچ مچ انگریزی محلوں جتنے بڑے ہیں؟'' میری ہاں کے باوجود اس کی حیرانی میں یقین کی کمی رہی۔

اس کی معلومات کا منبع فیکٹری میں کام کرنے والی گجراتی عورتیں تھیں۔ مزدور طبقے کی معمولی پڑھی لکھی عورتوں پر وہ ہرگز اعتبار کرنے کو تیار نہ تھی۔ ان پر باقی اختلافات کے ساتھ اسے یہ شکایت بھی تھی کہ وہ سردیوں میں ملازمت کی ساتھیوں کے ساتھ چپل پہن کر کام پر آتی اور تنخواہ ملنے پر گرم کپڑے خریدنے کے بجائے سونے کی چوڑیاں لینے دوڑتی ہیں۔ اس کے نزدیک انگریز صرف

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نیک دل اور انصاف پسند تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے سامنے بیٹوں کے سر رکھنے کا سن کر اسے سکتہ ہو گیا۔ یقین ہی نہ آئے کہ انگریز ایسی ظالمانہ حرکت کر سکتا ہے۔ مدتوں لائبریری میں بیٹھ کر کتابیں پھرولتی رہی کہ شاید یہ ثبوت مل جائے کہ ڈائر کے خون میں غیر کے خون کی شمولیت تھی۔ عہد رفتہ کی عظمتیں زندہ قومیں سینوں سے لگا کر رکھتی ہیں لیکن کمزوریوں کو قبولنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

عیسائیوں کا عجب فرقہ

ایک دن ایک خاتون ہاتھ میں بائبل لیے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ عیسائیوں کے ''شہود یہوہ'' (Jehovah's Witnesses) نامی فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ نام میں نے پہلی بار سنا تھا۔ تجسس جاگ اٹھا، ویسے بھی خاموشی و زباں بندی سے بیزار اور تنہائی سے عاجز آئی ہوئی تھی۔ بات چیت کا سنہرا موقع خود سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کو ضائع نہیں کر سکتی تھی، فوراً اندر آنے کی دعوت دی۔

چائے پیش کی، پھر پوچھا، اب بتاؤ یہ کون تھے اور کن باتوں کی گواہی دیتے تھے؟ خاتون کھل اٹھی۔ اس نے میرے اخلاق کی تعریف کی ورنہ بقول اس کے کئی لوگ تو اس کی شکل دیکھتے ہی دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ یہاں نہ صرف دروازہ کھلا بلکہ چائے بھی پیش کی گئی۔ ایک گھنٹے بعد وہ رخصت ہوئی اور اگلے ہفتے آنے کی اجازت چاہی، جو اسے مل گئی۔ اب میری یہ ملاقاتی ہر ہفتے پابندی سے آتی۔ میری چائے پیتی، میرے سموسے کھا کر اپنے عقیدے کی تبلیغ کرتی اور جاتے جاتے کچھ کتابیں اور رسالے پڑھنے کو دے جاتی۔

یہ مذہب عیسائیت اور یہودیت کے بین بین ہے۔ حضرت عیسیٰ کو نہ خدا، نہ اس کا بیٹا مانتے ہیں۔ جنت اور دوزخ، دونوں پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے مطابق اگر ہر شخص حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئے، تو یہی دنیا جنت بن جائے گی۔ حضرت عیسیٰ کی واپسی کا انتظار بھی کرتے ہیں۔ جرمنی میں نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے ساتھ شہود یہوہ کے کئی پیروکار بھی مارے گئے تھے۔ پاکستان میں گھر گھر گھوم کر تبلیغ کرنے والے لوگ بھی اکثر یہی ہوتے ہیں۔

''اے ٹو زیڈ''

ایک دن بچوں کو اسکول سے لیا۔ راستے میں ڈبل روٹی خریدی۔ پھر یاد آیا ڈاک کے کچھ لفافے لیتی چلوں، کئی خط لکھنے تھے۔ اسٹیشنری کی دکان والی گلی میں تھی، وہاں سے ساڑھیوں کی دکان پر نظر پڑ گئی۔ ادھر سے نکلتے ہوئے بچوں کو آئس کریم کی فرمائش کر دی۔ حافظے پر تکیہ کرتے ہوئے واپسی کی ٹھانی تو پتا چلا راستہ بھول چکی۔ کبھی اس گلی میں کبھی اس میں، کوئی چیز پہچان ہی میں نہ آئے۔ سب گلیاں ایک جیسی سب گھر یکساں، پہچانیں تو کیسے؟ چلتے ہوئے کسی گلی کا نام بھی نہیں پڑھا تھا۔ خوب چکر کھا کھا کر گھر پہنچے۔

میاں کو ہماری مشقت کا جوں ہی علم ہوا انھوں نے ڈھائی تین سو صفحات کی موٹی سی کتاب ''لندن اے ٹو زیڈ'' ہاتھ میں تھما دی اور ہدایت کی کہ اس کے بغیر کبھی گھر سے مت نکلنا۔ پیدل جاؤ یا ریل سے، بس سے جاؤ یا ٹیکسی سے، کتاب ساتھ رہے۔ کتاب دیکھ کر سخت وحشت ہوئی۔ نقشوں کے بعد نقشے، لکیروں پر لکیریں، الٹے سیدھے حروف۔ لیکن ایک دفعہ جب سمجھ کر دیکھنا شروع کیا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کیا غضب کی کتاب تھی۔

کفر کا فتویٰ لگنے کا ڈر نہ ہو تو اسے حضرت خضر کا نعم البدل کہا جا سکتا ہے۔ سیدھی راہ دکھائے، گم ہونے سے بچائے، بھٹکائے بغیر منزل پر پہنچائے۔ روایت کے مطابق یہی کام حضرت خضر کرتے ہیں۔ ہم نے اسے سینے سے لگا لیا۔ کچھ دن بعد تو یوں لگا جیسے اس کے بغیر

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ندگی لولی لنگڑی تھی۔ یہ کتاب تھی کہ سہارے کی لاٹھی اب کہیں آنے جانے کے لیے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی۔

اپنے وطن کی بات دوسری تھی۔ وہاں لولی لنگڑی، بے سہارا زندگی آسانی سے گزر جاتی ہے۔ لاٹھیوں اور سہاروں کی کمی بھی نہیں ہوتی۔ کوئی نہ کوئی بوڑھی خالہ، ریٹائرڈ ماموں بے کار عم زاد آس پاس منڈلایا ہی کرتے۔ ان کی زندگی کا احد مقصد لوگوں کو یہاں سے وہاں جانے کا راستہ بتانا ہوتا۔ بلکہ وہ آپ کو گاڑی میں بنفس نفیس لا اور لے جا سکتے تھے۔ یہ عیاشی تھی اپنے وطن کی!

دو دفعہ راستہ پوچھ کر خود جانے کی جرأت کی تھی، نتیجے میں خواری کے سوا کچھ نہ ملا۔ کراچی میں لمبا قیام تھا۔ ایک دوست نے چائے پر مدعو کر لیا۔ جانے کے لیے ان کے گھر کا پتا پوچھا۔ جواب آیا، خیام سینما کے سامنے ہے۔ خیام سینما کا پتا پوچھنے پر بتایا کہ وہ بینڈ بیکری کے سامنے ہے۔ ہم اس سے بھی لاعلم تھے۔ جرأت کر کے پوچھ ہی لیا، یہ دونوں کہاں ہیں؟" ادھر سے آواز میں گرمی آ گئی۔ جواب ملا "نرسری میں اور کہاں۔"

ہم اور بوکھلا گئے اور بے اختیار پوچھ بیٹھے "کون سی نرسری؟"

یہ کم علمی کی انتہا تھی۔ "آپ کراچی میں ہوں اور آپ نرسری کا پتا نہ ہو؟" پارہ درجہ ابال سے اوپر چلا گیا۔ بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔

دوسری مرتبہ زیب النسا اسٹریٹ پر کھڑے ہو کر بندر روڈ پوچھ لیا، بس جناب غضب ہو گیا۔ وہ صاحب تو گلے کا ہار ہو گئے۔ کہاں رہتی ہیں، کیوں رہتی ہیں، کب سے رہتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ابھی تک بندر روڈ کا پتا نہیں؟ تین پشتوں کی تاریخ بتانے کے بعد گلوخلاصی ہوئی۔ اس کے بعد توبہ کر لی اور سہاروں کا سہارا لینے لگے۔ لیکن اب ہم سہاروں اور لاٹھیوں سے آزاد تھے۔ "لندن اے ٹو زیڈ" ہاتھ میں تھی اور لندن مٹھی میں۔ ایک دعوت نامے کو بڑے زعم اور حوصلے سے قبول کیا۔ ہم لندن کے شمال میں تھے اور منزل مقصود کرائڈن جنوب میں۔ اب یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔

راہ دکھلانے والی جادوئی کتاب

اللہ کا نام لے کر کتاب کھولی، راستہ دیکھا، موڑوں پر نشان لگائے اور موٹر میں جا بیٹھے۔ لیکن قسمت یا تربیت کی کمی کہ تیسرے ہی موڑ پر دائیں یا بائیں لکھنا بھول گئے۔ ابھی ہم میاں بیوی کی بحث میں گرمی نہ آئی تھی کہ پیچھے سے آتی گاڑیوں نے ہارن بجانے شروع کر دیے اور میاں نے جلدی سے گاڑی موڑ دی۔ جب تک اے ٹو زیڈ کھول کر گم شدہ موڑ دیکھتے، کار کسی نامعلوم منزل کی طرف میلوں آگے نکل چکی تھی۔

دو چار چکر کاٹنے اور موڑ توڑ کے بعد ہم مغرب و مشرق کی سمتیں کھو بے راہ رو ہو گئے۔ بحث البتہ گرم ہو کر دہکنے لگی۔ جتنے القاب ایک دوسرے کو دیے جا سکتے تھے، دیے گئے۔ قصور وار ٹھہرانے میں بھی بخیلی نہ برتی گئی، لیکن منزل گم گشتہ ہاتھ نہیں آئی۔ کئی لوگوں سے راستہ پوچھا۔ کسی نے دائیں گھما دیا کسی نے بائیں۔ گلی گلی پوچھ پوچھ ذلیل ہوتے گھومنے کے بعد معجزانہ طور پر ہم مطلوبہ گلی میں تھے۔ اب گھر کا نمبر دیکھنے کی کوشش ہوئی۔ معلوم ہوا، کاغذ کا وہ پرزہ جس پر پتا لکھا تھا گھر ہی رہ گیا۔ حلق خشک

www.pdfbooksfree.pk

اور منہ بند تھا، سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ سر پیٹنے کی ہمت بھوک نے ختم کر دی تھی۔ بے ہوش ہونے کی ادا سے ہم عاری تھے، بچے تھک کر سو چکے تھے۔ کار میں مکمل خاموشی تھی۔ بات چیت کی طاقت تھی نہ ضرورت۔ الزامات کی فہرست پہلے ہی کئی بار دھرائی جا چکی تھی۔ میاں بولے "سامنے فون بوتھ ہے۔"

سمجھ میں آیا، نہ سمجھنے کی کوشش کی کہ فون بوتھ کا کیا کریں گے۔ گھر کا نمبر اور فون، دونوں اسی پرزے پر تھے جو گھر رہ گیا۔ منہ نہ کھولنا ہی مناسب لگا۔ کار سے اتر کر فون بوتھ تک گئے اور مسکراتے ہوئے واپس آئے اور کہا "مل گیا۔" میری حیرانی پر بتایا، فون بوتھ کی ڈائریکٹری میں گھر کے پتے اور فون نمبر، دونوں ہوتے ہیں۔ بوتھ کے بالکل سامنے والا گھر ان کا تھا۔ انگریز کے لیے دل سے خیر ساری پر خلوص دعائیں نکلیں۔

ریل کا زیرِ زمین سفر

لندن میں ایک طریقہ سفر زمین کے نیچے بھی ہے، بڑا آسان اور مقبول! کئی قسم کے سر درد سے نجات کا ذریعہ ہے۔ ہاتھ پھولنے اور گم ہونے کے امکانات گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ اے کو زیڈ کا بوجھ کندھے سے اتر جاتا ہے۔ زیرِ زمین یا انڈر گراؤنڈ ریل کا نقشہ چھوٹے سے کتابچے کے ٹکڑے پر ہوتا ہے جو تہ کر کے جیب میں رکھ لیجیے۔ لمبا سفر کم وقت میں طے ہوتا ہے۔ کار کھڑی کرنے کے مسئلے سے واسطہ نہیں پڑتا۔

زن و شوہر کے تعلقات میں کشیدگی نہیں آتی، بلکہ محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتے ہیں۔ اخبار رسالے پڑھنے کا سنہرا موقع ہاتھ آتا ہے۔ امیر و غریب اس کے استعمال پر آمادہ ہیں۔ جیب پر بوجھ قابلِ برداشت ہے اور کیا چاہیے آپ کو؟ دس لاکھ افراد روزانہ زیرِ زمین ریلوے اور ٹیوب سے لندن کے ایک سے دوسرے سرے جاتے ہیں۔ صبح کام پر جانے والوں اور طلبہ کا رش ہوتا ہے۔ دس بجے کے بعد بزرگ و بوڑھے سج دھج کر نکلتے ہیں۔ دوپہر تک اس میں خرید و فروخت کے لیے آنے جانے والی خواتین شامل ہو جاتی ہیں۔ تین بجے اسکول کے بچوں کی واپسی شروع ہوتی ہے۔ پھر دفتروں سے واپس آنے والوں کا تانتا بندھتا ہے۔ شام کو سینما تھیٹر اور کھیل تماشوں کے شوقین اس کا سہارا لیتے ہیں۔

ریل صرف آدھی رات سے صبح پانچ بجے تک بند ہوتی ہے۔ پتا نہیں یہ لندن کے ساتھ سوتی ہے یا شہر اس کے ساتھ سوتا ہے۔ لندن کے دن رات ٹیوب ٹرین کی معیت میں گزرتے ہیں۔ جب پیٹ کے بل رینگتی گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہو، تو لگتا ہے جیسے ہانپتا کانپتا، پھنکارتا، چنگھاڑتا اژدہا چلا آ رہا ہے۔ ایک لمبا سانس پھونکا اور سیکڑوں انسان نکال باہر کیے۔ سانس اندر کھینچا اور پلیٹ فارم خالی ہو گیا۔ ہر تین منٹ بعد یہی منظر دہرایا جاتا ہے۔ دن بھر اسٹیشن بھرتے اور خالی ہوتے رہتے ہیں۔

پاکستانیوں کی انگلستانی بستیاں

شوہر نامدار کو بسلسلہ کام انگلینڈ کے شمالی علاقوں میں جانا تھا جن میں گلاسگو، برمنگھم اور مانچسٹر شامل ہیں۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں، موقع غنیمت جان کر ہم بھی ساتھ ہو لیے۔ ایک تو ان علاقوں کو دیکھنے کا شوق تھا، دوسرے وہاں بے شمار پاکستانی آباد ہیں۔ کچھ سے ہماری پرانی صاحب سلامت تھی۔ ان سے ملاقات کا اچھا موقع تھا۔

گلاسگو لندن سے کہیں زیادہ ٹھنڈا لگا۔ اوپر سے جھیلیں اور بارش سردی کو بڑھاپا پیش کر رہی تھیں۔ ساری ہریالی بارش میں شرابور تھی۔ اس فیاض موسم نے سیر و تفریح کی خواہشات کو گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا۔ کھڑکی سے جھانک کر نظارے لینے کی کوشش کی، تو معلوم ہوا، شہر پورے جوش و خروش سے ادھر ادھر بھاگ رہا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ مجال ہے کسی کو ٹھنڈ نے پژمردہ کیا یا بارش نے پچھاڑا ۔ ابرِ باراں اور یخ بستہ ہواؤں سے بے نیاز شہری اپنے زمرہ کاموں کی تکمیل میں مگن دوڑ رہے تھے۔ ہم اپنے پ پر تف کرتے، اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے، پھر لیے خدا کیا کرتا ہے کا نعرہ مار کر کھڑے ہوگئے۔ جھیلیں اور ک نہ سہی آرٹ گیلریز اور میوزیم بھی تو منتظر نگاہ ہیں۔ ں کی سدا بہار میزبانی کا مزہ بھی چکھنا چاہیے۔

گلاسکو دریائے کلائیڈ کے کنارے آباد ہے۔ دو ہزار ل پہلے یہاں مچھیروں کی بستیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ۵۴ء میں پہلا چرچ بنا۔ اس کے بعد بڑھتے بڑھتے یہ کاٹ لینڈ کا سب سے بڑا اور انگلینڈ کا اہم ترین شہر بن بنا۔ علم و ادب کا گہوارہ ہے اور یہاں کئی آرٹ گیلریاں عجائب گھر ہیں۔ پاکستانیوں میں اس کی وجہ مقبولیت بے شمار کارخانوں اور فیکٹریوں کی موجودگی ہے۔ ان سے اروں پاکستانیوں کا روزگار وابستہ ہے۔ دوسری کچھ ے علاوہ کاج وسکی کی پیداوار کے لیے یہ علاقہ دنیا بھر ں مشہور ہے۔ وسکی نہ سہی اس کے دو چار شکار آپ کو بغیر ی تگ و دو کے کہیں نہ کہیں کسی دیوار سے لگے کسی دہ راہ پر پڑے نشے میں غرق نظر آجائیں گے۔

شہر خوبصورت اور قابل دید عمارتوں سے اٹا پڑا ہے۔ سب معمول ہمارے پاس وقت کی کمی تھی۔ کیتھیڈرل اور د کار میں بیٹھے بیٹھے دیکھا۔ گلیوں اور سڑکوں کے چکر ے۔ میلر اسٹریٹ کی ایک عمارت بڑی منفرد لگی۔ ے یہ تمباکو کے ایک سوداگر کا گھر تھی۔ پھر رائل ایکسچینج طور پر استعمال ہوتا رہا۔ اب وہاں ایک ماڈرن آرٹ ری ہے۔ بدلتا ہے رنگ مکاں کیسے کیسے! گلاسکو کی ل آرٹ گیلری اور میوزیم کی عمارت عظیم الشان ہے۔ ز و شاداب وسیع میدان کے بیچ استادہ ہے۔ ایک دن اسے دیکھنا محال ہے۔ دوسری قسط کا ارمان لیے واپس ے۔ شام کو لوگوں سے ملاقات کے پروگرام تھے۔

پاکستانی گھروں میں بڑی محبت اور گرمجوشی سے استقبال ہوا۔ چائے پر تواضع کے لیے کیک پیسٹریوں کے ساتھ مرغ مسلم اور گوشت کا پلاؤ بھی پیش کیا گیا تھا۔ جو ہمارے نصیب کا تھا، چکھا۔ چائے پیتے ہوئے ہاتھ تاپنے کے لیے ہیٹر کی طرف بڑھائے ہی تھے کہ خاتون خانہ نے پوچھا، آپ کو سردی لگ رہی ہے؟ ہاں سنتے ہی انھوں نے ایک طویل لیکچر شروع کر دیا۔

لب لباب یہ تھا کہ پاکستان کی ترقی نہ کرنے کی وجہ وہاں کے لوگوں کا سردی برداشت نہیں کرنا ہے۔ بڑے زعم سے انھوں نے کہا کہ آپ خود دیکھ لیں، سرد ممالک دولت دنیا سے مالا مال ہیں۔ سڑکیں کھلی اور پیادہ راہوں سے مزین ہیں۔ بجلی پانی کی فراوانی ہے۔ فریج فریزر، واشنگ مشینوں اور ٹیلی ویژنوں سے گھر اٹے پڑے ہیں۔ لوگ ایماندار ہیں۔ دکاندار کم تولتے نہ جھوٹ بولتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب اسی وجہ سے کہ یہ لوگ ٹھنڈے ملک میں رہتے اور خوشی خوشی ٹھنڈ برداشت کرتے ہیں۔

ادھر ہم ہیں کہ ہر وقت ہمیں ٹھنڈ لگا کرتی ہے۔ بہانے بہانے آگ کے قریب گھس کر بیٹھتے ہیں۔ دیکھ لیں پھر ہم کہاں ہیں! بڑے فلسفیانہ خیالات تھے ان کے اور بڑے اچھوتے، شاید ان میں کچھ حقیقت ہو۔ غور و فکر کی ضرورت تھی۔ اس اثنا میں ہم آتش دان سے جتنا دور ہو سکتے تھے، سرک لیے۔ آگ تاپنے کی خواہش دبا کر ہاتھ رانوں کے نیچے دبا لیے تاکہ کپکپاہٹ پر پردہ پڑ جائے۔

لیکچر ڈنڈوں کی طرح تابڑ توڑ سر پر برس رہا تھا۔ منہ بند اور آنکھیں کھلی رکھے سنتے رہے۔ اتنا حوصلہ ہمارے اندر نہیں تھا کہ اپنے پیارے وطن کی ترقی معکوس کی ساری ذمے داری علانیہ اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے۔ اگر ہاتھ ٹھنڈے رکھ کر ملک ترقی کر سکتا ہے تو ہم کیا پوری قوم بے دریغ قربانی دینے کو تیار ہو جاتی۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

مطعم کی قطار میں

گفتگو میں وقفہ آتے ہی بات بدلنے کے لیے ایک اور خاتون کی خیریت دریافت کی جو دور پار سے رشتے دار تھیں۔ بڑی بیزاری سے انھوں نے جواب دیا کہ ہم ان سے نہیں ملتے۔ وجہ کے جواب میں انھوں نے بتایا ''وہ بدمعاش ہوگئی ہیں۔'' مارے حیرت کے کرسی سے گرتے گرتے بچی۔ اس طرح کا کھلم کھلا الزام ہمارے گناہ گار کانوں نے پہلی بار سنا تھا۔ پوچھنا ہی پڑا کہ کیا ہوا؟ بڑی سنجیدگی سے انھوں نے جواب دیا ''وہ کوٹ پتلون پہننے لگی ہیں۔''

یہ حیرت کا دوسرا حملہ تھا۔ کھلی کرسی ہمیں گرنے سے بچا گئی لیکن چائے کی پیالی سے چائے اچھل کر قالین پر جا پڑی۔ دل میں شکر کے کلمات ادا کیے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا جس نے اس دن شلوار قمیص پہننے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ شکر منہ ہی منہ میں ادا ہوا اور ادراک ہو چکا تھا کہ آج کا دن منہ بند رکھنے کا ہے۔

شام کو کھانے پر ایک پاکستانی مطعم میں مدعو تھے۔ اس ہوٹل کی بہت شہرت تھی۔ اس میں جگہ لینے کے لیے لمبی قطار میں کھڑا ہونا پڑتا۔ اس خبر کو ہم نے مبالغہ جانا۔ نہ ہمارے ملک میں قطار لگتی تھی، نہ ہم کبھی کھڑے ہوئے تھے۔ البتہ بعض ہوٹلوں پر ''لائن'' کے نام پر بھیڑ بھاڑ اور اس کے ساتھ مارکٹائی ضرور ہوا کرتی۔ مطلب یہ تھا کہ وہ جگہ شرفا کے لیے نامناسب اور عورتوں کا وہاں جانا ممنوع ہے۔ ان تصورات کے ساتھ مطعم پہنچے، تو نہ صرف سیدھی اور لمبی قطار نظر آئی بلکہ معززین و شرفا کے ساتھ بیگمات یعنی میم صاحبان بھی قطار میں کھڑی تھیں۔

جگمگاتے زیورات میں لدی، اونچی ایڑی کے جوتے اور فرکوٹ میں لپٹی خواتین، سوٹ بوٹ اور ہیٹ میں ملبوس مرد ہلکی ہلکی برف باری میں یوں کھڑے تھے جیسے آئے ہی موسم کا مزہ لینے ہوں۔ کسی میں داخلے کی جلدی، بے چینی، بے کلی یا بے قراری نہ تھی۔ کوئی ابے تبے کی آواز نہ تھی۔ کسی ڈانٹ ڈپٹ کی پھنکار، کسی رعب داب کی جھنکار نہ تھی۔ سکون سے اپنی باری کا انتظار ہو رہا تھا۔ بیرے نے انگلیوں سے تین کا اشارہ کیا، تین لوگ اندر چلے گئے۔ باقی پھر اپنی گپ شپ میں مشغول ہوئے۔

ٹھنڈ میں جمنے سے پہلے ہی ہماری باری آ گئی۔ اندر جانے کے بعد کھانے کی میز دستیاب ہونے تک مزید انتظار باقی تھا۔ یہ انتظار گرم کمرے میں آرام دہ کرسیوں پر متمکن ہو کے ہوا۔ خستہ، گرما گرم اور لذیذ پنیر کے پکوڑے وقت کاٹنے کو سامنے تھے جن کی لذت نے انتظار کی ساری کوفت ختم کر دی۔ ہوٹل کی تزئین شاندار تھی۔ میز پوش مکلف و سفید براق، گلاس شفاف اور چھری کانٹے لشکدار تھے۔ اور کھانا؟ اس کے لیے ہم ہزار بار برف میں قطار بنانے کو تیار ہیں۔

جنھوں نے پردیس میں رنگ جمایا

شہر بہ شہر گھومتے مانچسٹر پہنچے، جہاں قیام چند گھنٹوں کا تھا۔ طائرانہ نظر میں شہر فیکٹریوں، ملوں اور ان کی دھواں دار چمنیوں سے بھرا نظر آیا۔ خاص طور پر کار سے موٹروے پر گزرتے ہوئے۔ دوسری عمارتیں ان ملوں اور کارخانوں کے بیچ شرمندہ شرمندہ سی کھڑی تھیں، جیسے فوٹو کھنچواتے ہوئے امرا کے درمیان غریب رشتے دار کھڑے ہوں۔ شاہراہ سے ہٹ کر شہر میں داخلے کے بعد دنیا دوسری نظر آتی ہے۔ زیادہ تر عمارتیں سرخ اینٹ سے تعمیر ہوئی ہیں۔ بعض بڑی عمارتوں میں چکنا سا سیمنٹی پتھر بھی استعمال ہوا ہے، غالباً یہ بعد کی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہرات ہیں۔
جنگ عظیم دوم کے بعد پچاس اور ساٹھ کی دہائی
، ان فیکٹریوں میں افرادی کی دولت مشترکہ کے
لک سے پوری کی گئی۔ برصغیر اس میں پیش پیش تھا۔
ے شمار پاکستانی اور کشمیری بہتے پانیوں کی رو میں
ستان پہنچے۔ وہ شیفلڈ، مانچسٹر، برمنگھم اور آس پاس
ے علاقوں میں کھپتے چلے گئے۔ کسی کو کپڑے کی
ں میں روزگار ملا، تو کسی کو چینی کے برتن بنانے کے
خانے میں اور کسی کی قسمت اسٹین لیس اسٹیل کی
ت میں جاگی۔ وہ پڑھے لکھے تھے یا نہیں، ان کی
یت مزدور جیسی تھی۔
کئی مزدوروں نے اپنے ہاتھ کی صنعت کاری کا لوہا
یا اور اس کے بل بوتے پر پورے گاؤں کو لندن بلوا
۔ دس پندرہ سال ان مزدور پاکستانیوں نے خاموشی
ے گدھوں کی طرح کام کیا۔ تین تین شفٹیں کیں۔ بیس
لوگ ایک کمرے میں ٹھہرتے اور شفٹوں میں سوتے۔
ں بچوں کے بغیر بھی برسوں اپنے گھر نہ گئے۔ نہ
ں لڑائی جھگڑے میں پڑے، نہ مار کٹائی میں پڑے اور
ن سیاست کی علت پائی۔
پاکستانی پیسا کمانے آئے تھے۔ وہی کمایا اور خوب
ب اللہ نے انھیں نوازا بھی خوب! پہلے لکھ پتی اور کروڑ
کستانی انھی مزدوروں میں اٹھے۔ یہی وہ مرد مجاہد تھے
ں نے کھیرے کے سینڈوچ اور گوبھی کا سوپ پیتے
ڈکار کرتے ہوئے آٹے کی چپاتی کھانے و پکانے پر
کیا۔ گوشت اور مرغی حلال نہ ہونے کی وجہ سے شجر
تھی۔ انھوں نے دال اور سبزی پر گزارہ کیا۔ بھائی
ے چھوٹی موٹی کریانے کی دکانیں کھولنے کی
ں۔ پھر جرأت سے کام لے کر اپنے پچھواڑے

محترمہ راشدہ علوی پٹیالہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد والدین کے ہمراہ راولپنڈی چلی آئیں۔ گریجوایشن کے بعد کچھ عرصہ اسکول میں بچوں کو تعلیم دی۔ شادی کے بعد برطانیہ چلی گئیں اور وہیں آباد ہیں۔ لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی، اس لیے اپنی یادداشتیں لکھنے لگیں۔ آپ کی پہلی کتاب ''بستے بستے بستی'' ہے جو ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ اسلام آباد میں بیتے وقت پہ لکھی گئی۔ دوسری کتاب ''ہرا دھنیا'' ۲۰۱۳ء میں طبع ہوئی۔ اس میں مصنفہ نے لندن میں گزرے لمحات کو دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ زیر نظر مضمون اسی آپ بیتی سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔ اس منفرد آپ بیتی کے چیدہ حصوں سے آئندہ بھی قارئین لطف اندوز ہو سکیں۔

باغیچے میں مرغی اور بکری ذبح کرنے لگے۔ اس طرح ولایتی حلال قصابوں کی روایت پڑی۔ خود حلال گوشت کھایا اور دائیں بائیں کے بندگان خدا کو بھی کھلایا۔ اس وقت کے کئی قصاب آخر کار لکھ پتی ہوئے۔ خلق خدا کا بھلا کرنے والوں کا بھلا خالق نے کیا۔

آج انگلستان میں مقیم پاکستانی حلال برگر کی سلامی دیتے ہیں جو مزے اڑاتے یا باسمتی چاول کی بریانی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، یہ سب انھی مردان آہن کی مرہون منت ہے۔ ورنہ کچھ پتا نہیں، کالے صاحبوں کی طرح روتے دھوتے آلو کے کٹلٹ کھا کر زندگی بتا رہے ہوتے۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ایک سن رسیدہ بزرگ نے ناقابل فراموش مجھے یہ داستان سنائی۔ انھی کی زبانی پیش خدمت ہے:

میرا گاؤں چکوال سے پندرہ میل کی مسافت پر ہے۔ یہ بارانی علاقہ ہے۔ تقسیم برصغیر سے پہلے یہاں ہر طرف غربت کا دور دورہ تھا۔ میرے والد تھوڑی سی زمین کے مالک تھے۔ گاؤں میں چند ہی دکانیں تھیں۔ سب سے بڑی اور اہم دکان ہندو سیٹھ موہن لال کی تھی۔ اردگرد کے چالیس پچاس دیہات میں سب مسلم گھرانے اس کے مقروض تھے۔ اس کا سودی کاروبار عروج پر تھا۔ اس کے بہی کھاتے میں جب کسی غریب مسلمان کے نام قرض کی رقم زیادہ ہو جاتی تو موہن لال عدالت سے ڈگری جاری کروا کر اس کی زمین اپنے نام کروا لیتا۔ اس طرح وہ سود خور بنیا بے شمار مسلمانوں کی زمینوں پر قابض ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اپنی غصب شدہ زمینوں پر ہندو سیٹھ کے مزارع بن کر کام کرتے تھے۔

میرے والد بھی اس سیٹھ کے سودی قرضے میں بال بال جکڑے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہماری زمین بھی موہن لال نے اپنے نام کروا لی اور ہم اس کے مزارے بن گئے جبکہ قرضہ ادا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ میری سات بہنیں تھیں اور بھائی کوئی نہیں تھا۔ ایک دن میں اور میرے والد سیٹھ موہن لال کی دکان

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس نے میرے والد کو
ایا اور کہنے لگا: ''جب تک تم میرا قرضہ ادا نہیں کرتے،
ہمارا بیٹا میرے پاس رہے گا۔ جب قرضہ ادا کرو گے
ٹا واپس لے جانا،

والد صاحب نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے سیٹھ
ے پاس چھوڑا اور آنکھوں میں آنسو لیے چلے گئے۔
س وقت میں سیٹھ کا قیدی بنا، میری عمر نو دس سال
ھی۔ سرِراہ کبھی والد سے ملاقات ہو جاتی۔ وہ روتے
وئے اللہ تعالیٰ کے آگے گڑگڑاتے: ''یا اللہ! تیرے
یصلے کا انتظار ہے۔ ہم مظلوموں پر جو ظلم ہو رہا ہے، تو
سے دیکھ رہا ہے۔'' یہی حال میرے والدہ اور میرے
ھنوں کا تھا۔

ہندو سیٹھ کے ہاں میری ذمہ داری اس کے سامان کا
یال رکھنا، جوتے صاف کرنا، بازار سے خریدا ہوا سامان
ٹھا کر لانا اور جو بھی وہ حکم دے، اس کی تعمیل کرنا
ی۔ کاروباری مصروفیات کی بنا پر اسے اکثر راولپنڈی یا
ہور جانا پڑتا تھا۔ لاہور میں وہ گوالمنڈی میں اپنے ایک
شتہ دار کے ہاں ٹھہرتا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہوتا۔

مارچ 1940ء میں ہم لاہور میں تھے کہ اچانک
یٹھ کے کسی رشتہ دار کی مرنے کی خبر دہلی سے آگئی۔
یٹھ دہلی چلا گیا، میں لاہور میں ہی رہا۔ اس وقت میں
وہ پندرہ سال کا تھا، چنانچہ سارا دن شہر کی سیر
رنے میں گزارتا۔ ایک روز پھرتا پھراتا منٹو پارک کی
رف جا نکلا جو اب اقبال پارک کہلاتا ہے۔ پارک
، اس حصے میں جہاں آج مینارِ پاکستان کھڑا ہے،
نے سے لوگ زمین کو بیلچوں اور کدالوں سے ہموار
رنے میں مصروف تھے۔ مجھے تجسس ہوا۔ میں نے
ب جا کر ایک آدمی سے پوچھا: یہاں کیا بننے لگا

ہے؟ اس نے بتایا کہ چند روز بعد یہاں بہت بڑا جلسہ
ہو گا جس میں قائداعظمؒ بھی تشریف لائیں گے۔ ہم
جلسہ گاہ کے لیے میدان ہموار کر رہے ہیں۔

قائداعظمؒ کا نام میں نے سن رکھا تھا کہ وہ
مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر ہیں۔ میری خوش قسمتی
تھی کہ مجھے ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا موقع مل
رہا تھا، چنانچہ میں نے کہا کہ میں بھی اس کام میں حصہ
لینا چاہتا ہوں۔ آدمی نے مجھے ایک کدال دے دی اور
پھر جب تک میرے بازوؤں میں ہمت تھی، میں اس
کارِ خیر میں مصروف رہا۔ مجھے فخر ہے، میرے ان ہاتھوں
نے 23 مارچ 1940 کے جلسے کے لیے محنت کی تھی۔

22 مارچ کو نمازِ جمعہ میں نے بادشاہی مسجد میں ادا
کی، اس کے بعد منٹو پارک میں چلا گیا جہاں مسلمانوں
کا عظیم الشان اجتماع تھا۔ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ
نہ تھی۔ قائداعظمؒ نے انگریزی میں پُرجوش تقریر کی۔ مجھ
ایسے بیشتر لوگوں کو ان کی تقریر بھلا کیا سمجھ آتی، تاہم ان
کے لہجے کی کڑک اور بار بار مسلمانوں اور ہندوؤں کا ذکر
کرنے سے ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ وہ آزادی کی بات کر
رہے ہیں۔ اگلے روز 23 مارچ کو آخری جلسہ تھا جس
میں شیرِ بنگال مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے آزادی کی
قرارداد پیش کی۔ یہ بعد میں قراردادِ لاہور یا قراردادِ
پاکستان کہلائی۔

چند دن بعد سیٹھ موہن لال دہلی سے لاہور واپس
آ گیا۔ میں نے اس سے منٹو پارک کے جلسے کا کوئی ذکر
نہ کیا کیونکہ میں جانتا تھا، اسے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے
ناموں سے سخت چڑ ہے۔ ہم اگلے روز گاؤں چلے گئے۔
اس کے بعد تحریک چلی اور قائداعظمؒ کا پیغام گاؤں گاؤں
پہنچ گیا۔ پھر 3 جولائی 1947 کا اعلان ہوا جس میں تقسیم

www.pdfbooksfree.pk

ہند کا فارمولا طے پایا۔ اب مسلم اکثریتی مغربی پنجاب پاکستان کا حصہ بننا تھا۔ اس پر مقامی ہندو سخت مایوس اور پریشان ہوئے۔ انھیں زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ انگریز کی حکومت میں انھیں مسلمانوں کا خون چوسنے کے جو مواقع ملے ہوئے تھے، وہ آزاد مسلم ملک پاکستان میں حاصل نہیں ہوں گے۔

یہی وجہ تھی کہ بعض دیگر ہندوؤں کی طرح سیٹھ موہن لال نے جولائی کے شروع ہی میں اپنے بال بچے دہلی بھیج دیے جہاں اس کا بھائی رہتا تھا۔ گاؤں میں وہ تنہا رہ گیا۔ ایک دن اس نے مجھے بتایا، میں نے اپنی تمام زمینیں اور مکانات تمہارے نام کر دادیے ہیں تاکہ کوئی دوسرا ان پر قبضہ نہ کر سکے۔ تمھیں چھ ماہ ان کی حفاظت کرنی ہے۔ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں پاکستان ختم اور دوبارہ ہندوستان میں ضم ہو جائے گا۔ واپس آکر میں تمھیں بہت انعام دوں گا اور کاروبار میں حصہ دار بھی بنالوں گا۔ اس کے منہ سے پاکستان ختم ہونے کی بات مجھے بہت بری لگی، تاہم میں مصلحتاً خاموش رہا۔

اس دوران پاکستان وجود میں آگیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے چہرے اب بجھے بجھے سے تھے۔ ایک روز سیٹھ نے مجھے آدھی رات کو جگایا، چابیوں کا ایک ڈھیر میرے حوالے کیا اور کہنے لگا: میں دہلی جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی مجھے لینے آئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے گھر سے نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے، وہ ہندو سیٹھ جس نے سود در سود کے چکر میں الجھا کر ہماری چند ایکڑ زمین پر قبضہ کر لیا تھا، اس کی تمام زمینوں، دکانوں اور مکانات کے کاغذات میرے پاس آگئے۔ اب میں قانونی طور پر اس ساری جائیداد کا مالک تھا۔ علاقے کے دیگر ہندو سکھ بھی ٹرکوں اور ریل گاڑیوں پر بھارت جا چکے تھے۔

☆☆☆

قارئین کرام! یہ ایک سیٹھ موہن لال کی کہانی نہیں، قیامِ پاکستان سے قبل ہر ہندو بنیا مسلمانوں کا خون چوسنے والا موہن لال بنا ہوا تھا اور سکھ بھی ان سے اچھے نہ تھے۔ ہمارے ایک عزیز دوست محمد احمد ذکی بتاتے ہیں کہ وہ پاکستان کی محبت میں تقسیم کے بعد اکیلے پہلے سندھ اور پھر لاہور چلے آئے۔ شروع میں کوئی خاص کام نہیں تھا، لہٰذا وہ لاہور کچہری میں ملازم اپنے ایک دوست کے پاس جا بیٹھتے۔

ایک روز دوست نے انہیں بہت پرانا ریکارڈ جلانے کے کام میں لگالیا۔ ذکی صاحب بتاتے ہیں ''ریکارڈ جلاتے ہوئے ایک کاغذ میرے ہاتھ آیا جسے پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک سکھ کی طرف سے فکِ رہن کی تحریر تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ میں مسمی فلاں سنگھ ولد فلاں سنگھ مساۃ فلاں زوجہ چراغ دین ولد روشن دین کو جو میرے پاس اتنی رقم کے عوض رہن تھی، مندرجہ رقم کی ادائیگی پر فکِ رہن کر کے آزاد کرتا ہوں۔ میں سوچتا رہ گیا کہ یا اللہ، مسلمان ہندوؤں سکھوں کے آگے اس قدر مجبور تھے!

ایسے دلدوز واقعات ان لوگوں کی آنکھیں کھلنے کے لیے کافی ہونے چاہئیں جو ہندو سے دوستی کے لیے مرے جاتے ہیں۔ بھارتی ہندو، بالخصوص مسلمانوں، اسلام اور پاکستان کے دشمن ہیں، وہ بھارت میں جگہ جگہ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ پاکستان کو دریائی پانی سے محروم کرنے کے لیے متبوضہ کشمیر میں ڈیم بنائے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بھی بعض لوگوں کے نزدیک بھارت ''پسندیدہ ترین'' ہے، بوالعجب!

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سمارٹ ہونے کا دیسی نسخہ

ویگن کی ورزش

جو اس سواری پہ محض ایک ماہ سفر کرے
شرطیہ ساری چربی سے نجات پا لے گا

فردوس عالم

ہمارے ایک دوست کو عجیب سا شوق ہو چلا ہے۔ جب بھی فارغ وقت ملے، مسلسل گردن جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بہت دیر تک [illegible] بھی چڑھے رہتے۔ اکثر و بیشتر [illegible] کے بازار میں [illegible] مجمع میں شامل ہو کر سانس روکنے کی مشق کرتے ہیں۔

آخر جب ہماری حیرت حد سے زیادہ ہو گئی، تو ان سے پوچھ ہی لیا کہ یہ اتنی سخت سخت مشقیں کیوں کرتے ہو؟

کہنے لگے "یہ تو میں مستقل کرتا ہوں کیونکہ مجھے روزانہ ویگن میں سفر کرنا ہوتا ہے۔ ویگن میں صرف وہی شخص سفر کر سکتا ہے جو ہر طرح "پروف" ہو...... یعنی واٹر پروف، شاک پروف، ہوا پروف، لائٹ پروف اور پروف ہی پروف۔ اگر ویگن میں سفر کرنا ہو، تو گردن کا اطلس اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ اس کو خواہ کتنا ہی جھکایا جائے، ٹوٹ نہ پائے۔ گردن ہو تو ایسی کہ اگر اس کے اوپر کچھ گردنیں مع سر کے لاد دی جائیں، تو بیچاری اف نہ کرے...... اور...... ہاں بازو ہوں تو ایسے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ ملنے جلنے پر ضد نہ کریں۔"

یقیناً ہمارے دوست کا بیان بالکل صحیح تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ ہم نے بھی تجربہ کیا۔ ہم سواری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اچانک ایک ویگن ہمارے سامنے رکی۔ دروازہ کھلا، دیکھا تو لوگ اندر حالت رکوع میں ہیں...... کچھ ایسے بیٹھے تھے [illegible] ابھی اترنے والے ہوں۔ کچھ چہرے کی

www.pdfbooksfree.pk

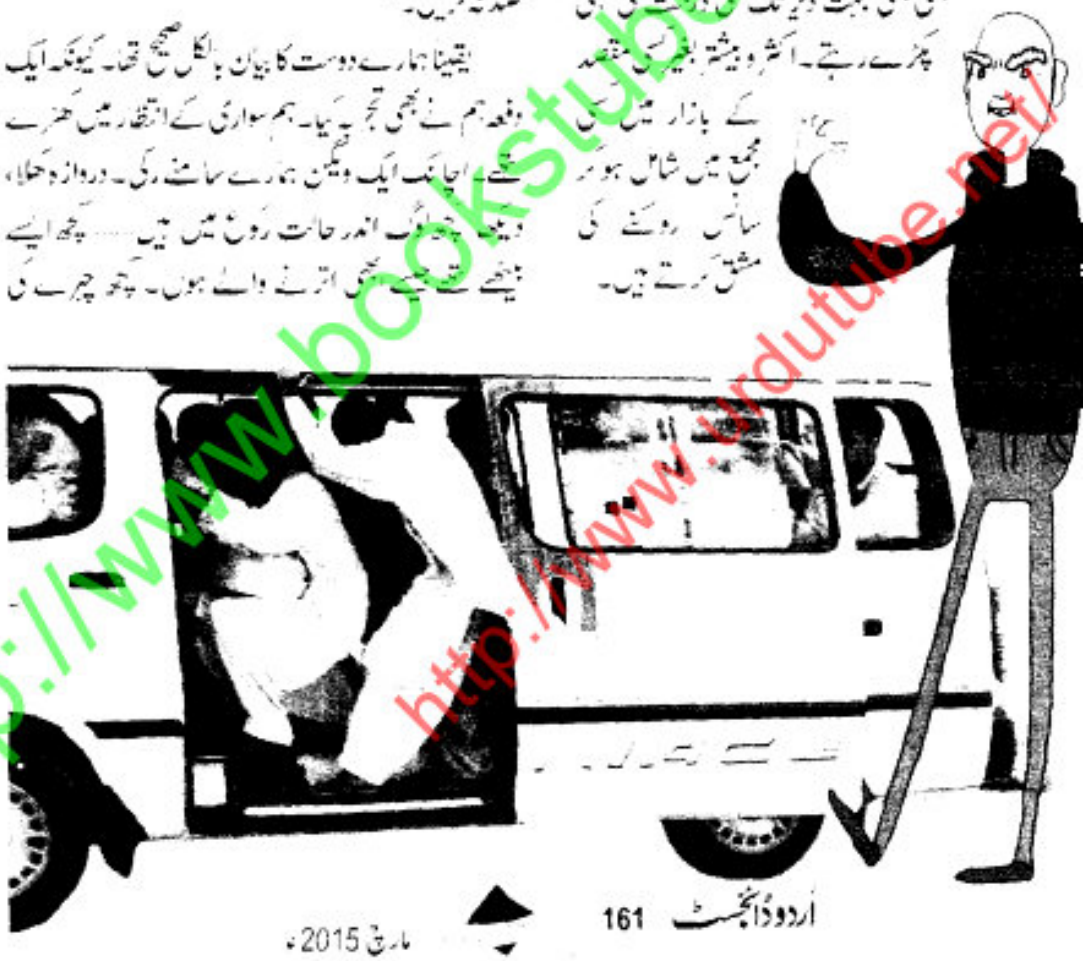

شکنیں بار بار سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ کسی طور سفر سے لطف اندوز ہو سکیں۔ ہم نے اسٹاپ پر کھڑے ہی کھڑے یہ منظر دیکھا۔ ہمارے قدم پیچھے ہٹ گئے۔

ڈرائیور نے کنڈکٹر سے کہا ''سواری باہر کھڑی ہے، اس کو بھی اندر لے آ۔''

کنڈکٹر بولا ''جگہ نہیں ہے۔''

ڈرائیور بولا ''اڑا لے، سنگل پسلی ہے۔ اڑا لے، سوا لاکھ جگہ ہے۔'' یہ ہدایت پا کر کنڈکٹر نے ایک ہاتھ سے ویگن کا دروازہ پکڑا اور دوسرا ہاتھ کمر میں ڈال کر ہمیں اس طرح اٹھایا جیسے ریکٹ سے شٹل کاک اٹھا رہا ہو۔ یوں ہم بھی ان لوگوں کی صف میں شامل ہو گئے جنھیں ویگن میں سفر کرنے پر فخر تھا۔

کہنے کو تو ہم ویگن پر سوار تھے لیکن سچ پوچھیے، تو وہ ہم پر سوار تھی...... بہرحال خوش تھے کہ ہمارا شمار بھی ویگن کی سواریوں میں ہونے لگا۔ ہم نے اپنا ہاتھ نشست کے تکیے پر رکھنا چاہا، تو آواز آئی ''ہائے ہائے۔''

ہم حیران کہ یہ کیسی نشست ہے جس میں سے انسانی آواز آ رہی ہے...... لیکن وہ نشست نہیں بلکہ ایک مسافر کا کندھا تھا...... بہرحال ہاتھ تو کہیں نہ کہیں رکھنا ہی تھا، اس لیے اٹھا کر دوسرے مسافر کے کندھے پر رکھ دیا۔ کبھی کبھی ہاتھ اٹھا کر اپنی ٹانگ پر بھی رکھ لیتے، صرف یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ وہ واقعی جسم سے جڑی ہوئی ہے یا نیچے گر گئی...... نیچے جھک کر بھی دیکھ سکتے تھے، لیکن اگر ایسا کرتے، تو کئی دوسرے مسافر بھی ہمارے ساتھ اڑ...... اڑ...... ر...... دھم کر کے نیچے گر جاتے...... اس لیے جذبۂ خدمتِ خلق کے تحت ہم نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ابھی کچھ دور ہی بڑھی تھی کہ کنڈکٹر نے بڑی شد و مد سے کرائے کا مطالبہ کر دیا۔ ہم ایسی حالت میں نہیں تھے کہ اپنی جیب میں ہاتھ ڈال سکتے کیونکہ بالکل مجسمہ بنے ہوئے تھے۔ یہ بہرحال ممکن بلکہ بہت صحیح اندیشہ تھا کہ ہم جیب میں پیسے نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالیں، تو ہاتھ کسی دوسرے مسافر کی جیب میں پہنچ جائے...... اس اندیشے کی وجہ سے ہم نے کنڈکٹر سے مہلت چاہی کہ جب ہم اتریں گے، تو کرایہ دے دیں گے۔ کنڈکٹر نے ہماری درخواست قبول کر لی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ایک لمبی نشست پر بیٹھے کچھ لوگوں سے کہا ''ساتھ ساتھ ہو جاؤ ساتھ ساتھ ہو جاؤ۔''

جب وہ مسافر اپنی جگہ سے نہ کھسکنے کے برابر کھسک گئے، تو کنڈکٹر نے ہماری طرف ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا اور کہا ''بابو جی! آپ یہاں بیٹھ جائیے۔''

ہم نے پوچھا ''کہاں بیٹھ جائیں؟''

کہنے لگے ''یہاں ہی...... یہ ''سیٹ'' ہے۔''

ہماری آنکھیں کوئی نشست تلاش نہ کر سکیں۔ کنڈکٹر نے بہر طور ہمیں بہ نفسِ نفیس اس جگہ بٹھایا جس کو وہ ''نشست'' کہنے پر مصر تھے...... ابھی کچھ ہی دیر اس نام نہاد ''سیٹ'' پر بیٹھے تھے کہ کنڈکٹر نے ہم سے کہا ''بابو جی! آپ پچھلی سیٹ پر آ جائیے۔''

ہم کئی مسافروں کو پھلانگتے اور رگیدتے ہوئے پچھلی ''سیٹ'' پر پہنچ بیٹھ بلکہ اڑ گئے...... خوش تھے کہ چلو بیٹھنا تو نصیب ہوا۔ ابھی صحیح طرح بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ کنڈکٹر نے کہا ''بابو جی...... یہ کچھ نئی سواریاں ہیں...... آپ ایسا کریں کہ اگلی ''سیٹ'' پر آ جائیں۔''

ہم بغیر چوں و چرا کیے اگلی نشست پر آئے اور تقریباً بیٹھ گئے...... غرض ایک نشست سے دوسری پر، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی پر ہم مسلسل نشستیں بدلتے رہے۔ اس کام کے لیے ہمیں ویگن کے اندر اتنا چلنا پڑا کہ یقین جانیے...... اگر اتنا پیدل چلتے تو نہ معلوم کب کے منزل مقصود تک پہنچ جاتے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

منتخب غزلیں

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوس زیست ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی

قلزم عشق میں ہیں نفع و سلامت دونوں
اس میں ڈوبے بھی تو کیا پار اترنا ہے یہی

قید گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد
تیری زلفوں کا جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی

اور کس وضع کی جویاں ہیں عروسان بہشت
ہیں کفن سرخ شہیدوں کا سنورنا ہے یہی

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

تجھ سے کیا صبح تلک ساتھ نبھے گا اے عمر
شب فرقت کی جو گھڑیوں کا گزرنا ہے یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست
قلب مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

مولانا محمد علی جوہر

ستم ہو، قہر ہو، آفت بلا ہو
یہ سب کچھ ہو، مگر پھر دل ربا ہو

کسی کے غم میں کوئی رو رہا ہو
کوئی پردے سے چھپ کر دیکھتا ہو

بتاؤ کیا تمھارے دل پہ گزرے
اگر کوئی تمھی سا بے وفا ہو

حسن کے ہاتھ میں گر عشق کی تلوار نہ ہو
کوئی یوں جھوم کے سر دینے کو تیار نہ ہو

میں خطاوار، سیہ کار، گنہگار مگر
کس کو بخشے تری رحمت جو گنہگار نہ ہو

مانگ نظارہ بے جلوہ کی توفیق جگر
یہ طلب وہ ہے کوئی جس کا طلبگار نہ ہو

جگر مراد آبادی

دن رات دل اضطراب میں ہے
جی ہے کہ سدا عذاب میں ہے

دل گریۂ گرم و چشم تر کے ہاتھوں
کچھ آتش میں کچھ آب میں ہے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

ہر اک تجھے آپ سا کہے ہے
قضیہ مہ و آفتاب میں ہے

دل کوہ کا ہو گیا ہے پانی
دریا سب اضطراب میں ہے

اٹھ مصحفی آفتاب نکلا
اب تک تو دوانے خواب میں ہے

غلام ہمدانی مصحفی

ہزاروں بار نکلے اشک لیکن پھر بھی کم نکلے
اُنہی اور کیسے آرزوئے چشمِ نم نکلے

کیا پھر جذبۂ بے اختیارِ شوق نے واپس
ابھی ہم کوچۂ جاناں سے تھے دو ہی قدم نکلے

رہے کوئی کہاں تک کشمکش ہائے محبت میں
نہ غم جائے نہ نکلیں حسرتیں دل کی نہ دم نکلے

خیالِ خاطرِ احباب سے رہتے تھے خوش حسرت
محبت میں گرفتارِ غم و رنج و الم نکلے

حسرت موہانی

فکرِ آزادی و آرام سے آزاد رہے
عمر بھر خوب ہوا قیدیِ صیاد رہے

سخت تیزیِ شوق نہ پوچھو، ہم سے
مست ہو کر غمِ کونین سے آزاد رہے

رُوئے جاناں کو نہ حاجت کبھی غازے کی ہوئی
یعنی ہم حیرتیِ حُسنِ خداداد رہے

قصۂ ترکِ محبت کی حقیقت معلوم
حسرتؔ! اور قیدِ غمِ عشق سے آزاد رہے

حسرت موہانی

تدبیر نہ کر، فائدہ تدبیر میں کیا ہے
پوچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہلِ نظر! عالمِ تصویر کو دیکھ
تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے

اے صید فگن کرتا ہے کیوں اتنی چھری تیز
اب باقی بھلا اس ترے نخچیر میں کیا ہے

ہے صیدِ نگہ کہتا قضا سے یہ تڑپ کر
اس تیر میں کیا لطف ہے، اس تیر میں کیا ہے

یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے، نہ کھلے گا
کیا جانے دلِ عاشقِ دلگیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں اور ہم تہِ خنجر
تاخیر ہو کیوں؟ فائدہ تاخیر میں کیا ہے

اترا تھا گلے سے کہ جگر ہو گیا ٹھنڈا
کیا جانے اس آبِ دمِ شمشیر میں کیا ہے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دم ذبح
جو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے
شیخ محمد ابراہیم ذوق

کام مردوں کے جو ہیں، سو وہی کر جاتے ہیں
جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں

موت! کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

دید وادید جو ہو جائے، غنیمت سمجھو
جوں شرر، ورنہ ہم اے اہل نظر جاتے ہیں

آنکھیں اس بزم میں سینکی ہیں جنھوں نے تک بھی
شمع کی طرح گریباں لیے تر جاتے ہیں

بے ہنر، دشمن اہل ہنر سے، آ کر
منہ پہ چڑھتے تو ہیں، پر جی سے اتر جاتے ہیں

ہم کسی راہ سے واقف نہیں، یوں نور نظر
رہ نما تو ہی تو ہوتا ہے، جدھر جاتے ہیں

آہ معلوم نہیں، ساتھ اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے، سو یہ کدھر جاتے ہیں
خواجہ میر درد

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

مے تند و ظرف حوصلۂ اہل بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اس قدر
یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس اب
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا
مولانا حالی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

زندگی خواب پریشاں ہے کوئی کیا جانے
موت کی لرزش مژگاں ہے کوئی کیا جانے

رامش و رنگ کے ایوان میں لیلائے حیات
صرف اک رات کی مہماں ہے کوئی کیا جانے

گلشن زیست کے ہر پھول کی رنگینی میں
دجلۂ خون رگ جاں ہے کوئی کیا جانے

رنگ و آہنگ سے بنتی ہوئی یادوں کی برات
رہرو جادۂ نسیاں ہے کوئی کیا جانے

جوش ملیح آبادی

بار حیات اٹھائیے تنہا اٹھائیے
یہ بوجھ آپ سے نہیں اٹھتا اٹھائیے

وحشت میں خاک اڑانی ہی مقصود ہے تو پھر
اک مشت خاک کیا ہے صحرا اٹھائیے

ان خفتگان خاک کو ہمراہ لے چلیں
قدموں سے ان کے نقش کف پا اٹھائیے

خونبار کرب دید سے ہیں روبرو
اب جس طرف بھی چشم تماشا اٹھائیے

بیمار عصر جلد شفایاب ہو سکے
گہوارہ سے اک اور مسیحا اٹھائیے

دنیا سے زندگی کا بڑا حوصلہ ملا
احساں کی طرح ہر غم دنیا اٹھائیے

نادیدہ منظروں کو اگر چاہیں دیکھنا
اپنی ہی ذات سے کوئی پردہ اٹھائیے

دل میں نفاذ شوق کی طاقت کہاں سے لائیں
کوزہ میں کیا تلاطم دریا اٹھائیے

پامردیوں سے گزرے ہیں جو راہ شوق میں
پھولوں سے ان کی گرد کف پا اٹھائیے

تابش سہارا ڈھونڈیے نہ امید و بیم کا
تب ہی حجاب تمنا اٹھائیے

تابش دہلوی

کچھ بھی نہیں، کہیں نہیں خواب کے اختیار میں
رات گزار دی گئی صبح کے انتظار میں

وقت کی گردشوں میں ہے عقدہ کشائیوں کا زعم
[illegible] اور ناخن ہوشیار میں

افتخار عارف

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

یہ ۲۰۱۴ء کے اواخر کی بات ہے۔ میں حسبِ معمول کلینک پر مریضوں کو ادویہ دینے اور انجکشن لگانے میں مصروف تھا کہ میرے موبائل پر میسج ٹون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ان باکس کھولا تو بڑا ہی رومانی

سنگدل بیویوں کے نام

ایک دُکھی شوہر کی فریاد

خوشگوار ازدواجی زندگی میں زہر گھول دینے والے عوامل کا عبرت اثر قصہ

سراج دین

میسج آیا ہوا تھا۔ کوئی محترمہ فرما رہی تھی:

"اب بھی وقت ہے تم مجھے اپنا لو۔ میں تمھیں دنیا کا ہر سکھ دوں گی۔ تم اپنے دل سے پوچھو کسی کی نہ سنو۔ میں تمھارا ہر قدم پر ساتھ دوں گی۔ میں مر کر بھی تمھارا ساتھ نبھاؤں گی تم مجھے موقع تو دو۔ کسی سے نہ ڈرنا میں سب سے نمٹ لوں گی۔ میں تمھارے سب دکھ سمیٹ کر تمھاری زندگی حسین اور پرکیف بنا دوں گی۔ اب بھی وقت ہے مجھے اپنے دل میں بسا لو اپنا بنا لو ورنہ پچھتاؤ گے۔"

میں نے یہ میسج پڑھا تو دل بلیوں اچھلنے لگا کہ اس

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

عمر میں بھی ہمیں کوئی چاہتا ہے۔ یہ خیال بھی آیا کہ بڑی بہادر خاتون یا دوشیزہ ہے جو میری خاطر اپنے پورے خاندان سے ٹکر لے رہی ہے۔ وہ نمبر میں نے محفوظ تو کر لیا، مگر رابطہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

شادی کے ابتدائی برس پرکیف تھے۔ جیسے جیسے بچوں کی تعداد بڑھی، معاملات گمبھیر رخ اختیار کرتے چلے گئے۔ بے شمار ذمے داریاں سر پر آن پڑیں جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کرایہ مکان، یوٹیلٹی بل اور تعلیمی اخراجات! روز بروز بڑھتی مہنگائی اور محدود آمدن نے گویا جان عذاب میں ڈال دی۔ نتیجتاً بیگم مزاج کو بھلا بچوں ہی کی ماں ہو گئی۔ بے ساختہ دل میں خیال آیا کہ اگر یہی زندگی ہے تو جنت کی حوریں بھی!

ایک دور تھا کہ جب دفتر سے گھر لوٹتا، تو بیگم موٹی موٹی آنکھیں سجائے بنا سنورے انتظار میں بیٹھی ملتی۔ میری آہٹ پاتے ہی باورچی خانے کی طرف دوڑتی اور کھانا پروس لاتی۔ کچھ عرصے بعد یہ انتظار بھی ختم ہو گیا۔ رات کے لوٹنے تک بیگم آدھی نیند پوری کر چکی ہوتی، البتہ اٹھ کر سونے سے پہلے کھانا لا دیتی۔ آہستہ آہستہ یہ معمول بھی جاتا رہا۔

ایک دن کہنے لگیں کہ آپ گھر کو تالا لگا کر جایا کریں، دن بھر کام کاج سے تھک جاتی ہوں، رات گئے اٹھنا محال ہوتا ہے۔ میں کوئی جواب دیے بغیر خاموش ہو گیا اور دل میں سوچا پہلے تم کھانا دیتی تھیں، اب مجھے وقت دیتی ہو جو اب یہ حکم بھی صادر کر دیا۔ اب یہ حال ہے کہ گھر کی چابی میں اپنے ساتھ جیب میں لے جاتا ہوں۔ رات گئے گھر لوٹوں تو باورچی خانے یا فریج سے جو بچا کھچا مل جائے، اسی سے شکم پوری کر لیتا ہوں۔ جب بھی کھانے کی کوئی شے نہ ملے، تو بیگم بستر ہی سے کہتی ہے: "فریج میں فلاں برتن میں سالن پڑا ہے، گرم کر کے کھا لیں۔"

زندگی میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہونا فطری امر ہے۔ اگر ازدواجی معاملات میں یہ تبدیلیاں خوشگوار ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں اور اگر تکلیف کا باعث بنیں تو زندگی اجیرن ہونے اور زوجہ دل سے اترنے لگتی ہے۔ اب کھانے پر ہمارا انتظار ہوتا ہے نہ ہی دفتر جاتے ہوئے بیگم دروازے پر رخصت کرنے آتی ہے۔ وہ دن ہوا ہوئے جب دفتر جانے سے قبل ہمیں جوتے پالش، کپڑے استری کیے ہوئے ملتے اور ناشتا خاص اہتمام سے پیش کیا جاتا۔ بلکہ ایک دو لقمے تو زوجہ محترمہ اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے بھی کھلا دیتی۔ مگر اب ہماری جگہ بچوں نے لے لی اور ہمیں بھلا ہی دیا گیا۔ "وہ دن گئے جب خلیل میاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔"

یوں تو بیگم میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو خاتون خانہ کا زیور ہوتی ہیں، لیکن کچھ معاملات میرے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث بنتے اور اکثر اوقات انھی کی وجہ سے ہم میں تو تکار ہو جاتی۔ بچوں اور گھریلو کاموں میں الجھ کر بیگم نے مجھے بالکل فراموش کر دیا۔ یہ میرا ہی نہیں مجھ جیسے کئی مردوں کا المیہ ہے کہ حلال کے گھر ہوتے ہوئے وہ حرام کھانے پر مجبور ہیں۔

مجھے ایک جاننے والے حاجی صادق یاد آ رہے ہیں جو کریانہ کے پیشے میں تھے۔ عمرہ کر کے لوٹے تو چند ہی دن بعد "مخصوص بازار" میں پائے گئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے نے باپ کو وہاں سے نکلتے دیکھا تو پوچھا یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ انھوں نے برخوردار کو ٹالنے کی کوشش کی، مگر جب وہ بضد ہوا تو برجستہ کہا "پتر دو چار سو روپے دے پچھے تیری ماں دے ترلے نئیں کتے جاندے۔" (بیٹا دو چار سو روپے کی خاطر تمھاری ماں کی منتیں نہیں کی جاتیں)

عمر کے خاص حصے میں بیگمات کی سرد مہری اور

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

شوہروں کو توجہ نہ دینے کے باعث کئی ''بچارے'' اس المیے سے دوچار ہیں۔ خاص بات یہ کہ معاملات زیادہ بگڑنے کی وجہ سے یہ المیہ معاشرے میں بے راہروی اور گھر برباد کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ بے اختیار مجھے اپنے محلے دار چودھری نیامت یاد آ گئے۔ موصوف کی بیوی ہاتھوں میں ایک تھی، مگر شوہر نامدار کی نافرمان۔ فطری تقاضے کی خاطر نیامت کو کئی پاپڑ بیلنے پڑتے۔ مختصر یہ کہ معاملہ ''حسن بانو'' کی صوابدید پر منحصر تھا۔

کئی بار رات گئے میاں بیوی آپس میں الجھ پڑتے اور بلند آواز میں ایک دوسرے کو مغلظات بکتے۔ اگلے دن ہر گھر میں انہی کا معاملہ زیر بحث ہوتا۔ لوگ ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے...... بعض تو مرچ مسالا لگا کر یوں روداد سناتے جیسے سارا معاملہ ان کے سامنے پیش آیا تھا۔ [illegible] ہوتی تو انھیں سمجھایا سمجھایا جا سکتا تھا مگر یہ معاملہ ہی ایسی نوعیت کا تھا [illegible] سرپنچ بھی کوئی کردار ادا کرنے سے قاصر تھے۔ آخر انہی حالات میں چودھری نیامت اللہ کو پیارے ہو گئے۔

تھوڑے ہی عرصے بعد چودھرائن ایسی بیماری میں مبتلا ہوئی کہ مرنے پر اس کی شکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ جس حسن پہ اسے ناز تھا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس سے چھین لیا۔

میرا ایک پڑوسی شریف نام ہی کا شریف نہیں تھا، شرافت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بیگم نے [illegible] پر یوں نچایا جیسے وہ ''مداری'' اور موصوف ''بندر''۔ [illegible] میاں بیوی گھر سے ''نکلتے'' تو بچے اور سامان اٹھانا شریف ہی کے ذمے ہوتا، جبکہ بیگم صاحب مردانہ وار آگے آگے چل رہی ہوتی۔ شوہر نامدار نے خاصا عرصہ یہ ظلم و ستم برداشت کیا مگر جب بیگم نے کسی بھی قسم کے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا تو موصوف نے علیحدگی اختیار کرنے کو ترجیح دی اور ناپسندیدہ فعل کے مرتکب ہو گئے۔

شریعت نے ایسی خواتین کے بارے میں سخت وعید دی ہے جو اپنے شوہروں کا خیال نہیں رکھتیں اور ان سے بے توجہی برتتی ہیں۔ مستورات کے لیے حکم ہے کہ جب تمہارے خاوند دن بھر کی مشقت کے بعد تھکے ہارے لوٹیں تو مسکراتے چہرے کے ساتھ بن سنور کر اور اچھے لباس میں ان کا استقبال کرو۔

> **شریعت نے ایسی خواتین کے بارے میں سخت وعید دی ہے جو اپنے شوہروں کا خیال نہیں رکھتیں اور ان سے بے توجہی برتتی ہیں۔**

ملک اسلم کو اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے نواز رکھا تھا۔ بنگلے، گاڑیاں، وسیع کاروبار، صالح جوان اولاد اور دولت کی ریل پیل... مگر اس عمر میں شریک حیات کی عدم توجہی اور بے مروتی نے انھیں ذہنی مریض اور سانس کی تکلیف میں مبتلا کر دیا۔ جب بھی حالت بگڑتی تو مجھے ان کے گھر سے فون آتا [illegible] انجکشن لگا جائیں۔ اکثر یہ فون ملازمہ ہی کرتی۔ محترمہ [illegible] ہونے کے باوجود مجھے بیٹا کہنے کے بجائے [illegible] مخاطب کرتی۔

میں انجکشن لگانے [illegible] ملک صاحب سگریٹ سلگانے میں [illegible] متفکر اور شرمسار [illegible] میں سگریٹ نوشی سے منع کرتا تو ہنس کر کہتے ''مجھے [illegible] بارے خالد صاحب (خالد صاحب) سگریٹ مجھے [illegible]''۔ [illegible] مکانی [illegible] پر ہوتی اور کہتی ''یہ دو [illegible] اسپتال [illegible] پڑنے [illegible] گھر سے [illegible] ہوتے ہیں۔ بالکل گھوڑے کی طرح ہو گیا تھا مگر سگریٹوں میں اس کی جان ہے۔ لیکن اس کی جان لے کر چھوڑیں گے۔ بہت منع

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کرتی ہوں، مگر یہ کسی کی سنتا ہی نہیں۔" مختصر یہ کہ ماکانی ملک کی بے پروائی اور بدپرہیزی کی گردان الاپنے لگی۔

انجکشن لگا چکتا تو ملک صاحب یکدم شور مچا دیتے کہ خالد (خالد) کو چائے یا کولڈ ڈرنک پلاؤ۔ جو کبھی بھار اہل خانہ کو گراں بھی گزرتا، مگر ملک کے حکم پر چار و ناچار وہ میری آؤ بھگت کرتے۔ کبھی مجھے بنا کچھ کھائے پیے نہیں جانے دیا۔ مجھے بڑا عجیب سا لگتا تو ملک صاحب کہتے "خالد صاحب شگیانہ کروائے تاؤ اپنا گھر اے تو سی اپنے مقدراں دا کھاندے او۔" (خالد صاحب شرمندہ نہ کرو یہ آپ کا اپنا گھر ہے اور آپ اپنے مقدر کا کھاتے ہیں)

[illegible] گھر میں آتے [illegible] سنگترہ زادو ہیت کھانے اور وافر مقدار میں موسمی پھل ہر وقت موجود ہوتے۔ مگر ان کی بیماری و قرار [illegible] ایک دن میں ٹیکا لگانے گیا تو گھر پر کوئی نہیں تھا۔ میری [illegible] مدارات (جو کہ مجھے خود ہی کرنی پڑی) ملک صاحب [illegible] کہتے فلاں پھل وہ پڑا ہے یا فریج میں مٹھائی رکھی ہے۔ [illegible] موصوف دل کے پھپھولے نکالنے اور [illegible] کی [illegible] بیان کرنے لگے کہ "مجھے بیوی کی حالت [illegible] میں کی ہوئی ہے [illegible] سے میری [illegible] نہیں۔ [illegible] ساری رات تڑپ تڑپ کر گزری۔ اس عورت کو [illegible] کہ میرا سر درد ہے یا مجھ سے پوچھ ہی لے کہ [illegible] وہ خود خواب خرگوش کے مزے لیتی رہی۔ میں [illegible] سے حضور اس کی شکایت کروں گا۔ میں نے اس کی خاطر [illegible] رات محنت کی اور دنیا کی ہر آسائش اس کے قدموں میں [illegible] دی۔ مگر آج یہ مجھے پوچھتی ہی نہیں۔ میں آپ کا [illegible] ہوں جو وقت بے وقت میرے فون کرنے پر آ جاتے ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

میرا خیال تھا کہ ملک صاحب اپنی زوجہ پر بہتان لگا رہے ہیں، لیکن ایک روز صبح سویرے ان کا فون آیا۔ "خالد صاحب بڑی طبیعت خراب ہے۔ آپ کی مہربانی ہو گی مجھے آ کر ٹیکے لگا دیں۔" جب میں پہنچا تو ملک صاحب کا سانس اکھڑا ہوا اور چھاتی سے خرخر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ بار بار بلند آواز میں کہہ رہے تھے "خدا دا واسطہ جے مینوں ہسپتال لے جاؤ۔ میں مر چلا ہے۔" (اللہ کے واسطے مجھے اسپتال لے جاؤ۔ میں مر جاؤں گا) ادھر ماکانی اسی پلنگ پر مجل اور [illegible] دین و مافیہا سے بے نیاز سو رہی تھی۔

اس دن مجھے ملک کی بے چارگی پر ترس آیا اور ماکانی پر غصہ آیا کہ وہ اپنے بوڑھے اور بیمار شوہر کی خدمت نہ کر کے اللہ اور رسول ﷺ کی ناراضی مول لے رہی ہے۔

٭٭٭

جب کبھی بیگم سے منہ ماری یا کوئی نوک جھونک ہوتی تو میں اسے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کرتا: "بیگم! خدا اور دنیا ہی خوبصورتیاں تخلیق کرتے ہیں جس چہرے کے ساتھ ہم پیدا ہوں، وہ ہمارا انتخاب نہیں ہوتا، مگر جس چہرے کے ساتھ ہم مرتے ہیں اسے تراشنے کے ذمہ دار ہم خود ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے اخلاق، عادات، خواہشوں اور عادتوں کا عکس ہوتا ہے۔" مگر زوجہ محترمہ کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تو مجھے صبح والی یاد آتی [illegible] سوچتا کہ اسے زندگی کا ہمسفر ہونا چاہیے تھا جس [illegible] ہم آہنگی تو ہوتی۔

آج جب میں [illegible] افسردہ تھا تو اپنے موبائل میں دورہ [illegible] کوئی میسج پڑھنے لگا۔ [illegible] کی آخری سطر جو کہ پہلے میری نظر سے نہیں گزری تھی، پڑھ کر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس میں لکھا تھا:

"فقط تمہاری اپنی [illegible] نمازی"

پھر ایک دن اسی میرے منہ اندھیرے مجھے جگانے آئی: "اٹھ جاؤ، نماز پڑھ لو۔"

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

قرارداد لاہور کی مخالفت میں

جب ہندو پریس چیخ اٹھا

پروفیسر احمد سعید

قیام پاکستان کی وجوہ آشکار کرنے والا نئی نسل کے لیے تحفۂ خاص

آل انڈیا مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی لیکن اسے عوام میں مقبولیت ۱۹۳۷ء کے بعد ہی حاصل ہو سکی۔ مسلم لیگ نے ابتدا ہی سے انوں کے حقوق کی نگہداشت کا فریضہ نہایت ی سے انجام دیا۔ جداگانہ انتخاب کا حصول مسلم لیگ ی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے ن لکھنؤ پیکٹ (۱۹۱۶ء) طے پایا لیکن کانگرس نے کسی وقع پر مسلم لیگ کے جذبۂ مفاہمت کی قدر نہ کی۔ ایک موقع پر تو مسلم لیگ نے جداگانہ انتخاب تک کو چھوڑنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ لیکن ہندو کانگرس کی ہٹ دھرمی کے سبب مفاہمت نہ ہو سکی۔ قائداعظم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انھیں بھی مجبوراً کہنا پڑا ”ہمارے راستے جدا ہیں۔“

کانگرس کے دو سالہ دور استبداد (۳۸_۱۹۳۹ء) نے مسلمانوں کی رہی سہی توقعات پر پانی پھیر دیا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر ایک علیحدہ مملکت کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں۔ بالآخر

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی جدوجہد کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے مرحلے میں اس نے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا۔ دوسرے مرحلے میں ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کی کوشش ہوئی اور تیسرے میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ کر کے صرف سات سال کے مختصر عرصے میں اپنا مقصد پاکستان حاصل کر لیا۔

برصغیر کی تقسیم کی تجاویز

اگرچہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں ایک علیحدہ مملکت کا باقاعدہ طور پر مطالبہ کیا لیکن ہندو مسلم مسائل کے حل کی خاطر برصغیر کی تقسیم کی تجاویز پہلے بھی پیش کی جا چکی تھیں۔ مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلی تجویز مشہور ناول نگار اور صحافی عبدالحلیم شرر (۱۸۶۱ء۔۱۹۲۶ء) نے پیش کی۔ انھوں نے اپنے ہفتہ وار رسالے "مہذب" ۲۳/اگست ۱۸۹۰ء میں آئے دن کے ہندو مسلم فسادات کے پیش نظر لکھا کہ ہندو مسلم اختلافی مسئلے کا واحد حل تقسیم ہند ہے۔ عقل مندی کا تقاضا ہے کہ ہندوستان کو ہندو صوبوں اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

مولانا محمد علی کے اخبار، کامریڈ میں ایک وکیل، ولایت علی "بمبوق" کے قلمی نام سے ایک مزاحیہ کالم "گپ شپ" لکھا کرتے تھے۔ مئی ۱۹۱۳ء میں "ایک ملاقات" کے زیر عنوان کالم میں ایک خیالی شخص سے ہندو مسلم مسئلے کا حل دریافت کیا گیا۔ جواب میں اس نے بتایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا چاہیے۔ شمالی ہندوستان مسلمانوں اور بقیہ حصہ ہندوؤں کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ محض خیالی انٹرویو تھا لیکن اس سے مسلمانوں کی سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۱۷ء میں خیری برادران (عبدالجبار، پروفیسر عبدالستار) نے سوشلسٹ انٹرنیشنل کی اسٹاک ہوم کانفرنس کے دوران ہندوستان کو تقسیم کر کے "مسلم ہندوستان" اور "ہندو ہندوستان" کے قیام کی تجویز پیش کی۔

مارچ، اپریل ۱۹۲۰ء میں قاضی عزیز الدین بلگرامی نے اخبار ذوالقرنین میں گاندھی کے نام ایک کھلا خط لکھا جس میں برصغیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز میں اضلاع کی ایک فہرست بھی تھی جو بنیادی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبوں کی سرحدوں سے زیادہ مختلف نہ تھی۔

۱۹۲۳ء میں انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے صدر سردار گل خاں نے ایک کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ہندوستان کو تقسیم کر کے آگرہ سے پشاور تک کا علاقہ مسلمانوں کو دینے کی تجویز دی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں مرتضیٰ احمد خان میکش نے روزنامہ انقلاب (لاہور) میں جاری سلسلہ مضامین تحریر کیے۔ ان میں ہندو مسلم مسائل کے حل کی خاطر ایک مسلم قومی وطن بنانے کی تجویز دی جو پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد پر مشتمل ہو۔ ہندو روزنامہ پرتاپ نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ مولانا میکش نے اس

صاحب تحریر

پروفیسر احمد سعید وطن عزیز کے ممتاز دانشور اور مورخ ہیں۔ تحریک پاکستان پر عالمانہ کتب تحریر کر چکے۔ لاہور کے ایم او کالج سے طویل عرصہ منسلک رہے۔ زیر نظر مضمون آپ کی کتاب "حصول پاکستان" سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

مخالفت کا پرزور جواب لکھا۔

۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان وضع کیا۔ انھوں نے پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد رکھی اور کتابچوں، وقتی اشتہارات اور رسالوں کے ذریعے ایک مہم چلائی۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۳۳ء کو چار صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا پمفلٹ (Now or Never) جاری کیا جس میں ایک مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا۔ چودھری رحمت علی کی اس تجویز کو سرظفر اللہ خان نے "خیالی اور ناقابل عمل" قرار دیا۔

۱۹۳۸ء میں سندھ پروونشل مسلم لیگ کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں مسلم لیگ سے سفارش کی گئی کہ ایسی دستوری تجاویز مرتب کی جائیں جن کے تحت مسلم اکثریتی صوبے اپنے وفاق میں رہتے ہوئے مکمل آزادی حاصل کر سکیں۔

فروری ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا مطالبہ پیش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس کے بعد قائداعظم وائسرائے لارڈ لنلتھگو سے ملے اور اسے بتایا کہ مسلم لیگ مجوزہ اجلاس لاہور میں ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کرے گی۔

خاکسار المیہ

مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس سے صرف چار روز قبل لاہور میں ایک بڑا المیہ پیش آیا جس کی وجہ سے اس تاریخی اجلاس کے ملتوی ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ہوا یوں کہ حکومت پنجاب نے نیم فوجی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے کر مخصوص وردی پہننے اور پریڈ کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ خاکسار جماعت نے ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۹ر مارچ کو بھاٹی دروازہ کے اندر وردی پہن کر پریڈ کرنے لگے۔ تصادم کے نتیجے میں ۵۰ کے قریب خاکسار پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔ شہر میں صورت حال بے حد کشیدہ ہو گئی۔ سرسکندر کی حکومت نے صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلم لیگ کا اجلاس ملتوی کرانے کی کوشش کی۔ حکومت پنجاب نے وائسرائے کی انتظامی کونسل کے رکن سرظفر اللہ خان کو ایلچی بنا کر قائداعظم کے پاس بھیجا تاکہ وہ انھیں سمجھا بجھا کر اجلاس ملتوی کرانے سے متعلق قائل کر سکے۔ لیکن قائداعظم محمد علی جناح نے تمام مشورے رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اجلاس مقررہ تاریخ پر لاہور ہی میں منعقد ہوگا۔

اجلاس کے انتظامات کرنے کی خاطر شاہنواز ممدوٹ کی سربراہی میں ایک مجلس استقبالیہ قائم کی گئی جس کے سیکرٹری میاں بشیر احمد مقرر ہوئے۔ شاہنواز ممدوٹ نے ابتدائی اخراجات کے لیے اپنی جیب سے چھے سو روپے دیے۔ سب سے زیادہ چندہ نواب آف کالا باغ نے دیا اور یہ پیشکش کی کہ اگر کوئی اس سے زیادہ چندہ دے گا، تو وہ دگنی رقم دیں گے۔

قائداعظم ۲۱ر مارچ کو لاہور پہنچے اور اسٹیشن سے سیدھے میو اسپتال جا کر زخمی خاکساروں کی عیادت کی۔ شہریان لاہور نے قائداعظم کو جلوس کی شکل میں لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن خاکسار المیہ کے سبب یہ پروگرام ترک کر دیا گیا۔ اسٹیشن سے باہر بے شمار نوجوان یہ اصرار کر رہے تھے کہ قائداعظم موٹر کے بجائے فٹن میں تشریف لائیں تاکہ وہ ان کی گاڑی کھینچ کر نواب ممدوٹ کی کوٹھی ڈیوس روڈ تک لے جائیں، لیکن قائداعظم نے اس خواہش کو بھی منظور نہ کیا۔

قائداعظم نے لاہور پہنچ کر اخباری نمائندوں کو بیان

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

دیا کہ لیگ اس اجلاس میں ایک انقلاب آفرین فیصلہ کرے گی۔ اس پر تمام حلقوں میں چہ میگوئیاں اور قیاس آرائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

تاریخی اجلاس کا آغاز

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا عام اجلاس شروع ہوا۔ نواب شاہنواز ممدوٹ نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں سر سکندر کا نام لیا، تو لوگوں نے ہنگامہ برپا کر دیا اور شرم شرم کے نعرے بلند ہونے لگے۔ یہ کہا گیا کہ سر سکندر کا نام مت لو۔

قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں دو قومی نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ”ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اس مسئلے کو بین الاقوامی مان کر حل کرنا چاہیے۔ اگر برطانوی حکومت ہندوستان میں امن اور سکون چاہتی ہے، تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے جداگانہ قومی وطن قائم کیے جائیں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی، مذہبی اور ثقافتی اختلافات کی نشاندہی کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بنے۔ نہ دونوں کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں۔ نہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ دونوں ایسی تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیاد متصادم افکار و تصورات پر ہے۔ ان کے کارنامے مختلف ہیں۔ اکثر اوقات ایک کا ہیرو دوسرے کا دشمن ہوتا ہے۔ ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ ایسی متضاد قوموں کو ایک نظام میں باندھنا جس میں ایک اقلیت اور دوسری اکثریت ہو، اس کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ بے چینی بڑھے گی، اور وہ نظام بالآخر تباہ و برباد ہو جائے گا۔“

قائداعظم نے دوران تقریر لالہ لاجپت رائے کا ایک خط سنایا جو انھوں نے ۱۹۲۴ء میں سی آر داس کو لکھا تھا کہ مسلمان اور ہندو دو مختلف قومیں ہیں، انھیں مدغم کر کے ایک قوم بنانا ناممکن ہے۔ ان کے اس خط نے لوگوں کو ششدر کر دیا۔ ملک برکت علی کے منہ سے نکل گیا کہ لاجپت رائے نیشنلسٹ ہندو تھے۔ اس پر قائداعظم نے زور دے کر کہا ”کوئی ہندو نیشنلسٹ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہندو اول و آخر ہندو ہے۔“

۲۳ مارچ کے تاریخی اجلاس میں شیر بنگال مولوی اے کے فضل الحق نے قرارداد لاہور پیش کی جس کی چودھری خلیق الزماں، مولانا ظفر علی خان، سر عبداللہ ہارون، سردار اورنگ زیب، نواب اسمٰعیل، قاضی محمد عیسیٰ اور بیگم محمد علی جوہر نے تائید کی۔ چار سو الفاظ اور چار مختصر پیراگراف پر مشتمل قرارداد لاہور میں کہا گیا:

”آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی بھی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو گا تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو۔ یعنی جغرافیائی طور پر متصل علاقوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردوبدل کے ساتھ) کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصے، ان کی تشکیل ”آزاد ریاستوں“ کی صورت میں کی جائے جس کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں۔ نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب، موثر اور لازمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ مہیا کیا جائے۔“

ہندو اخبارات کی مخالفت

قرارداد لاہور کا پاس ہونا تھا کہ ہندو لیڈروں اور اخبارات نے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ پرتاپ، ملاپ،

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ٹریبیون اور دیگر ہندو اخبارات نے اگلے ہی روز قرارداد لاہور کو قرارداد پاکستان کا نام دے دیا حالانکہ قرارداد میں کسی بھی جگہ لفظ پاکستان استعمال نہیں ہوا تھا۔ شاید مسلم لیگ اپنی کوششوں سے قرارداد لاہور کو اس قدر مقبول نہ بنا سکتی جس قدر ہندو پریس اور لیڈروں نے اس کے خلاف زہر اگل کر اسے مقبول بنایا۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۰ء کو روزنامہ ٹریبیون نے پاکستان اسکیم کو ''ناقابل قبول'' اور گھناؤنی اسکیم'' سے تشبیہ دی۔ اسی اخبار نے ایک اور اداریہ میں پاکستان اسکیم کو ''بے مقصد'' قرار دیتے ہوئے لکھا کہ یہ ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا کوئی حل نہیں بلکہ اس سے یہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو جائے گا۔

ہفت روزہ ماڈرن ریویو (کلکتہ) نے جون ۱۹۴۰ء میں لکھا ''جناح اور اس کے مسلم لیگی حواریوں کے علاوہ باقی تمام اس بات میں پختہ یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان اسکیم نہ صرف ہندوستانی قوم بلکہ خود مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔''

ہفت روزہ ہندوستان ٹائمز نے اپنے اداریے اداریہ میں لکھا ''تاریخ نے ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بنایا تھا۔ اب کسی بھی قوم کو مطمئن کرنے کی خاطر ہندوستان کی وحدت کو توڑنا یہاں کے لوگوں کی ترقی اور امن و سکون برباد کرنے کے مترادف ہو گا۔ اس فیصلہ کو مسلمان بحیثیت ایک قوم مسترد کر دیں گے خواہ ایک اور اس کے لیڈر کچھ ہی کہتے رہیں۔''

ہفت روزہ اخبار امرت بازار پتر یکا نے پاکستان اسکیم کو مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے لکھا ''اگر مسلمان ایک آل انڈیا گورنمنٹ کے تحت بحیثیت اقلیتی قوم کے نہیں رہ سکتے، تو وہ یہ توقع کس طرح کرتے ہیں، ہندو مسلمانوں کی اکثریت کے تحت رہیں گے۔''

ہفت روزہ اسٹیٹسمین نے قرارداد لاہور پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''یہ ایک انقلابی تجویز ہے لیکن جو لوگ اس کی مخالفت کرنا چاہیں، وہ پہلے اس کا بغور مطالعہ کر لیں۔ انھیں سمجھ لینا چاہیے کہ مسلم لیگ نے پوری سنجیدگی سے اسے پیش کیا ہے۔ اس لیے اسے محض خواب و خیال سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوؤں کو یہ بات خواہ اچھی لگے یا بری، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان اپنے جداگانہ کلچر کا زبردست احساس رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ایسا مشورہ ہے جو مایوسی کی موجودہ حالت میں پیش کیا گیا۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑے گا کہ اس تجویز میں ایماندارانہ طور پر موجودہ ناگفتہ بہ ہندو مسلم تنازع کا قابل عمل حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تجویز پیش کرنے والوں کے مزدیک صرف یہی قابل قبول حل ہے۔

درسِ حیات

کسی کے قصور یا جرم کو معاف کر دینا اطوار و اخلاق کی بلندی ہے۔

بُری عادت کی پختگی پرنیکی سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔

نااہل کبھی تربیت سے نہیں سنورتے۔

سانپ کو مار ڈالنا اور اس کے بچے پر رحم کر کے پالنا عقل مندوں کا کام نہیں ہے۔

کمینے سے وفا اور تعلق و روابط قائم کرنا بے وقوفی کی علامت ہے۔

فطرت کو بدلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

نیک لوگوں کی فطرت و خصلت بندے کی طبع پر وقتی طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ (شیخ سعدی شیرازی)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہندو راہنماؤں کی زہر افشانی

ہندو اخبارات کے مانند ہندو لیڈروں نے بھی قراردادِ لاہور کے خلاف دل کھول کر زہر اگلا۔ گاندھی نے ۶ اپریل ۱۹۴۰ء کو اپنے اخبار ہریجن میں لکھا ''میرا خیال ہے کہ مسلمان تقسیم کو قبول نہیں کریں گے۔ ان کا مفاد خود انھیں تقسیم سے روکے گا۔ ان کا مذہب انھیں اس قسم کی واضح خودکشی کی اجازت نہیں دے گا۔ دو قومی نظریہ ایک جھوٹ ہے۔ چونکہ میں اہنسا پر یقین رکھتا ہوں، اس لیے تشدد کے بل پر مجوزہ تقسیم کو نہیں روک سکتا۔ لیکن میں اس پیچیدگی میں فریق نہیں ہوں گا کیونکہ تقسیم کا مطلب ان بے شمار ہندوؤں اور مسلمانوں کے کام کو تباہ و برباد کرنا ہے جنھوں نے صدیوں سے ایک قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں رہنے کی کوشش کی۔

''تقسیم ایک جھوٹ ہے۔ میری روح اس نظریے کے خلاف بغاوت کرتی ہے کہ ہندومت اور اسلام دو مختلف عقیدوں اور متضاد تہذیبوں کا نام ہے۔ ہم سب ایک ہی خدا کے بچے ہیں۔ یقیناً میں اس کے خلاف بغاوت کروں گا کہ کروڑوں ہندوستانی جو کل ہندو تھے، مذہب تبدیل کرنے کی وجہ سے اپنی قومیت بھی بدل چکے ہیں۔''

سی راج گوپال اچاریہ نے قراردادِ لاہور سے متعلق زہر افشانی کرتے ہوئے کہا ''تقسیم ہندوستان سے متعلق مسٹر جناح کا یہ قدم اس طرح کا ہے جیسے دو بھائیوں میں ایک گائے کی ملکیت پر جھگڑا ہو اور وہ گائے کو دو ٹکڑوں میں کاٹ کر بانٹ لیں۔''

کانگریسی لیڈر ابوالکلام آزاد نے مطالبہ پاکستان کے متعلق کہا کہ وہ بنیادی طور پر پاکستان کے اس لیے خلاف ہیں کہ ان کی نظر میں خدا کی زمین کو پاک اور ناپاک خطوں میں بانٹنے کا کسی انسان کو حق حاصل نہیں۔

برطانوی پریس نے قراردادِ لاہور کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ دی ٹائمز، مانچسٹر گارڈین اور ڈیلی ہیرلڈ نے قرارداد سے متعلق خبر مختصر طور پر شائع کی جبکہ ڈیلی ٹیلی گراف نے اس کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ ڈیلی ٹائمز نے مسلمانوں کا بحیثیت ایک قوم کے معرضِ وجود میں آنا کانگریسی حکمت عملی کا شاخسانہ قرار دیا تاہم پاکستان کی تجویز کو اس بنا پر رد کر دیا کہ اس سے ہندوستان کی وحدت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

مانچسٹر گارڈین کے نزدیک قائداعظم نے قراردادِ لاہور منظور کروا کر ہندوستانی سیاست میں دوبارہ انتشار پیدا کر دیا۔ اخبار نے اس قرارداد کو ہندوستانی نیشنلزم پر کاری ضرب قرار دیا۔ انگلستان کے تمام قابلِ ذکر اخبارات نے یا تو قراردادِ لاہور کو نظرانداز کیا یا اس کی مخالفت کی لیکن حیرانی کی بات ہے کہ ایک سائنسی رسالے، دی نیچر نے قرارداد کی اہمیت کو سمجھنے کی پوری کوشش کی۔

دی نیچر نے لکھا کہ آٹھ کروڑ مسلم اقلیت کی آواز کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ آواز ان کی حقیقی ثقافتی روایات زندہ رکھنے کے مطالبے پر مبنی ہے۔ ہندوستانی ثقافت کے ہر طالب علم پر یہ بخوبی واضح ہے کہ اسلامی ثقافت جمہوری اقدار کو زبردست فروغ دیتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ہندوؤں کی برتری سے انھیں چند خدشات لاحق ہیں۔ ان کی بنیاد پرانے ہندوستان کا برہمنی طبقاتی نظام ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ کتنا ہی ناقابلِ عمل ہو لیکن ان کی ثقافتی روایات کے اس بنیادی فرق کو نظرانداز کرنے سے نہ تو ہندوستان میں اندرونی طور پر امن قائم رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی انگلستان کی ساکھ بیرونی طور پر قائم رکھی جا سکتی ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

زمانے کو کبھی برا مت کہو

وقت کی بات

ایک شکی مزاج مرد کی دلفریب کتھا' وہ محبت اور دھوکے میں کبھی تمیز نہ کر سکا

رضیہ بٹ

میں مدھم سی روشنی تھی۔ ناصرہ رات سوتے وقت سارے گھر کی بتیاں بجھا کر دالان میں چھوٹی بتی جلتی رہنے دیتی۔ آج بھی جب بڑی بیٹی اور دونوں چھوٹے بیٹے اپنے کمروں میں چلے گئے، تو وہ ساری فالتو بتیاں بجھا چھوٹی بتی روشن کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ سلیم ابھی ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ کوئی پروگرام چل رہا تھا، وہی دیکھ رہے تھے۔ پروگرام ختم ہوا، تو انھوں نے اٹھ کر ٹی وی بند کیا۔ دروازے دیکھے بھالے اور بتی بجھا دالان میں آ گئے۔ نیم روشنی میں اچانک اُن کا پاؤں کسی شے سے الجھا اور وہ گرتے گرتے بچے۔ ایک ہاتھ سے انھوں نے دیوار تھام لی پھر جھک کر دیکھا کہ پاؤں کس چیز سے اُلجھا ہے۔

یہ ٹیلی فون کی تار تھی۔ وہ تار ہاتھ میں لیتے ہوئے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ ٹیلی فون دالان کے سرے پر لمبوتری اونچی میز پہ رکھا رہتا تھا۔ لیکن تار ان کی بیٹی عامرہ کے کمرے میں جا رہی تھی۔ ٹیلی فون اپنی مخصوص جگہ میز پر نہیں تھا۔ ''ٹیلی فون عامرہ کے کمرے میں؟'' انھوں نے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

حیران ہو کر اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر سوال سے سوال بنا۔ ''اس وقت کسے فون کر رہی ہے؟''

فون کسی وقت بھی کسی کو کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بعض اوقات انسان کی چھٹی حس اچانک بیدار ہو جاتی ہے اور خطرے کی گھنٹیوں کے الارم بجنے لگتے ہیں۔

سلیم چند لمحے تار پڑے عامرہ کے کمرے کے بند دروازے کو تکتے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے دروازے کے قریب آئے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کو ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ ہاتھ رک گیا۔

اندر سے عامرہ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ بولے بولے بول رہی تھی جیسے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی ہو۔ یقیناً وہ فون پر کسی سے ہمکلام تھی۔ باتیں کرنے کا دھیما اور چھپا چھپا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے، اسے منکشف ہونے سے بچانا مقصود ہے۔

جوان لڑکی چھپ چھپ کر جسے سرگوشیوں میں فون پر بات کرے، تو اس کا مخاطب یقیناً اور یقیناً سلیم احمد اپنی سوچ سے گھبرا گئے۔ برداشت نہ کر پائے اور دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔

''کون؟'' اندر سے عامرہ کی کچھ گھبرائی سی آواز آئی۔ اس نے فون پر جلدی سے کچھ کہا۔ پھر پکارا ''کون ہے؟''

''میں ہوں دروازہ کھولو۔''

''ابو۔''

''ہاں کھولو دروازہ۔''

عامرہ نے فون جلدی سے پلنگ کے نیچے رکھ دیا۔ اچھل کر پلنگ سے نیچے اتری اور دروازہ کھولتے ہوئے بولی ''ابو آپ۔''

سلیم نے اس کے سراپے پر نگاہ ڈالی۔ عامرہ نہیں جانتی تھی کہ ابو اس سے فون کے متعلق کوئی استفسار کرنے والے ہیں۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی ''ابو جی..... کوئی کام۔''

''تم کیا کر رہی ہو؟''

''پڑھ رہی ہوں۔''

''فون یہاں کیوں آیا ہے؟''

''وہ..... وہ ابو جی..... میری ایک سہیلی..... وہ..... اس نے کہا تھا..... فون..... ہاں فون کروں گی۔''

''آیا فون؟''

''نہیں ابھی تک تو نہیں آیا۔ شاید آ جائے..... اس لیے..... میں فون..... فون کمرے میں لے آئی تھی۔ ابو پتا نہیں کس وقت فون کر دے۔''

''ہوں۔''

''جی ابو۔''

''اور ابھی کس سے باتیں کر رہی تھیں؟''

سلیم کے آہنی لہجے سے عامرہ بوکھلا گئی۔ رنگ فق ہو گیا۔ بار بار زبان ہونٹوں پر پھیرنے لگی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے باپ کو دیکھا..... اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں اور ہاتھوں میں نمی آ گئی۔

''کسے فون کر رہی تھیں؟'' سلیم احمد نے پھر سرسری انداز میں پوچھا۔

وہ ہکلاتے ہوئے بولی ''ابو..... ایک سہیلی..... اس کا فون تھا..... میں، میں بتانا بھول گئی تھی کہ وہ.....''

سلیم احمد نے پھر رک کر آر پار ہو جانے والی نگاہ بیٹی پر ڈالی اور گمبھیر لیکن سخت لہجے میں بولے ''چلو اٹھاؤ فون..... اور جا کر اس کی جگہ پر رکھو..... آئندہ فون اس کمرے میں نہیں آئے۔''

عامرہ کے چہرے پر ویرانی کی دھول پھیل گئی۔ سر

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

جھکائے بولی "اچھا ابو جی!" سلیم احمد کمرے سے نکل گئے۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتے اپنے کمرے میں آئے۔ خطرے کے الارم اب بھی بج رہے تھے۔ انہونی کے ہونے کا احساس دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

وہ پلنگ پر لیٹ گئے۔ انھیں سخت ذہنی دھچکا لگا تھا۔ انیس سالہ عامرہ ان کی بڑی بیٹی تھی۔ بیٹی کو انھوں نے شرافت اور پاکیزگی کے جس معیار پر رکھا تھا، اس بظاہر معمولی سے واقعے سے اس معیار سے وہ گرتی محسوس ہوئی۔

وہ بہت مضطرب اور بےچین تھے۔ بار بار کروٹیں بدلتے سوچتے اور پریشان ہو رہے تھے۔ کئی بار جی چاہا کہ برابر میں سوئی ناصرہ کو جھنجھوڑ کر جگا دیں اور اس سے واقعے ساری افتاد کا ذکر کر دیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں انھوں نے ناصرہ کو نہیں جگایا۔ آنکھیں تو ان کی سونا ہی بھول گئی تھیں۔

وہ سوچوں میں ڈوبے بار بار کروٹیں بدل رہے تھے۔ کئی بار خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے، عامرہ کی کسی ہم جماعت، کسی سہیلی کا فون ہو۔ وہ رات کی خاموشی کے باعث دھیمے لہجے کے انداز میں اس سے باتیں کر رہی ہو۔ لیکن اس یقین کو وہ خود ہی جھٹلا دیتے۔ عامرہ کا چہرہ، حرکات اور ہکلانا اس بات کے ثبوت تھے کہ خود یقین بھی بےیقین ہوا جا رہا تھا۔

یہ بات سو فیصد پکی تھی کہ ناصرہ کسی لڑکے سے باتیں کر رہی تھی۔ سلیم احمد سوچ رہے تھے اور ان کی سوچیں ایک ایسے ہی چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں۔ بیس سال پہلے کا چہرہ، رابعہ کا چہرہ...... ان کی بہن کا چہرہ۔

٭٭٭

رابعہ بھی ان دنوں عمر کے اسی دور میں تھی، جوان اور خوش شکل۔ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ ایک دن کالج جاتے وقت وہ صحن میں ان کے قریب سے گزری، تو اس کی کتاب سے ایک رقعہ گر گیا۔

"یہ کیا ہے؟" سلیم احمد نے رقعہ اٹھاتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے رابعہ کا رنگ فق ہو گیا۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ ٹانگیں لرزنے لگیں اور کانپتا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے سلیم کے رقعہ کھولنے سے پہلے ہی لے لیا۔ "کچھ نہیں بھائی...... جان...... یہ...... یہ میری...... میری...... ایک سہیلی کا رقعہ ہے۔ اس نے لکھا تھا ہم جی شاہینہ کا...... رقعہ ہے...... وہ......؟"

مصنفہ

اردو کی ممتاز ادیبہ، رضیہ بٹ ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ چناں چہ سولہ سال کی عمر میں پہلا ناول "نائلہ" لکھ ڈالا۔ آپ نے پھر ۵۱ ناول اور ساڑھے تین سو سے زائد افسانے لکھے۔ معاشرتی و گھریلو مسائل آپ کی تخلیقات کا موضوع ہیں۔ آپ کی کوشش رہی کہ اپنی تحریروں سے معاشرے میں خیر و بھلائی کو عام کیا جائے۔ قاری کی اخلاقی تربیت کو بھی لکھتے سے ذہن میں رکھتیں۔ ۴ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو لاہور میں وفات پائی۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

بات ختم کیے بغیر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ڈیوڑھی کی طرف دوڑ گئی۔ تب بھی سلیم کی چھٹی حس نے انھیں چونکایا' انہونی کے ہونے کا یقین دلایا۔ وہ بہت مضطرب، بڑے بے چین ہو گئے۔ پاکیزگی اور شرافت کا معیار تو ان دنوں آج کل سے کہیں اونچا اور کڑا تھا۔ سلیم کو رابعہ اس معیار سے نیچے گرتی دکھائی دی۔

اس وقت وہ غصے میں بھر گئے۔ نس نس میں چنگاریوں کی جلن ہونے لگی۔ جوش دبائے نہیں دبا، تو سیدھے ماں کے پاس باورچی خانے میں گئے۔

''کیا بات ہے سلیم؟'' اماں ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے بولیں۔

''آپ'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

''کیا ہے۔''

''رابعہ۔''

''کیا ہوا رابعہ کو؟''

''کالج چلی گئی۔''

''وہ تو مجھے پتا ہے۔ ناشتا کر کے ہی گئی ہے۔''

''اماں!''

''ہوں۔''

''رابعہ کو کالج سے اٹھالو۔''

''کیا؟''

''ہاں اماں اس کی پڑھائی آج سے بند۔''

''مگر کیوں؟''

''بس کہہ دیا نا میں نے، وہ کالج نہیں جائے گی۔''

اماں سارا کام چھوڑ چھاڑ اس کے پاس آن کھڑی ہوئیں ''کیا کہہ رہا ہے تو..... کیا ہوا کوئی خاص بات ہوگئی۔''

''ہاں خاص بات ہی ہوگئی۔''

''کچھ بتائے گا بھی؟''

''بتاؤں گا۔''

سلیم خود بھی سمجھ نہ پا رہے تھے کہ ماں سے کیا کہیں؟ رقعہ اور رابعہ کی حالت دونوں غماز تھیں کہ سلیم نے جو سوچا وہ سو فیصد درست ہے۔ پھر بھی زبان زیب نہ دیتی تھی کہ وہ ماں سے یہ سب کچھ کہہ دیں۔ بات گول مول کر کے ٹال دی اور یہی کہا ''رابعہ کالج سے آجائے' تو بتاؤں گا۔''

اس دن سلیم اتنے بے چین اور پریشان تھے کہ وہ دفتر بھی نہ جا سکے۔ نئی نویلی دلھن ناصرہ نے بھی پریشانی بھانپ کر وجہ پوچھی تو ٹال گئے۔

رابعہ کالج سے آئی، تو خوفزدہ تھی۔ کترائی کترائی سی اپنے کمرے میں جانے لگی' تو سلیم نے اماں کے سامنے اسے بلایا۔ اماں کلیجہ تھام کر بیٹھی تھیں۔ سلیم کا چہرہ آہنی تاثرات لیے تھا۔ رابعہ قصور وار تھی، اس لیے ماں اور بھائی کی عدالت میں پیش ہوتے بے حد گھبرا رہی تھی۔

''رابعہ'' سلیم نے سخت لہجے میں کہا۔

''جی۔''

''وہ رقعہ کہاں ہے؟''

''جی..... جی، وہ..... میں نے پھاڑ دیا۔''

''کس کا تھا؟''

''م..... میری..... سہیلی.....''

''جھوٹ..... مت بولو..... سچ سچ بتاؤ۔''

رابعہ کے تن بدن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ سنسناہٹ سی رگوں میں ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا لہرانے لگا۔

سلیم ایک دم غرایا ''کون ہے وہ جس نے تمھیں رقعہ لکھنے کی جسارت کی؟''

''وہ..... وہ.....'' وہ ہکلائی۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سلیم نے بھبکی ماری ''خبردار جھوٹ بولا، سچ سچ بتاؤ کس سے خط کتابت ہوتی ہے..... تمھاری۔''

رابعہ چکرائی۔ پھر ماں کی گود میں گرتے ہوئے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔ ماں تو جیسے پتھرا سی گئی۔

سلیم غصے سے لال بھبوکا ہوتے ہوئے بولا ''سمجھ آ گئی اماں؟ صبح میں یہی بات تمھیں بتانا چاہتا تھا۔ پوچھ اس سے کون ہے وہ۔''

اماں نے بات سمجھتے ہوئے رابعہ کی طرف دیکھا جو اس کی گود میں منہ چھپائے روئے جا رہی تھی۔ ایک دم وہ غصے سے بھر گئیں۔ دماغ جیسے پھک سے اڑ گیا۔ یہ بات تو کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ بیٹی کسی سے آنکھ مٹکا کرے گی۔

انھوں نے رابعہ کے بالوں میں مٹھی بھر کر سر جھٹکے سے اونچا کیا۔ خود بھی انھیں اور اسے گھسیٹتے ہوئے چارپائی پر دھکا دے گرایا۔ ''حرام خور..... ذلیل تیری ایسی جرأت..... خون نہ پی لیا' تو کہنا!'' اماں نے لاتوں گھونسوں مکوں سے رابعہ کو اتنا پیٹا کہ خود ہی بے حال ہو گئیں۔ جب بے حال ہوئیں' تو وہیں پھکا مار بیٹھتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر بین کرتے رونے لگیں۔ سلیم دروازے میں کھڑا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ناصرہ ڈری سہمی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

اماں کا رونا دھونا بڑھا' تو ناصرہ ڈرتے ان کے قریب آ کر بولی ''اماں حوصلہ کریں۔ میں رابعہ کو سمجھا دوں گی۔ آپ اس طرح کریں گی، تو بات محلے میں پھیل جائے گی۔ آپ صبر سے کام لیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اماں کو تسلی دلاسا دے کر وہ رابعہ کی طرف آئی، اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی۔ پہلے اسے چپ کرایا اور پھر پیار سے اگلوایا..... رقعہ جمشید کا تھا۔

جمشید متوسط گھرانے کا پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ ایم ایس سی کے بعد کسی تحقیقی ادارے سے وابستہ تھا۔ اچھی تنخواہ تھی۔ چند مہینے پہلے ایک اسٹور میں دونوں کا اچانک ٹکراؤ ہوا۔ جوانی دیوانی تو ہوتی ہے۔ پسند کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ جمشید کو رابعہ اچھی لگی۔ رابعہ کے من کو جمشید بھایا۔ دونوں دوسری دفعہ کالج کے راستے میں ملے اور پھر ملنے لگے۔ جب نہ مل پاتے، رقعوں سے احوال دل کہہ لیتے۔

جمشید رابعہ سے شادی کا خواہش مند تھا۔ لیکن من پسند لڑکی سے شادی کی راہ میں کچھ مشکلات حائل تھیں۔ سب سے بڑی مشکل اس کی اپنی منگنی تھی جو اماں نے بھتیجی کے ساتھ بچپن ہی میں کر دی تھی۔ جمشید ان رکاوٹوں اور مشکلوں سے نپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''رابعہ شادی کروں گا' تو صرف تم سے..... نہیں' تو کسی سے بھی نہیں۔ تم میرا انتظار ضرور کرنا۔'' وہ اکثر اس سے کہا کرتا۔

رابعہ خوش آئند تصور سے خوش ہو جاتی۔ اسے اپنی محبت پر ایمان کی حد تک یقین تھا۔ یہی یقین اسے جمشید پر بھی تھا۔ دنیا بدل سکتی تھی' لیکن جمشید بدلنے والا نہیں تھا۔ ناصرہ نے ساری کہانی سنی۔ پھر بولی ''تو نے اچھا نہیں کیا رابعہ۔''

''بھابی۔''

''زندگی کے فیصلے ماں باپ کے ایما پر ہی ہونے چاہئیں۔''

''جمشید اپنے ماں باپ کو رضا مند کر رہا ہے۔ وہ انھیں لے کر اماں کے پاس آئے گا۔''

''وہ رضا مند نہ ہوئے تو۔''

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

رابعہ نے گھبرا کر ناصرہ کو دیکھا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں رابعہ کو ڈانٹا۔ حالات سمجھائے۔ اماں اور سلیم کی سماجی حیثیت کا احساس دلایا۔ اپنے طبقے کی سوچ و فکر سے آگاہ کیا۔

لیکن رابعہ کسی بات کا اثر لیے بغیر بولی "بھابی جمشید بہت اچھا انسان ہے۔"

"تیری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے رابعہ، تُو اس کی اچھائی ہی دیکھے گی۔ برائی تک تو تیری نظر جا ہی نہیں سکتی۔ وہ تجھ سے اپنی ہر برائی چھپائے گا تبھی تو اس پر اندھا اعتماد کرے گی۔"

"نہیں بھابی نہیں، وہ ایسا نہیں ہے۔ بہت عظیم بہت مخلص ہے وہ۔"

"تیری عمر اتنی نہیں ہوئی کہ تو ان باتوں کو جانچ پرکھ سکے۔ کیا اپنے آپ اور خاندان کو بدنامی کی تباہی سے ہمکنار کرنا ہے؟ سلیم تو جانے غصے کو کیسے قابو کرتے ہیں اور اماں..... مر جائے گی غم سے جو تو نے اپنی روش نہ بدلی۔" ناصرہ اسے ڈراتی' دھمکاتی اور چمکارتی رہی۔

اماں تو جیسے اس اچانک صدمے سے زندہ ہی مر گئی۔ سلیم جانے غصے کو کیسے دبا گیا۔ اس دن کے بعد سلیم نے رابعہ پر نگاہ تک نہیں ڈالی۔ رابعہ کو کالج سے اٹھا لیا گیا۔ گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی گئی۔ وہ روئی دھوئی' چیخی چلائی' احتجاج کیا۔ پڑھائی جاری رکھنے کے لیے منت سماجت کی' لیکن کسی نے اس کی نہ سنی۔

رابعہ کئی دن کالج نہ گئی۔ جمشید سے نہ ملی اور نہ ہی کوئی رقعہ لکھا' تو وہ بے کل اور بے چین ہو گیا۔ اس تک رسائی کے راستے نکالنے کی بہت کوشش کی۔ اس کی ایک سہیلی ڈھونڈ نکالی۔ اس کے ذریعے پیغام بھجوایا۔ لیکن اماں نے سہیلی کی جو درگت بنائی، اس نے آئندہ نامہ و پیام لانے سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ کانوں کو ہاتھ لگائے۔

جمشید کی پریشانی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نے تو رابعہ کو بڑے خلوص سے چاہا تھا۔ وہ ان چاہتوں میں ابدیت کا رنگ بھرنے کی کوشش میں تھا۔ ماں باپ کو سمجھا بجھا رہا تھا۔ لیکن اب جو رابعہ پر پابندی لگی، تو ماں باپ سے اپنی بات زبردستی منوانے پر ڈٹ گیا:

"اگر آپ یہ رشتہ قبول نہیں کریں گے تو میں گھر چھوڑ دوں گا۔ میں نے شادی صرف اور صرف رابعہ سے کرنی ہے۔ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔"

اس کی ضد بڑھی، بغاوت پر آمادہ ہوا۔ گھر چھوڑنے کیا دنیا چھوڑنے کی دھمکی بھی دے دی، تو ماں کا دل پسیج گیا۔

> **جن گھرانوں میں ماں اور باپ ایک اکائی بن کر جی رہے ہوں، وہاں ماں کا دل پسیج جائے' تو باپ کا خود بخود معاملے کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔**

جن گھرانوں میں ماں اور باپ ایک اکائی بن کر جی رہے ہوں، وہاں ماں کا دل پسیج جائے' تو باپ کا خود بخود معاملے کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔ جمشید نے ان سے بالآخر بات منوا ہی لی اور دونوں کو رشتے کی بات کرنے رابعہ کے گھر بھیجا۔

لیکن ان دنوں ہر بات عزت کا مسئلہ بنا لی جاتی تھی۔ خاص طور پر لڑکی کی پسند کی جسارت کو معاف نہ کیا جاتا۔ سلیم اور اماں تو خاصے دقیانوسی خیالات کے مالک تھے۔ رابعہ کو مار پیٹ اور گالیاں بک بک کر بھی دل کی بھڑاس نہ نکلی تھی۔ ذلت کا احساس ختم نہیں ہوا تھا۔ جمشید

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اور رابعہ کے تعلقات بھلے خلوص پر ہی ٹکے ہوں، لیکن گھر والوں کے نزدیک جرم قابلِ معافی نہیں تھا۔

رشتہ آیا جسے انتہائی بیدردی، ذلت اور تحقیر آمیز رویے سے رد کر دیا گیا۔ یہ رشتہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں۔ اور اس محبت کو قبول کر کے ازدواجی زندگی کا بندھن باندھ دیا جائے۔ اماں اور سلیم یہ ہتک، یہ ذلت گوارہ کر ہی نہیں سکتے تھے لہٰذا انکار کر دیا گیا۔

رابعہ اب ایک بارود تھی جسے اتار پھینکنے کے لیے اماں تگ و دو میں مصروف ہو گئیں۔ رشتے کی تلاش تو پہلے بھی کر رہی تھیں، اب اور تیز کر دی۔ ہر ملنے والے سے کہا، ہر عزیز رشتہ دار کو رشتہ تلاش کرنے کی تلقین کی۔ وچولنوں سے رجوع کیا اور پھر ایک عام سے گھر کا کلرک لڑکا مل ہی گیا۔

رابعہ بارود کی گٹھڑی گھر میں پڑی تھی۔ کیا خبر کس وقت پھٹ پڑے، تباہی و بربادی پھیلا دے۔ پھٹنے سے پہلے ہی اسے دوسرے گھر کی کرنا تھا۔ اسی لیے جھٹ رشتہ طے کیا اور مہینے کے اندر شادی کر دی۔ رابعہ کو وداع کر کے اماں اور سلیم نے اپنے گھر کی دیواریں تو محفوظ کر لیں، اب بارود پھٹے بھی تو نقصان رابعہ اور اس کے نئے گھر کو ہو سکتا تھا۔ لیکن اب اس کا امکان نہیں تھا۔ بارود سیلا ہو جائے تو پھسپھسا ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت باقی نہیں رہتی۔ دھماکا کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ شادی ہو جانے سے رابعہ بھی سیلا بارود بن کر رہ گئی۔

وہ روتے دھوتے زندگی کے دن گزارنے لگی اور اب تک گزار رہی تھی۔ اب محبت نہیں مالی حالات کا رونا تھا۔ پانچ بچے تھے۔ شوہر کلرک سے ہیڈ کلرک ہو چکا تھا اور بس۔ جمشید مالی طور سے مستحکم تعلیمی لحاظ سے برتر اور اخلاقی اعتبار سے اس کلرک شوہر سے کہیں اونچا تھا۔ لیکن کسی نے یہ نہیں دیکھا اور مستقبل کا نہیں سوچا۔ رابعہ کو محبت کرنے کی ایسی سزا دی جو اسے ساری عمر بھگتنا تھی۔

”اوہ میرے خدا.....“ سلیم احمد سوچوں کے تانے بانے میں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑائے پھر پلنگ میں اٹھ کر بیٹھ گئے۔

”عامرہ..... عامرہ نے بھی وہی کیا جو رابعہ کر چکی۔“ آنکھیں بند کر کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے سلیم احمد نے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ تبھی پلنگ ہلنے سے ناصرہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کروٹ بدلی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا، کمرے میں مدھم سی روشنی تھی اور سلیم کانوں پہ ہاتھ رکھے، بستر میں بیٹھے تھے۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ حیران سی ہوئی۔ آنکھیں جھپکائیں پھر پوری طرح بیدار ہوتے ہوئے گھبرا کر اٹھی۔ ”سلیم..... آپ..... سوئے نہیں، کیا ہوا..... طبیعت تو ٹھیک ہے.....“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”کچھ نہیں، کچھ نہیں، سو جاؤ تم۔“ سلیم نے عجلت سے کہا۔

وہ کمبل پرے ہٹا کر ان کے قریب آ کر بولی ”کیا بات ہے؟ پریشان کیوں ہیں؟ سوئے نہیں ابھی تک؟“

وہ ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ عامرہ کے فون کرنے سے وہ اتنے پریشان اور مشوش تھے کہ بات زبان سے نکل ہی نہ سکی۔ ناصرہ بھی پریشان ہو گئی۔ بار بار پوچھنے لگی تو سلیم نے افسردہ لہجے میں ساری بات بتائی۔ ناصرہ کی جان میں جان آئی۔ شوہر کو سرزنشی انداز میں دیکھتے ہوئے بولی ”بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ ضروری تو

www.pdfbooksfree.pk

نہیں کہ وہ کسی لڑکے ہی کو فون کر رہی ہو۔"

"مجھے یقین ہے۔"

"کوئی بات سنی آپ نے جس سے یقین ہوا؟"

"سنی تو نہیں۔"

"تو پھر؟"

"دیکھی ہے۔"

"کیا؟"

"ناصرہ..... میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں۔ میں اس کے کمرے میں گیا، تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس کا لہجہ، اڑی رنگت، کانپتی آواز..... یقین کرو ناصرہ وہ سہیلی نہیں کسی لڑکے کو فون کر رہی تھی۔ اس کی بالکل وہی حالت تھی جو آج سے بیس برس پہلے رابعہ کی تھی۔"

"ہوں۔" ناصرہ اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سوچ میں ڈوب گئی۔

"میں اس وقت سے پریشان ہوں ناصرہ۔ سوچ رہا ہوں کیا تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائے گی۔"

ناصرہ چند لمحے سر جھکائے متفکر سی بیٹھی رہی۔ پھر بولی "آپ اتنے پریشان نہ ہوں اور نہ ہی عامرہ سے کچھ کہیں۔ میں خود اس سے پوچھ لوں گی۔ وہ میری بیٹی ہی نہیں اچھی دوست بھی ہے۔ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گی نہ ہی کچھ چھپائے گی۔ آپ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی۔ بس آپ بات یہیں ختم کردیں۔"

سلیم نے بیوی کی طرف دیکھا۔ ناصرہ نے سر اثباتی انداز میں ہلایا۔ سلیم کے دل کا بوجھ بیوی سے باتیں کرنے پر کچھ ہلکا ہوگیا۔ ناصرہ نے بار بار سو جانے کے لیے کہا' تو وہ بستر پر لیٹ گئے۔ رات کا بہت سا حصہ پریشانی کے عالم میں جاگتے گزارا تھا، اس لیے تھوڑی ہی دیر میں نیند نے آلیا۔

وہ سو گئے، تو ناصرہ جاگنے لگی۔ ذہنی دھچکا اسے بھی لگا تھا۔ عامرہ سے اسے ایسی امید نہ تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ عامرہ نے اس سے یہ بات چھپائی تھی حالانکہ اسے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا۔ وہ اپنی تربیت پر نازاں تھی۔ اس کی بیٹی کبھی کوئی غلط کام نہیں کرسکتی تھی لیکن یہ بات..... یہ بات اس نے چھپائی تھی۔ اس نے کسی لڑکے کو پسند کرلیا' اسے محبت کرنے لگی' تو اشارۃً کنایتاً ماں سے بھی کہہ دیتی۔

> **"وہ میری بیٹی ہی نہیں اچھی دوست بھی ہے۔ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گی نہ ہی کچھ چھپائے گی۔"**

رات کا بقیہ حصہ اس نے آنکھوں ہی میں کاٹا۔ کئی بار جی چاہا کہ ابھی جا کر عامرہ سے پوچھے کہ قصہ کیا ہے؟

صبح اس نے عامرہ کو دیکھا، محسوس کیا، جانچا، تو وہ بھی اس نتیجے پر پہنچی جس پر سلیم پہنچے تھے۔ عامرہ باپ سے کترائی کترائی تھی۔ ناشتا بھی ان کے ساتھ نہیں کیا۔ باورچی خانے ہی میں کھڑے کھڑے چائے پی کر کالج چلی گئی۔ گھبراہٹ اور خوف اس پر مسلط تھا۔ ایک ماں یہ بھانپ سکتی تھی۔

"دیکھا۔" سلیم نے عامرہ کے کالج جانے کے بعد دکھ اور پریشانی سے کہا۔

"ہوں" وہ بولی۔

"ناصرہ..... میں..... میں یہ سب برداشت نہیں کروں گا۔" وہ غصے سے بولے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ناصرہ نے جلدی سے کہا ''میں نے کہا نا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ کیوں خوامخواہ بات مشتہر کرنا چاہتے ہیں..... میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ آپ اطمینان رکھیں..... میں آج عامرہ سے حقیقت اگلوا لوں گی۔ پھر دیکھوں گی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

سلیم خاموش ہو گئے۔

عامرہ کالج سے آ کر سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کھانا کھانے بھی نہیں آئی۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا، تو ناصرہ اس کے کمرے میں گئی۔ وہ لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر چت پڑی تھی۔ پریشانی، ڈر اور خوف اب بھی اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ماں کو دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ ناصرہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی ''آج یونیفارم نہیں بدلا اور نہ ہی کھانا کھایا، کیا بات ہے؟''

عامرہ نے ماں کی طرف دیکھا ''کیا اس نے امی کو کچھ نہیں بتایا۔'' اس نے سوچا۔

ناصرہ اس کی نظروں کا سوال جانچ چکی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ ملائمت سے بولی ''عامرہ! میں تمھیں بیٹی سے زیادہ دوست سمجھتی ہوں۔''

''جی..... جی..... امی۔''

''ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گی۔''

اس نے سر اثبات میں ہلایا لیکن دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہاتھ ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

''رات گئے کسے فون کر رہی تھیں؟''

''امی۔''

''ڈرو نہیں، گھبراؤ بھی نہیں۔ میں تمھاری ماں اور دوست ہوں۔ تم اپنی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتیں۔ یہ بھی کہہ دو، کون تھا وہ..... ہوں..... مجھ پر بھروسا کرو۔''

ناصرہ نے تسلی دی، پیار کیا اور بات اگلوا لی.....

عامرہ ماں سے جھوٹ نہ بول سکی۔ اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے بولی ''امی عمیر کا فون تھا۔ میری دوست پنکی کو آپ جانتی ہیں نا..... اس کا بھائی ہے۔''

ناصرہ نے دم سادھے سادھے پوچھا ''تم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟''

''جب سے وہ امریکا سے ایم بی اے کر کے آیا ہے۔''

''تجھے یقین ہے کہ وہ تجھ سے شادی کرے گا؟''

''ہاں امی..... اس کے امی ابو مجھے بہت پیار کرتے ہیں۔ پنکی بھی اور عمیر تو.....''

وہ آگے کچھ نہ بولی۔ ماں کی گود میں منہ چھپائے پڑی رہی۔ ناصرہ کئی لمحے سوچتی رہی۔ پھر آہستگی سے بولی ''تو جانتی ہے، ان کی حیثیت ہم سے کتنی بلند ہے۔''

وہ چپ رہی۔ ناصرہ اسے نشیب و فراز سمجھانے لگی۔ ماں باپ کی عزت..... لوگوں کی باتیں..... لڑکی کی پوزیشن، ناکامی کی صورت میں تاریک مستقبل..... بہت کچھ کہا، بڑا سمجھایا۔ عامرہ اسی طرح اس کی گود میں منہ دیے رہی۔ ایک لفظ نہ بولی۔

ماں خاموش ہوئی تو صرف یہی کہا ''امی کوئی بات نہیں امی..... عمیر کے ممی ڈیڈی ہمارے ہاں رشتہ لے کر آنے کا سوچ رہے ہیں..... آپ..... آپ نہ تو نہیں کریں گی نا..... ہم دونوں..... پیار کرتے ہیں امی.....

> کبھی کبھی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ضرور ہے، لیکن چشم بصیرت وا ہو، تو اس سے سبق سیکھا جا سکتا ہے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

"عمیر بہت اچھا ہے..... آپ ان سے مل کر تو دیکھیں۔"

ناصرہ پھر عمیر سے ملی اور اس کے امی ابو سے بھی۔ ان کا عندیہ معلوم کیا۔ وہ سب واقعی عامرہ کو بہت چاہتے تھے۔ عمیر کی پسند انھیں پسند تھی۔ وہ دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے پر رضامند تھے۔

ناصرہ چند دن معاملے کی نزاکت اور اونچ نیچ کو سوچتی رہتی۔ اس دوران سلیم سے بھی معاملے پر کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی۔ سلیم کی پریشانی نمایاں تھی، وہ گم صم سے ہو گئے تھے۔ عامرہ سے تو بات نہیں کرتے۔ کسی کسی وقت تو اسے دیکھ کر خون کھولنے لگتا۔ تاریخ دہرائے جانے سے وہ بہت دکھی اور مضمحل تھے۔

کبھی کبھی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ضرور ہے، لیکن چشم بصیرت وا ہو، تو اس سے سبق سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ سبق سلیم تو نہ سیکھ سکے ہاں ناصرہ نے ضرور سیکھ لیا۔ اس نے جمشید اور رابعہ کی طرح دونوں کو ہمیشہ کے لیے تنہائیوں کی گھٹنائیوں میں پھینک دینے کے بجائے مثبت [illegible] کیا۔

اس دن جب ناصرہ نے اپنا فیصلہ سلیم کو سنایا، تو وہ ششدر رہ گئے۔ جرأت پر سزا دینے کے بجائے ناصرہ ان سے عمیر اور عامرہ کے بیاہ کی بات کر رہی تھی۔

"وہ لوگ کل رشتہ لے کر آ رہے ہیں۔ میں نے عمیر اور اس کے گھر والوں کے متعلق پوری تسلی کر لی ہے۔ وہ بہت اچھے اور بڑے خواہش مند ہیں۔ عامرہ کی خوش بختی ہے جو اونچے گھرانے والے لوگ اسے اپنا رہے ہیں۔"

"لیکن..... یہ..... یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"یہ بے غیرتی ہے..... عامرہ عمیر سے۔"

"بس بس سلیم صاحب..... بیس سال پہلے والے انداز میں مت سوچیے۔ اندھے جذبات کی رو میں بہ کر آپ نے رابعہ کی زندگی برباد کر دی۔ اب میں عامرہ کو رابعہ بننے نہیں دوں گی۔ وقت کے تقاضے دیکھیں اور آنکھیں کھولیں۔ جذبات مشتعل کرنے کی ضرورت نہیں۔" ناصرہ نے سلیم کو قائل کرنے کے لیے لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔

سلیم خالی نظروں سے ناصرہ کو تکنے لگے وہ کہہ رہی تھی "وقت وقت کی بات ہے۔ اس وقت لوگوں کی سوچ و فکر اور تھی۔ تب لوگ اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ جیتے تھے۔ اب لوگوں نے اپنے لیے جینا بھی سیکھ لیا ہے۔ اب لوگ کشادہ ذہن ہو چکے۔ بیٹے کی پسند اور محبت دیکھتے ہوئے جب عمیر کے والدین اس بندھن پر آمادہ ہیں، تو پھر بچی کے جذبات سے آگہی ہوتے ہوئے بھی ہم کیسے آنکھیں موند کر اس کی زندگی اس کا مستقبل اپنے پیدا کردہ حالات کی سولی پر لٹکا دیں؟ پھر ہمارے دین نے بھی حکم دیا ہے کہ لڑکی کی پسند کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ لوگ کل آ رہے ہیں۔ ہم ان کا خوشدلی سے خیر مقدم کریں گے۔ ٹھیک ہے۔" ناصرہ نے سلیم سے پوچھا۔

سلیم منہ سے تو کچھ نہیں بولے البتہ ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ ان کے ذہن میں خستہ حال رابعہ کا سراپا گھوم رہا تھا۔ کاش انھوں نے اس وقت بھی جذبات کی رو میں بہ کر فیصلہ نہ کیا ہوتا۔ گہری سانس چھوڑتے ہوئے انھیں ناصرہ کی بات سچ مانتے ہوئے دل میں [illegible] کرنا پڑی کہ واقعی وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

درخشاں اسلامی تاریخ کے زریں اوراق

اہل مغرب سے فاتح مسلمانوں کا سلوک

مسلم فاتحین غیر مسلموں کے ساتھ جس طور پیش آئے اس کی نظیر تاریخ انسانیت میں نہیں ملتی

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی

جب حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز مسند خلافت پر بیٹھے تو سمرقند کے لوگوں کا ایک وفد ان کے پاس شکایت لے کر آیا۔ وہ یہ کہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار قتیبہ نے بغیر کسی جواز کے اُن کے شہر پر قبضہ کر کے وہاں مسلمانوں کو بسا دیا ہے۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے عامل سمرقند کو لکھا کہ وہ قتیبہ اور سمرقندیوں کے مقدمہ کے لیے ایک خصوصی عدالت مقرر کریں۔ اگر جج یہ فیصلہ دے کہ مسلمانوں کو وہاں سے نکل جانا چاہیے، تو وہ فوراً شہر خالی کر دیں۔

عامل نے جمیع بن حاضر الباہلی کو مقرر کیا کہ وہ تحقیقات کریں۔ تحقیق کے بعد انھوں نے جو خود بھی مسلمان تھے، مسلمانوں کے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ دیا۔ نیز یہ لکھا کہ اسلامی فوج کے سپہ سالار کو چاہیے تھا، پہلے انھیں جنگ کا الٹی میٹم دیتے اور اسلامی جنگی قانون

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کے مطابق تمام معاہدے منسوخ کرتے تاکہ اہل سمرقند مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے تیاری کر سکتے۔ ان پر اچانک حملہ ناروا تھا۔''

جب اہل سمرقند کو یہ صورت حال معلوم ہوئی، تو انھیں یقین ہو گیا کہ تاریخ انسانیت کے اندر اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک حکومت نے کسی فوج کے کمانڈر انچیف اور فوج کو ایسے ضوابط کے اندر کس کے رکھا ہو۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس قوم سے جنگ فضول ہے۔ بلکہ ایسی قوم کی حکمرانی اللہ کی نعمت اور رحمت ہے۔ لہٰذا وہ اسلامی فوج کے رہنے پر رضا مند ہو گئے اور فیصلہ کیا کہ مسلمان ان کے درمیان رہیں۔

غور کیجیے، ایک فوج شہر فتح کر کے اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ لوگ فاتح حکومت سے شکایت کرتے ہیں۔ حکومت کے جج خود اپنی فاتح فوج کے خلاف فیصلہ دیتے ہیں۔ اس کے اخراج کا حکم صادر کرتے اور فیصلہ دیتے ہیں کہ شہریوں کی مرضی کے خلاف وہ وہاں نہیں رہ سکتی۔ کیا انسانیت کی قدیم اور جدید تاریخ میں کوئی شخص ایسی ایک جنگ کی نشان دہی کر سکتا ہے جس کے سپاہی اپنے آپ کو ایسی حدود و قیود کا پابند رکھتے اور سچائی اور صداقت کے ایسے بلند پایہ اصولوں کی پیروی کرتے ہوں جیسا کہ اسلامی تہذیب کے فرزندوں نے کر دکھایا؟ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اقوام عالم میں کسی بھی قوم کے اندر ایسے اخلاق کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ہے پاس عہد اور شرافت!

اسلامی ظفر مند فوج دمشق، حمص اور شام کے بقیہ شہروں کو فتح کر لیتی ہے۔ صلح نامے کے مطابق وہاں باشندوں کی جان و مال کی حفاظت اور ملکی دفاع کے لیے کسی قدر ٹیکس وصول کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد مسلم قائدین کو خبر ملتی ہے کہ ہرقل نے ایک عظیم فوج تیار کی ہے اور وہ اسے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کن معرکہ میں اتارنے والا ہے۔

اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ تمام مفتوحہ شہر خالی کر کے ایک مقام پر جمع ہو جائیں اور ہرقل کی تیار کردہ بھاری فوجی طاقت کا مل کر مقابلہ کریں۔ چناں چہ اس فیصلے کے مطابق اسلامی افواج حمص، دمشق اور دوسرے شہر خالی کرنے لگیں۔ حضرت خالدؓ نے اہل حمص، حضرت ابو عبیدہؓ نے اہل دمشق اور دوسرے کمانڈروں نے دیگر شہروں میں شہریوں کو جمع کر کے ان سے کہا:

''ہم نے آپ لوگوں سے اس لیے رقوم وصول کی تھیں کہ ہم تمھاری جان و مال کی حفاظت اور بیرونی حملہ آوروں سے تمھارا بچاؤ کریں گے۔ لیکن افسوس کہ اب ہم تم سے جدا ہو رہے ہیں اور تمھاری حفاظت اور دفاع کی ذمے داری ادا نہیں کر سکتے، لہٰذا آپ لوگوں کی رقومات ہم واپس کر رہے ہیں۔''

اس پر شہریوں نے کہا:

''اللہ آپ لوگوں کو فتح یاب کرے اور یہاں دوبارہ لوٹائے۔ تمھاری حکومت اور تمھارے عدل و انصاف نے ہمیں اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ کیونکہ ہمیں رومیوں کے ہم مذہب ہونے کے باوجود ان کے جور و ظلم کے بڑے تلخ تجربات ہوئے ہیں۔ خدا کی قسم اگر تمھاری جگہ وہ لوگ ہوتے، تو ہم سے لیے ہوئے اموال میں سے ایک کوڑی بھی نہ لوٹاتے، بلکہ اپنے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی لے جاتے جنھیں اٹھا سکتے۔''

آج اس مہذب دور میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کسی فوج کو کہیں جگہ خالی کرنا پڑے تو وہ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑتی جس سے دشمن فائدہ اٹھا سکے۔ لیکن کیا اسلامی تہذیب کی فاتح افواج کے رویے جیسی پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ہے؟ خدا کی قسم اگر میں اعلیٰ اقدار پر ایمان نہ رکھتا اور ان کی کامیابی پر یقین نہ رکھتا یا عہدِ حاضر کے سیاستدانوں کی طرح اخلاق و اصول کو سیاسی مفادات کے تابع نہ رکھنا ضروری سمجھتا' تو کہہ دیتا کہ ہماری فوج کے قائدین نے غفلت اور حماقت کی بنا پر اعلیٰ اقدار اور اصول پسندی کو اپنائے رکھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ لوگ فی الواقع سچے مومن تھے اور یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ کوئی ایسی بات کہیں جسے عملاً کر کے نہیں دکھائیں۔

گورنر کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا

یہ عباسی خلیفہ المنصور کے دور کی بات ہے۔ لبنان کے بعض غیر مسلم شر پسندوں نے وہاں کے عامل، علی بن عبداللہ بن عباس کے خلاف بغاوت کر دی۔ وہ ان سے لڑے اور انھیں شکست دی۔ انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اب ان مفسدہ پردازوں کے لیے یہ موقع نہ رہے کہ وہ پھر جتھہ کی شکل میں منظم ہو کر فتنہ و فساد کریں۔ لہٰذا انھیں جلاوطن کرنے کا حکم دے دیا۔

یہ وہ کم سے کم سزا تھی جو آج کل مہذب ملک کے حکمران نہایت آسانی سے دے سکتے بلکہ دیا کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کے مقتدر عالم دین، امام اوزاعی نے علی بن عبداللہ کو لکھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کا یہ فعل خلاف شریعت ہوگا۔ بغاوت میں عملاً حصہ لینے والوں کے ساتھ دوسرے ذمیوں کو سزا دینا اور انھیں جلاوطن کرنا کسی صورت جائز نہیں۔ جو مجرم ثابت ہو جائیں' صرف انھیں سزا دی جا سکتی ہے۔ انھوں نے عامل لبنان کو جو خط لکھا تھا' اس کا یہ حصہ قابل غور ہے:

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے جبل لبنان کے اہل ذمہ میں سے بعض لوگوں کو قتل کیا ہے اور بعض کو اپنے وطن سے نکال دیا ہے۔ ان جلاوطن لوگوں میں کچھ

صاحب تحریر

ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی شام کے ممتاز عالم دین اور سیاسی رہنما ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں حمص میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں وفات پائی۔ آپ ساری عمر فرانسیسی استعمار اور ان مغربی مستشرقین سے نبرد آزما رہے جو اپنی تخلیقات میں اسلام اور نبی کریم پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ آپ نے ''۲۱'' کتب تصنیف کیں۔

ان کتب میں سب سے زیادہ شہرت ''السنہ و مکانتھا فی التشریع'' اور ''من روائع حضارتنا'' کو ملی۔ اول الذکر کتاب میں ڈاکٹر مصطفیٰ نے بدنام زمانہ ہنگرین مستشرق، ایگناز گولڈزیہر کے الزامات کا جواب دیا ہے جو اس نے دین اسلام پر لگائے۔ جبکہ آخرالذکر کتاب اسلامی تہذیب و تمدن کی شاندار روایات سے متعلق ہے۔

کئی سال پہلے ''من روائع حضارتنا'' کا اردو ترجمہ معروف عالم دین، معروف شاہ شیرازی نے ''اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو'' کے نام سے کیا تھا۔ زیر نظر مضمون اسی کتاب سے بصد شکریہ لیا گیا۔ یہ ہمارے شاندار عہد رفتہ کی منہ بولتی تصویر ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

لوگ ایسے بھی ہیں جو باغیوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کر رہے تھے۔ آپ بتائیں کہ ایک خاص آدمی یا گروہ کے گناہ کے عوض آپ عوام الناس کو کس اصول کے مطابق سزا دے رہے ہیں؟ آپ ان لوگوں کو ان کے ملک اور جائدادوں سے نکال رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ (سورۃ الزمر۔7) یہ بہترین موقف ہے اور اس قابل کہ اس کی پیروی کی جائے۔''

نیز رسول خداﷺ کی یہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے: من ظلم معاهدًا او كلفه فوق طاقة فانا خصيمه يوم القيامة (جس نے کسی معاہد پر کوئی ظلم کیا یا اس پر ناقابل برداشت بار ڈالا تو قیامت کے دن میں اس کا مدعی ہوں گا۔''

اب والیِ لبنان کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارکار نہ تھا کہ وہ ان لوگوں کو اعزاز واکرام سے اپنے گھروں کو لوٹا دے۔

علامہ ابن تیمیہ کا مطالبہ

جب تاتاریوں نے شام کے علاقے پر یلغار کی، تو بے شمار مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو قید کر لیا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے تاتاریوں کے امیر سے قیدیوں کی رہائی کے سلسلہ میں گفتگو کی۔ امیر نے کہا کہ وہ صرف مسلمان قیدیوں کی رہائی کے لیے تیار ہے، عیسائیوں اور یہودیوں کو نہ چھوڑے گا۔ لیکن شیخ الاسلام نے اسے منظور نہیں کیا اور کہا:

''عیسائیوں اور یہودیوں کی رہائی بھی ضروری ہے جو ہمارے اہل ذمہ اور ہماری قید میں ہیں۔ ہم ایک فرد کو بھی قید میں رہنے نہیں دینا چاہتے خواہ وہ ہماری ملت کا ہو یا ہمارے اہل ذمہ میں سے۔''

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ (سورۃ الزمر۔7)

عیسائی سُورماؤں کی بربریت

اس کے برخلاف کسے نہیں معلوم کہ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائی سورما کیا کرتے رہے ہیں؟ قرون وسطیٰ میں جب یہ جنگیں ہم پر مسلط کی گئیں، تو مسلمان مسلسل عہد کی پاسداری اور وہ لوگ متواتر غداری کرتے رہے۔ ہم ان سے درگزر کرتے رہے اور انھوں نے ہمیشہ انتقام لیا۔ ہم انسانی جانوں کی حفاظت کرتے رہے اور انھوں نے اس قدر خونریزی کی کہ سڑکوں پر گھٹنے گھٹنے خون جم گیا۔ لیکن یہ سنگ دل اپنے ان کارناموں پر فخر کرتے، خوشیاں مناتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔

جب یہ صلیبی سورما اپنے دوسرے حملے میں معرۃ النعمان پہنچے تو شہری ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن انھوں نے شہر کو دشمن کے حوالے کرنے سے پہلے حملہ آوروں کے ذمے دار قائدین سے اپنی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا عہد لیا۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ ان درندوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی ایسے مظالم ڈھائے جن کی داستان سن کر بچے مارے دہشت کے بوڑھے ہو جائیں۔ خود بعض ایسے انگریز مورخین کا بیان ہے جو اس جنگ میں شریک تھے کہ وہاں کے مسلم مقتولین کی تعداد ایک لاکھ تھی جن میں بچے بوڑھے، مرد اور عورتیں سب شامل تھے۔

اس کے بعد دشمن بیت المقدس کی طرف بڑھا اور

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

آبادی کو محاصرہ میں لے لیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ وہ لازماً مغلوب ہوں گے۔ انھوں نے حملہ آوروں کے سپہ سالار گنکرڈ سے اپنی جان و مال کی حفاظت کا عہد لیا۔ اس نے انھیں ایک سفید جھنڈا دیا کہ وہ مسجد اقصیٰ پر لہرا کر اندر داخل ہو جائیں۔ ہر چیز کے بارے میں انھیں امان دے دی گئی ۔۔۔ اب یہ حملہ آور شہروں میں داخل ہوئے، لیکن آہ! کہ یہ مقدس شہر کس قدر ہولناک مذبح بنا! آہ، کس قدر ہولناک جرائم کا ارتکاب کیا گیا!

بیت المقدس کے باشندوں نے مسجد اقصیٰ میں پناہ لی، جس پر انھوں نے گنکرڈ کا دیا ہوا سفید جھنڈا اس کے حکم کے مطابق لہرا دیا تھا۔ مسجد مقدس بوڑھوں، بچوں اور عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔ چرچشم فلک نے دیکھا کہ جان و مال کی حفاظت کا عہد کرنے اور امن کا جھنڈا دینے والے مسجد میں گئے اور سب انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا۔ مسجد خون سے بھر گئی اور فوجیوں کے گھٹنوں تک خون جا پہنچا۔ شہر کے تمام باشندوں کو ذبح کر کے بزعم خود شہر کو پاک کیا گیا۔

شہر کی سڑکیں انسانی کھوپڑیوں سے پٹ گئیں۔ ہر طرف کٹے ہوئے اعضا اور ہاتھ پاؤں اور مسخ شدہ اجسام بکھرے پڑے تھے۔ ہمارے فوجیوں نے بیان کیا ہے کہ صرف مسجد اقصیٰ کے اندر ستر ہزار نفوس کو ذبح کیا گیا جن میں بچوں اور عورتوں کے علاوہ بڑے بڑے علما اور فضلا عابدوں اور زاہدوں کی کثیر تعداد بھی تھی۔ خود انگریز مورخین نے بھی ان شرمناک واقعات کا انکار نہیں کیا بلکہ وہ ان کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتے ہیں۔

صلاح الدین ایوبی کا رحم دلانہ برتاؤ

اس سفاکی کے ۹۰ سال بعد صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انھوں نے وہاں کے باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہاں قریب ایک لاکھ مغربی باشندے آباد تھے۔ انھوں نے ان کو جان و مال کی امان دی۔ اور ہر شخص نہیں بلکہ محض صاحبانِ استطاعت سے معمولی رقم لے کر سب کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ یہی نہیں، تیاری کے لیے چالیس دن کی مہلت بھی دی۔ اس طرح وہاں سے بھی عیسائیوں کا نہایت اطمینان اور امن و امان کے ساتھ انخلا عمل میں آیا، جو عکا وغیرہ میں اپنے متعلقین کے ہاں پہنچے۔ بہت سے نادار لوگوں کو بغیر کسی فدیہ کے چھوڑ دیا گیا۔

ان کے بھائی ملک عادل نے ۲ ہزار آدمیوں کا فدیہ اپنے جیب خاص سے دیا۔ عورتوں سے تو انھوں نے ایسا سلوک کیا جو آج کل کے کسی مہذب فاتح سے متوقع تو کجا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائیوں کے مذہبی راہنما پیٹر آف یارک نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا تو سلطان نے اجازت دے دی۔ اس کے پاس بے شمار دولت تھی، جس کی صحیح مقدار صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ بعض مشیروں نے صلاح الدین کو مشورہ دیا کہ اس کی دولت ضبط کر لی جائے۔ لیکن سلطان نے ان کو یہ جواب دیا ''میں کسی حال میں عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔'' اس سے بھی صرف اسی قدر فدیہ وصول کیا جو ایک عام فرد سے لیا گیا تھا۔

لیکن جس چیز نے صلاح الدین کے فتح بیت المقدس کے موقع پر ان کے طرز عمل کو چار چاند لگا دیے، وہ یہ تھی کہ انھوں نے قدس کے تمام انخلا کنندہ عیسائیوں کے ساتھ اپنے محافظین بھی بھیجے۔ انھیں حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو صور اور صیدا کی عیسائی آبادیوں تک ان کے بھائی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بندوں کے پاس حفظ و امان سے پہنچا دیں۔ حالانکہ اس وقت پوری عیسائی دنیا مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھی! کیا ایسی باتیں سن کر آپ اپنے کو عالم بیداری میں ہونے کا یقین دلا سکتے ہیں؟

لیکن یہ داستان ابھی ادھوری ہے، آگے سنیے۔ کئی ایسی عورتیں جنھوں نے جزیہ ادا کر دیا تھا، سلطان کے پاس آئیں اور درخواست کی کہ ان کے شوہر، باپ اور بیٹے جنگ میں مارے جا چکے یا قید میں ہیں اور ان کی خبرگیری کرنے والا کوئی نہیں اور نہ ان کی کوئی جائے پناہ ہے۔ وہ رو رہی تھیں۔ انھیں اشک بار دیکھ کر رقیق القلب سلطان کا دل بھر آیا اور وہ بھی رونے لگے۔ پھر انھوں نے حکم دیا کہ تحقیقات کر کے ان عورتوں میں سے جن کے شوہر یا بیٹے یا باپ قید میں ہوں، انھیں رہا کر دیا جائے۔ جن عورتوں کے ولی قتل ہو چکے تھے، ان کو کثیر التعداد مال دیا۔ یہ عورتیں جہاں بھی جاتیں، سلطان کی مدح و تعریف میں رطب اللسان ہوتیں۔ جب تحقیقات کے بعد وہ قیدی رہا ہوئے، تو ان کو بھی اجازت دے دی کہ وہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کو ساتھ لے کر صور اور عکا وغیرہ اپنے بھائی بندوں کے پاس چلے جائیں۔

اب ذرا یہ بھی سن لیجیے کہ قدس سے جانے والے عیسائیوں کے ساتھ ان کے بھائی بندوں نے کیا سلوک کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ انطاکیہ گئے، مگر وہاں امیر نے انھیں شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ بیچارے سرگرداں پھرتے رہے اور بالآخر مسلمانوں ہی نے ان کو پناہ دی۔ ایک گروہ نے طرابلس کا رخ کیا، جو اس وقت لاطینیوں کے قبضے میں تھا، لیکن انھوں نے بھی ان کو قبول نہ کیا اور وہاں سے بھگا دیا۔ حتیٰ کہ ان کا وہ سارا سازوسامان لوٹ لیا جو مسلمانوں نے انھیں لے جانے دیا تھا۔

صلیبی جنگوں میں مغربی عیسائیوں کے ساتھ صلاح الدین کا یہ سلوک بادی النظر میں بالکل افسانہ معلوم ہوتا ہے اگر خود مغربی مصنفین کو اسلام کے اس بطلِ جلیل کی شرافتِ نفس اور بلند اخلاق نے تعجب میں نہ ڈال دیا ہوتا۔ تب یقیناً آج دنیا کے لیے یہ گنجائش ہوتی کہ وہ ہمارے مورخین پر مبالغہ آرائی کا الزام لگائے۔ خود اہلِ مغرب ذکر کرتے ہیں کہ جب صلاح الدین کو صلیبی حملہ آوروں کے سب سے بڑے اور سب سے بہادر جنرل رچرڈ کی بیماری کی اطلاع ملی تو انھوں نے علاج کے لیے اپنا طبیب خاص بھیجا۔ ایسے میوہ جات بھی بھیجے جو اسے، اس وقت ہرگز نہ مل سکتے تھے۔

یہ بات ایسے حالات میں ہوئی جب دونوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور ان کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں۔ نیز وہ (اہلِ مغرب) خود لکھتے ہیں کہ ایک عیسائی عورت روتی ہوئی صلاح الدین کے خیمے تک جا پہنچی اور اس نے واویلا کرتے ہوئے شکایت کی کہ دو حبشی فوجیوں نے اس کے بچے کو چھین لیا ہے۔ صلاح الدین خود بھی رو دیے اور اسی وقت ایک تحقیقاتی افسر متعین کیا، جس نے بچے کو تلاش کر کے عیسائی عورت کے حوالے کر دیا۔ عورت کو پھر چند سپاہیوں کی حفاظت میں اس کے کیمپ تک پہنچا دیا گیا۔ کیا اس کے باوجود کسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ہماری تہذیب کے مشرقی اخلاق انسانیت نواز نہیں؟

◆◆◆

www.pdfbooksfree.pk

حسرتوں اور تمناؤں کی سرحد پہ

جلتی بجھتی روشنی

ایک ڈاکٹر کا پُرفسوں افسانہ وہ ایسی دوشیزہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا جو اُسے جانتی تک نہ تھی

ڈاکٹر احسان احمد شیخ

بات نہیں بنی۔"

"وکی! ٹینا باجی نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے وقار کو چھیڑا۔

"کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟" وقار نے تکیے سے ٹیک لگا کر دیوار کے سہارے نیم دراز حالت میں بغیر کوئی تبدیلی لائے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"تمہاری ہونے والی دلہن کی تصویر لینے گئی تھی اس کے گھر۔" ٹینا باجی نے اسی چہکتے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا اور دروازہ اپنے پیچھے بند کر اطمینان سے بھائی کے بستر پر بیٹھ گئیں۔ تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور اس پر کہنیاں ٹکا دونوں ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ وقار کو دیکھنے لگیں۔ وہ قالین پر ٹانگیں پھیلائے اس طرح ٹی وی دیکھ رہا تھا جیسے کمرے میں اور کوئی نہ ہو۔ سپاٹ چہرہ لیے ہونٹ بھینچے ہوئے جیسے اسے ٹینا باجی کا کمرے میں در آنا ناگوار گزرا ہے۔

"میں نے کسی دلہن کی کوئی تصویر لینے نہیں بھیجا تھا آپ کو۔" وہ اسی طرح سپاٹ لہجے میں بولا۔

"اچھا بند کرو یہ ٹی وی اب تو یہ بڑی مصیبت بن چکا۔"

ٹینا باجی نے احتجاج کیا اور پھر وقار کے جواب کا انتظار کیے بنا جھک کر اس کی گود میں پڑا ریموٹ کنٹرول اٹھایا۔ کلک کی آواز کے ساتھ ٹی وی بند ہو گیا۔ وقار نے اب بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ ہلکی سی گہری سانس لی

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اور آنکھیں موند کر دیوار سے سر ٹیک دیا۔

"وکی! تمہیں مسئلہ کیا ہے؟"

مینا باجی نے خفگی سے کہا اور وقار کی آنکھیں کھلوانے کے لیے تکیہ اٹھا اس کے منہ پر دے مارا۔ وقار نے آنکھیں کھولیں اور اپنی گود میں گرا تکیہ اٹھا کر غصے سے سامنے والی پر پھینک دیا۔

"مسئلہ میرے ساتھ نہیں آپ لوگوں کے ساتھ ہے۔" وہ قریباً چلاتے ہوئے بولا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میں چار سال انگلینڈ میں محنت کر کے آیا ہوں۔ سخت محنت کی ہے میں نے اور اب میں اپنا کیریئر شروع کرنے لگا ہوں تو آپ اور امی نے یہ شادی کا شوشا چھوڑ دیا۔"

"بھئی تم سمجھنے کی کوشش کرو۔" مینا باجی پنگ سے اٹھیں اور فرش تکیہ گھسیٹ کر قالین پر وقار کے قریب بیٹھ گئیں۔

"وکی! تم جانتے ہو جب ابو فوت ہوئے تو تم دونوں اسکول پڑھ رہے تھے۔ امی نے ہماری خاطر اپنی زندگی قربان کر دی۔ میری شادی کی اور تمہیں ڈاکٹر بنایا۔ پھر برطانیہ بھیجا۔ اب پچھلے تین سال سے وہ سرطان کی مریضہ ہیں۔ وہ تمہاری شادی کرنا چاہتی ہیں تو اس میں کیا برائی ہے؟"

"لیکن مجھے شادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وقار نے احتجاج کیا۔

"سوال تمہاری دلچسپی کا نہیں۔" مینا باجی نے پیار سے اپنا ہاتھ وقار کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ "اصل بات یہ ہے کہ شادی تو تم نے کرنی ہے۔ اگر امی کی زندگی میں ہو جائے تو ٹھیک نہیں؟"

"لیکن..."

"لیکن ویکن چھوڑو۔" مینا باجی نے وقار کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ "مجھے پتا ہے تم نے لڑکی نہیں دیکھی مگر اس میں قصور تمہارا ہے۔ تم کہتے ہو لڑکی دیکھنے گھر گھر نہیں جاؤ گے۔ میں اسی لیے مریم سے اس کی تصویر لینے گئی تھی مگر تمہیں معلوم ہے اس نے کیا کہا؟" مینا باجی ہنسنے لگیں۔ "کہتی ہے میں کوئی دکان میں رکھا ڈیکوریشن پیس تو نہیں جسے دیکھ کر پسند کیا جا رہا ہے۔"

مینا باجی نے رک کر وقار کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ پھر سپاٹ سا منہ لیے بند ٹی وی کی خالی اسکرین کو گھور رہا تھا۔

"ویسے پتا ہے وکی! ایک بات ہے۔" مینا باجی کہتے کہتے رکیں۔ وقار اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔

"پوچھو نا کیا بات ہے؟" مینا باجی نے چھیڑا۔

"جی بولیے کیا بات ہے؟" وقار نے بیزاری سے کہا جیسے یہ موضوع جلد از جلد ختم کرنا چاہتا ہو۔

"مریم ہے بہت خوبصورت۔ اللہ کی قسم تمہاری جوڑی خوب جچے گی۔" مینا باجی نے رک کر وقار کا تاثر جاننے کی کوشش کی جو دیوار سے ٹیک لگائے منہ اٹھا کر چھت کو گھور رہا تھا۔

"اور خاندان بھی بڑا سلجھا ہوا ہے۔" مینا باجی نے خود ہی بات آگے بڑھائی۔ "پڑھے لکھے، شائستہ اور کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ ہم نے ہر طرح سے اطمینان کر لیا ہے۔ تم سن رہے ہو میری بات؟"

"ہاں، سن رہا ہوں۔" وقار گویا کمرے کی چھت

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سے مخاطب ہوا۔

''اور انھوں نے ہماری ہر بات مان لی ہے۔'' مینا باجی کا لیکچر پھر شروع ہو گیا۔ ''تمھاری ضد کی وجہ سے مائیوں اور ابٹن کی رسم ہو رہی ہے نہ مہندی کی۔ سیدھا سادہ نکاح اور رخصتی! اور کیا چاہیے تمھیں؟'' مینا باجی نے تھوڑی دیر جواب ملنے کا انتظار کیا پھر بیزار ہو کر اٹھ گئیں۔ مگر باہر جاتے ہوئے اپنی ناراضی کا اظہار دروازہ زور سے بند کرتے ہی کیا۔

دروازے کا دھماکا سن کر وقار نے اپنی نگاہیں چھت سے ہٹا دروازے پر لگا دیں۔ نجانے کتنی دیر وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ ٹی وی میں نصب الیکٹرونک ٹائم پیس کی جلتی بجھتی روشنی کے علاوہ کمرے کی ہر شے ساکت تھی۔ اس کے ذہن میں اٹھتی آندھی اسے سوکھے پتے کی طرح اڑا کر ماضی میں پیچھے اور پیچھے لے جا رہی تھی۔

اس کے ذہن میں اٹھتی آندھی اُسے سوکھے پتے کی طرح اڑا کر ماضی میں پیچھے اور پیچھے لے جا رہی تھی۔

تین ماہ پہلے وہ دبئی ہوائی اڈے کے ٹرانزٹ لاؤنج میں قریباً ایک گھنٹے سے بیٹھا رسالے سے دل بہلا رہا تھا۔ لندن سے کراچی کی پرواز کے درمیان یہ واحد اسٹاپ تھا۔ پہلے لندن سے لمبی پرواز نے بیٹھے بیٹھے پاؤں شل کر دیے۔ اب ایک گھنٹے سے وہاں بیٹھا بور ہو رہا تھا۔ برطانیہ میں چار سال بہت جلد گزر گئے۔ پڑھائی اور کام نے اسے گزرتے وقت کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ اب وہ ایف آر سی ایس کر کے اپنے دیس لوٹ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے میزبان نے پبلک ساؤنڈ سسٹم پر اس کی پرواز کا نمبر پکارا۔ وہ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ جہاز میں اپنی نشست پر پہنچا تو وہاں کسی دوشیزہ کو بیٹھے پایا۔ چہرہ اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ پھولدار شلوار قمیص اور ٹانگوں تک لٹکے دوپٹے سے خیال یہی ہوا کہ موصوفہ اپنے ہی دیس کی رہنے والی ہیں۔

''ذرا سنیے۔''

وقار نے انتظار کیا کہ شاید دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اخبار میں کچھ حرکت ہو مگر غالباً اس کی موجودگی بالکل نظرانداز کر دی گئی۔

''ذرا سنیے!'' اس بار وقار نے لہجے میں تھوڑی سختی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''میرا خیال ہے یہ میری نشست ہے۔'' اخبار میں خفیف سی حرکت ہوئی اور اس کے پیچھے سے دوشیزہ کا سر اور آنکھیں نظر آئیں۔ چھوٹے چھوٹے ہلکے خم لیے ہوئے ہلکے بھورے رنگ کے انتہائی گھنے اور چمکدار بال گورے روشن ماتھے پر کمان کی طرح کھنچی ہوئی بھنووں کے عین درمیان ایک چھوٹا سا تل جو پہلی نظر میں ہی دکھائی دیتا تھا اور وہ بڑی بڑی ہلکے بھورے رنگ کی آنکھیں اس قدر صاف شفاف جیسے وہ بلبلے جو بچپن میں پانی میں صابن گھول کر بناتا اور ہوا میں اڑاتا تھا۔

''اوہ آپ چاہتے ہیں میں یہاں سے اٹھ جاؤں؟'' دوشیزہ نے اخبار لپیٹتے ہوئے پہلے وقار اور پھر اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر جواب سنے بغیر اپنا پرس

http://www.booksbube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سنبھالتے ہوئے اٹھ گئی۔ درمیانی نشست پر ایک ادھیڑ عمر انگریز سو رہا تھا۔ دوشیزہ کے اٹھنے سے وہ چونک پڑا۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے اسے اٹھ کر راستہ بنانا پڑا اور یہ کرتے ہوئے اس نے وقار کو گھورا۔

''معاف کیجیے گا۔'' وقار نے شرمندہ لہجے میں لڑکی سے کہا۔ انگریز کی ناراضی اس نے نظرانداز کر دی۔ ''سفر لمبا ہے' میں نے کاؤنٹر پر درخواست کر کے کھڑکی والی نشست لی تھی؟''

لڑکی نے جیسے وقار کے اپنی صفائی میں کہے گئے الفاظ سنے ہی نہیں' وہ اطمینان سے نشستوں کے درمیان سے نکل کر کھڑی ہو گئی۔ وقار نظریں جھکا اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ انگریز درمیانی نشست پر بیٹھ گیا اور وہ لڑکی اس کے برابر۔

جہاز اُڑا تو کافی دیر تک وقار کھڑکی کے باہر بے مقصد دیکھتا رہا۔ جب اس نے اندر نگاہ دوڑائی' تو ادھیڑ عمر انگریز پھر سو چکا اور لڑکی بڑے انہماک سے کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اس کی ایک لٹ بار بار منہ پر آ گرتی جسے وہ آہستہ بلکہ غیر محسوس طریقے سے ہٹا دیتی۔ اس کی گلابی رنگت نے جیسے اپنے اطراف پھول ہی پھول کھلا دیے تھے۔ کانوں میں لٹکے مصنوعی جیولری کے جھمکے آہستہ آہستہ جھول رہے تھے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے رسالے میں گم تھی۔

وقار کے کانوں میں اس کی مدھر آواز کا جلترنگ ابھی تک گونج رہا تھا۔ اس نے پھر کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وقار او لیول کے بعد کو ایجوکیشن اداروں میں پڑھا تھا۔ برطانیہ میں چار سالہ قیام کے دوران درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں لڑکیاں اس نے دیکھی تھیں۔ ان کے ساتھ پڑھتا رہا۔ اسپتالوں میں ان کے ساتھ دن رات ڈیوٹیاں دیں۔ ڈاکٹرز' نرس' مریضوں کے رشتہ دار' سوشل ورکرز' پارٹیوں کی رونق غرض اس نے عورت کا ہر روپ دیکھا۔ مگر یہ لڑکی سب سے مختلف ہی نہیں تھی' اس کے چہرے مہرے اور شخصیت میں ایسا سحر نظر آیا جو وقار نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

مگر یہ لڑکی سب سے مختلف ہی نہیں تھی' اس کے چہرے مہرے اور شخصیت میں ایسا سحر نظر آیا جو وقار نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔

اس نے وقار کے روئیں روئیں کو جکڑ کر رکھ دیا۔ وقار نے کئی بار کوشش کی کہ کسی طرح کوئی بات شروع کی جائے۔ مگر اول تو جو حرکت وہ دبئی پر جہاز میں بیٹھتے ہوئے کر چکا تھا' کچھ اس کی شرمندگی' دوم لڑکی کی شخصیت کا سحر کچھ ایسا تھا کہ وہ ہر بار بات کرنے کا کوئی بہانہ سوچتا' پھر ارادہ توڑ دیتا۔ ہمت ہی نہ پڑتی۔ بھلا ہو اس ادھیڑ عمر انگریز کا جو باقاعدہ سو رہا تھا اور رسالے کا جو لڑکی نے اپنی آنکھوں سے لگا رکھا تھا۔ کم از کم وقار اس کو چوری چوری ہی سہی جی بھر کر دیکھ تو سکتا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز شاید ڈیڑھ لمحے کی بھی نہ رہی۔ جہاز رکتے ہی مسافر بے صبری سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حسب معمول افراتفری میں اپنا اپنا سامان سنبھالے جہاز سے باہر جانے لگے۔ ہوائی اڈے کی طویل و

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

عریض غلام گردشوں میں انسان ایک دوسرے میں ایسے گڈمڈ ہوئے کہ وقار کی لاکھ کوششوں کے باوجود لڑکی پھر دکھائی نہ دی۔

اگلے چند ماہ مناسب ملازمت ڈھونڈنے اور اپنی پرائیویٹ پریکٹس شروع کرنے کی مصروفیت میں گزر گئے۔ مگر جہاز والی لڑکی نے وقار کے ذہن پر اس طرح قبضہ جمایا کہ آنکھیں بند کیے بنا ہی وہ جب چاہے اس کے خیالوں کے خوابوں میں پیچھے سے در آتی اور پھر جانے کا نام نہ لیتی۔

کبھی کبھی وقار [illegible] آئے خود وہ اتنا بے بس ہوتا کہ اسے اپنے آپ پر [illegible] ہوتی۔ وقار نے ساری زندگی [illegible] کو واہمیت نہیں دی تھی۔ [illegible] [illegible] بھی [illegible] سے اس طرح [illegible] [illegible] [illegible] تک اس سے [illegible]

[illegible]

[illegible] کی۔

[illegible] شادی کی تاریخ [illegible] وحشت بڑھتی گئی۔ [illegible] میں دور دراز کے رشتے داروں کی چہل پہل شروع ہوئی۔ اس کے ہم عمر دوست رشتے دار اسے دیکھ کر [illegible] انداز میں جتنا اسے سیدھے مذاق کرتے تو وہ بیزار ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔

شادی والے دن تک دوستوں اور رشتے داروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ وہ وقار کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ اس کا دل چاہا' یہ باتیں اُس کے سسرالیوں تک بھی پہنچ جائیں کہ شاید اسی طرح یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

ہال میں اسٹیج سجا۔ اسے صوفے پر بٹھایا گیا۔ دلہن لائی گئی روایتی لباس میں سج دھج کے ساتھ چہرہ گھونگٹ میں چھپائے ہوئے۔ وہ بیزاری سے دلہن کی تعظیم کے لیے اٹھ بھی۔ پھر تصویریں کھینچنے فلم بنانے اور سلامیاں دینے کا [illegible] سلسلہ چل پڑا جو رات گئے تک جاری رہا۔ وقار کی بیزاری اور وحشت بڑھتی گئی۔ اگر اسے سرطان کے الاؤ میں رواں رواں گھلتی ہوئی بیوہ ماں کا خیال نہ ہوتا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر بھی

> اسے سرطان کے الاؤ میں رواں رواں گھلتی ہوئی بیوہ ماں کا خیال نہ ہوتا تو وہ سب کچھ چھوڑ کر بھی کا [illegible]

[illegible]

[illegible] کی انگوٹھی [illegible] [illegible] چہرے سے [illegible]

ایک [illegible] وقار کا دل چاہا [illegible]

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بند اس دلہن کے پیروں کے پاس رکھے اور خود باہر چلا جائے۔ پھر اس کی آنکھوں نے بیمار ماں کی وہ نگاہیں دیکھیں جن کی بجھتی روشنی میں ہزار التجائیں مچل رہی تھیں۔ وہ شکستہ قدموں سے اپنا بکھرا وجود سنبھالے اپنے ہی پلنگ کی طرف اجنبیوں کی طرح بڑھا اور جیب سے انگوٹھی نکال آہستہ آہستہ دلہن کے قدموں کی طرف بیٹھ گیا۔

گھٹنوں میں دبے سر میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ ریشمی گھونگٹ کے پیچھے سے اجنبی کا سر اور آنکھیں نظر آئیں۔ بھولے بھولے سے ہلکے خم لیے ہوئے ہلکے بھورے رنگ کے انتہائی گھنے اور آبدار بال، گورے روشن روشن ماتھے پر کمان کی طرح تنی ہوئی بھنوؤں کے عین درمیان ایک چھوٹا سا تل جو پہلی نظر میں نکا دکھائی پڑتا تھا اور دو بڑی بڑی ہلکے بھورے رنگ کی آنکھیں اس قدر صاف شفاف جیسے وہ بچے ہوں بچپن میں پانی میں صابن گھول کر بناتا اور ہوا میں اڑاتا تھا۔

قریب ہی میز پر رکھی چھوٹی سی خوب صورت گھڑی کی ٹک ٹک اچانک رک گئی۔ ٹی وی کی جلتی بجھتی روشنی اور ٹیبل لیمپ کا جلتا ہوا بلب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ ایک چھناکا سا ہوا اور وقار کو اچانک اپنا وجود بالکل ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ اسے لگا وہ ہوا کے دوش پر بلبلوں کی طرح صاف شفاف ہو کر اوپر اور اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ نجانے کتنے پل لمحے منٹ یا شاید کتنے گھنٹے گزر گئے۔

''آپ چاہتے ہیں تو میں یہاں سے ابھی اٹھ جاؤں؟''

ایک مسحور کن آواز جلترنگ سا بجاتی ہوئی وقار کے کانوں سے ٹکرائی۔ تب دلہا' دلہن کی ہنسی کی دبی دبی آوازیں ان کے روئیں روئیں کو سرشار کر گئیں۔

◆◆◆

اچھا پن

میں کہوں گا کہ اے بندے اگر تیرا باطن پرہیز گاری سے خالی ہے اور تو ریا کے لباس میں ملبوس ہے، تو تو اپنے حال پر رنگ برنگ پردے نہ ڈال جب کہ تیرا گھر اندر سے خالی ہے اور اس میں ایک حقیر بوریا بھی نہیں ہے۔ میری بات غور سے سن کہ میں نے ایک دفعہ ایک گنبد پر پھولوں کے چند گل دستے گھاس سے بندھے دیکھے۔ میں نے گھاس کو سوچا جو معمولی سی چیز تھی، وہ بھی پھولوں کے ہمراہ ہو کر عزت کی جگہ آراستہ ہو گئی۔ میری بات سن کر گھاس رو پڑی اور اس نے مجھ سے کہا کہ تو چپ ہو جا۔ کیونکہ شرافت دوستی کو دور نہیں کرتی، اگرچہ میں حسن اور خوشبو نہیں رکھتی پھر بھی کیا میں اسی باغ کی گھاس نہیں جہاں خوشبودار پھول کھلتے ہیں۔

سن! میں ایک کریم کے دربار کا ادنیٰ غلام ہوں۔ میں اپنے آقا کی نعمتوں اور انعام سے پلا ہوں۔ میرے پاس کچھ مال نہیں۔ میں فرمانبرداری کا قیمتی سرمایہ بھی نہیں رکھتا ہوں۔ اے میرے اللہ تو بزرگ ہے۔ عالم کو زینت تیرے حکم و امر سے ملتی ہے۔ اے اللہ اس بوڑھے کو بخش دینا۔ پس اے سعدی تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے دروازے پر سر جھکا دے، پس اللہ تعالیٰ کے بندے! تو اللہ کے راستہ پر چل۔ (شیخ سعدی شیرازی)

www.pdfbooksfree.pk

بم نہ چاہتے ہوئے بھی

موبائل پر دل دے بیٹھے

ایک انوکھی ایجاد کی
خوبیوں و خامیوں کا بیان
شگفتہ و چٹپٹے انداز میں

مرزا عابد عباس

برسوں پرانی بات ہے، ہم دوستوں کی محفل میں خوش گپیوں میں مصروف تھے، ایک دوست نے کمرے کے ساتھ والی گیلری میں کھڑے ہو کر صدا لگائی "یار موبائل ہے!"

یہ سنتے ہی ہمارے کان کھڑے ہو گئے اور کوئی جرم سرزد نہ ہونے کے باوجود ہم تھر تھر کانپنے لگے۔ مگر پھر یہ راز کھلا کہ پولیس کی موبائل وین نہیں آئی بلکہ موصوف کسی کے پاس موبائل فون موجود ہونے کی اطلاع چاہتے تھے۔

خندہ بیانی

مگر اب یہ پرانا واقعہ فقط لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ اب کون یقین کرے گا کہ محفل میں موجود تھے سات افراد میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہ ہو؟ جس طرح انسان سانس لیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح اب موبائل فون کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہو چکا۔ حیرت ہے آج بھی کچھ افراد موبائل فون نہیں رکھتے اور لوگ انھیں زندوں میں شمار کرتے ہیں۔

ایک صاحب کو ہم نے بتایا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہماری جیب سے دو موبائل بس میں سفر کرتے نکل چکے۔ فرمانے لگے "آپ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے؟"

ہم نے کہا "جی ہاں!"

کہنے لگے "بغلی جیب میں رکھیں گے تو یہی ہوگا۔"

اگلی بار جب ہم ان صاحب کے دفتر گئے تو انھوں نے ہماری بالائی جیب میں موبائل دیکھتے ہوئے کہا "موبائل اوپر کی جیب

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سے فوراً نکال دیں۔"

ہم نے کہا "پچھلی بار آپ نے بغلی جیب میں گردہ کٹ کی وجہ سے رکھنے کو منع کیا تھا۔"

کہنے لگے "وہ تو ٹھیک ہے کہ بغلی جیب میں موبائل نہیں رہتا مگر جنب دل کے ساتھ موبائل لگے رہنے سے آدمی خود ہی نہیں رہتا! کیونکہ اس سے نکلنے والی شعاعوں سے دل کی دھڑکن متاثر ہو سکتی ہے۔"

اس بات پر ہم نے انھیں فی الحال یہ قطعہ سنایا:

کہا اک مولوی نے دیکھ کر جوتا مرے آگے
اگر جو سامنے ہوتا تو کچھ سجدہ نہیں ہوتا
کہا میں نے بجا ہے آپ کا ارشاد ہے لیکن
اگر پیچھے [illegible] تو کچھ ہوتا نہیں ہوتا

فون تو وہ [illegible] کرتے تھے [illegible] اب [illegible] RCID [illegible] [illegible]

[illegible]

پیوند لگانا [illegible] [illegible]

امام ابوحنیفہؒ کا مزاح

امام ابوحنیفہؒ ایک دن حجامت بنوا رہے تھے۔ حجام سے فرمانے لگے: "بھائی ذرا سر کے سفید بالوں کو چن لینا۔"

حجام کہنے لگا: "حضرت! جو بال چنے جاتے ہیں وہ پھر اور زیادہ نکلتے ہیں۔"

امام ابوحنیفہ فرمانے لگے: "اگر یہ قاعدہ ہے، تو سیاہ بالوں کو چن لو تاکہ وہ اور زیادہ نکلیں۔"

(حسن روحانی)

[illegible] لوگوں نے کیوں لگایا، یہ وہی بستہ ہے جبکہ ہم بستہ اول تو گیا، بستہ دوم میں بھی شمار [illegible] سے زائد نہیں۔ بہرحال موبائل فون پر تازہ [illegible] پیش ہے:

موبائل کے عناصر سے دوچار ہو گئے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
روزانہ ایزی لوڈ کا اتنا پڑا [illegible]
عابد بھری جوانی میں قرض دار ہو گئے!

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

میرا مسئلہ گرفتار ہونا تھا..... محبوب کی زلف میں نہیں، پولیس کے ہاتھوں..... ارے ہاں میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں کیوں گرفتار ہونا چاہتا تھا؟

میں پنجاب کے ایک دیہہ کا رہنے والا ہوں۔ فیض پور گاؤں کا نام ہے۔ یہ گاؤں جڑانوالہ روڈ پر لاہور سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ کچھ برس پہلے میرا ایک چچا قتل ہوگیا۔ مجرم گرفتار ہوئے مگر عدالت نے انھیں بری کردیا۔ ہمارے برادری والے عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہ ہوئے، وہ بدلہ لینا چاہتے تھے۔ میں اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا مگر اپنے بڑے بوڑھوں کی مرضی کے خلاف رائے دینے کی جرأت بھی نہ رکھتا۔

چناں چہ جس روز بدلہ لینے کا منصوبہ بنا، تو سوچا، میں قتل میں شامل نہیں ہو رہا لیکن دشمن نے میرا نام بھی پرچے میں لکھ دینا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ میں اس منصوبے میں شامل نہیں۔ لہٰذا فیصلہ کیا، وقوع سے پہلے خود کو کسی نہ کسی مقدمے میں گرفتار کروادوں تاکہ قتل جیسے

http://www.booksfree.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

خوفناک مقدمے سے بچ سکوں۔

اس مسئلے نے مجھے شراب پینے پر بھی مجبور کیا۔ ورنہ آپ یقین مانیں، شریف سا آدمی ہوں جو اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ فالتو وقت جاسوسی ناول پڑھ کر گزرتا ہے۔ بارھویں جماعت کا امتحان دینے سے پہلے میں نے تعلیم بالکل چھوڑی اور گاؤں میں ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان کھول لی۔

گھر سے رخصت ہوتے وقت میں نے اپنا حلیہ بڑی ہوشیاری سے تبدیل کیا۔ پھٹے پرانے کپڑے، بوسیدہ جوتی، بڑھی شیو، الجھے ہوئے بال، دیسی شراب کا آدھا شلوار کے نیفے میں، ایک ادھ جلا تھرڈ کلاس سا سگریٹ بائیں کان کے اوپر اور جیب خالی۔ اسکیم کے مطابق لاہور کے شاہی محلے کا رخ کیا۔ دوپہر سے پہلے رام روڈ کی ایک تاریک سی گلی میں شراب کی نصف بوتل اپنے حلق میں انڈیلی پھر جان بوجھ کر چھینٹے کپڑوں پر گرا لیے۔ پھر جھومتا جھامتا اس گلی سے نکل کر شاہی محلے کے چوک تک آ گیا جہاں تانگہ اسٹینڈ واقع ہے۔

میں کچھ دیر چوک میں کھڑا ادھر ادھر گھورتا رہا مگر رونق کے باوجود کسی نے میری موجودگی کا نوٹس نہ لیا۔ لوگ مجھے گداگر سمجھ کر نظرانداز کرتے رہے حالانکہ میں نے کسی سے بھیک نہ مانگی۔ جلد مجھے احساس ہوا کہ اس طرح مسئلہ حل نہ ہو گا۔ لہٰذا میں ایک مدہوش شرابی کی طرح ادھر ادھر جھولنے لگا۔ جان بوجھ کر چال میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر لی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا۔ پولیس کا ایک باوردی حوالدار بھی تھانے کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر بڑھک لگائی "آج پتا چل جائے کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ وردیاں پہن کر گیدڑ شیر نہیں بن سکتے۔"

بڑھک مارنے کے بعد میں نے اپنا ہتھیار برآمد کرنے کی خاطر شلوار کے نیفے میں ہاتھ ڈالا، بوتل نکال کر ہوا میں لہرائی اور چند بقایا گھونٹ حلق میں اور باقی کپڑوں پر انڈیل کر خالی بوتل قریب آتے ہوئے حوالدار کی طرف اچھال دی۔ وہ چند ثانیے میں پکی سڑک سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔

تیر ٹھکانے پر لگا۔ حوالدار نے آتے ہی مجھے گردن سے دبوچ لیا اور ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کرتے ہوئے بولا "اوئے کمینے تیری یہ جرأت...... پولیس کے سامنے شراب پیتا ہے...... آگے لگ۔"

کچھ راہگیر موقع واردات پر جمع ہو گئے۔ وہ حوالدار سے پوچھنے لگے کہ کیا ہوا مگر اس نے انھیں یہ کہہ کر پرے دھکیل دیا "یہ اشتہاری مجرم ہے۔ آج قابو میں آ گیا۔ لہٰذا اپنی راہ لو۔ شریف شہریوں کا کام قانون کے معاملے میں مداخلت نہیں۔" لوگ آہستہ آہستہ ہٹ گئے۔ حوالدار نے میرے دونوں بازو پیچھے کی طرف مروڑ کر مجھے قابو کیا اور پھر تھانے لے جانے کے بجائے اسی گلی کی طرف لے گیا جہاں میں نے شراب پی تھی۔

میں نے حیرت سے سوچا، یہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ لیکن جلد میری حیرانی ختم ہو گئی کیونکہ حوالدار یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ گلی میں ہمارے سوا کوئی نہیں، مجھ سے بولا "اوئے کمینے انسان! باقی تفتیش تو میں بعد میں کروں گا، پہلے جامہ تلاشی دے۔" میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ حوالدار نے جامہ تلاشی کی غرض سے میرے جسم کے تمام حصوں کا باری باری پوسٹ مارٹم کیا۔ جب پاؤں تک تلاشی لے چکا، تو میری جیب میں

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ ڈالا جو جلد اسی حالت میں واپس نکل آیا جس میں داخل ہوا تھا۔ اب یہ خالی ہاتھ غصے سے مجھ پر برسنے لگا...... میں مار کھاتا رہا حتیٰ کہ حوالدار تھک گیا اور قدرے توقف کے بعد بولا ”اوئے کمینے! شراب پیتا ہے اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں!؟“ میرے پیٹ پر ٹھڈا رسید کر کے مزید کہا ”کمینے لوگ...... آجاتے ہیں تماش بین بن کر...... پولیس کا وقت ضائع کرنے کے لیے......“

میں نے آخری پتا پھینکا ”سر جی میں گناہ گار ہوں، مجھے اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔“

حوالدار جاتے جاتے رک گیا اور پلٹ کر بولا ”اوئے گناہ گار کے بچے! میرے گلے پڑنے پر جو وقت اور پیسا خرچ ہو گا وہ تیرا باپ دے گا۔ دفع ہو جاؤ۔“ یہ کہہ کر حوالدار چلتا بنا اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

میں پھر مایوسی کی حالت میں پیدل ہی شہر کی طرف چل پڑا۔ اب میری منزل میکلوڈ روڈ کا رتن سینما تھی۔ وہاں ایک انگلش فلم لگی ہوئی تھی جو خواتین میں بہت مقبول جا رہی تھی۔ میکلوڈ روڈ پہنچا، تو شراب نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ قدم ڈولنے لگے۔ میں لڑکھڑاتا رتن سینما کی طرف بڑھتا آئندہ منصوبے پر غور کرتا رہا۔ رتن سینما آ گیا۔ حسب توقع عورتوں کا رش لگا تھا۔ کھڑکیوں کے سامنے قطاریں لگی تھیں۔ خواتین بے تابی سے ٹکٹیں خرید رہی تھیں۔ میں اس قطار کی طرف چل پڑا جو لیڈیز اسٹال والی کھڑکی کے سامنے تھی۔ وہاں پہنچ کر نہایت بے ہودہ طریقے سے انگڑائی لی، مونچھوں کو مروڑا اور آگے بڑھ ایک عورت کے پاس جا کر کہا ”قطار میں کیوں لگی ہو؟ آؤ میرے ساتھ، میں تمھیں فلم دکھاتا ہوں۔“

یہ الفاظ ادا کرتے ہی میں نے احتیاطاً اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تاکہ تھپڑ کا درد کم رہے۔ مگر کیا دیکھتا ہوں کہ وہ عورت قطار سے نکل کر باہر آ گئی اور بولی ”فلم دیکھنی کیا ضروری ہے۔ جدھر چلنا ہو چلو۔“

”لاحول ولاقوۃ“ میں یہ پڑھ کر سینما سے بھاگ کھڑا ہوا۔

میری اگلی منزل لاہور کا ریلوے اسٹیشن تھا۔ وہاں پہنچ کر سوچا، واردات کے لیے کراچی کی گاڑی مناسب رہے گی کیونکہ وہاں آس پاس پولیس والے ہوتے ہیں۔ نئے منصوبے کے مطابق میں قطار میں لگ گیا۔ اعلیٰ درجے کے مسافروں کا انتخاب کیا تاکہ پکڑے جانے کی صورت میں رہائی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ اس بار میں نے شرابی والی اداکاری ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔

کچھ دیر قطار میں لگے رہنے کے بعد ایک شریف آدمی کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے مجھے وہیں دبوچ لیا۔ قطار سے باہر نکالا اور آدمی بھی مجھے پکڑنے کے عمل میں شامل ہو گئے۔ مسافروں کو ریل پکڑنے کی جلدی تھی، لہٰذا وہ اس کارِ خیر میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ دونوں مجھے گردن سے پکڑ کر باہر لائے اور پھر برآمدے کی طرف لے گئے۔ میں خوش تھا کہ کام بن گیا۔ پولیس بھی کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ پکڑنے والوں نے میری جامہ تلاشی لی۔ جب کچھ برآمد

> میں کچھ دیر چوک میں کھڑا ادھر ادھر گھورتا رہا مگر رونق کے باوجود کسی نے میری موجودگی کا نوٹس نہ لیا۔ لوگ مجھے گداگر سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔

http://www.booksube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

نہ ہوا، تو ان میں سے ایک نے کہا ''اوئے کنگلے تیرا استاد کون ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

میرے جواب پر دوسرے نے برجستہ کہا ''اوئے بے استادے کسی کی جیب میں سلائیاں ڈالنے سے پہلے کام تو سیکھ لیا ہوتا۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، پہلا بولا ''استاد ایک بات ہے، لڑکے کے ہاتھ میں صفائی بہت ہے۔ کام سیکھ جائے تو مشین اچھی بنے گی۔''

اب استاد کی باری تھی۔ اس نے میری تھوڑی انگلیاں [illegible] سے تھام لیں۔ پھر انھیں ہلاتے ہوئے بولا ''یار کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ لڑکے کی انگلیاں بتا رہی ہیں کام سیکھ لے تو [illegible] مار سکے گا۔''

وہ میری انگلیوں [illegible] میں مصروف تھے [illegible]

[illegible]

میرے علاقے میں نظر آیا، تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

اس بار میری گردن پر زوردار دوہتڑ رسید کیا گیا۔

میں ناکام و نامراد ریلوے اسٹیشن کی حدود سے باہر چلا آیا۔ کہتے ہیں ''ہمت مرداں مدد خدا!'' باہر آتے یہ محاورہ جانے کیوں میرے دماغ میں آ گیا۔ خیال آیا کہ بدمعاشوں کو تو آزما لیا کیوں نہ کسی مرد خدا کو آزمایا جائے۔ ہو سکتا ہے، کسی نیک بندے کے ہاتھوں میری مشکل آسان ہو جائے۔ چناں چہ میری منزل مال روڈ پر واقع مسجد شہدا ٹھہری۔ پروگرام یہ بنا کہ مسجد سے کسی نمازی کی جوتی اٹھا کر بھاگ جاؤں۔ کوئی نہ کوئی میرا پیچھا کر کے حوالہ پولیس کر دے گا۔

میں مسجد پہنچا، تو نماز کا وقت نہیں تھا۔ ایک مولوی صاحب [illegible] میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ جب بھی ہوش میں آتے تو تسبیح کا ایک آدھ منکا گرا دیتے۔ میں نے پہلے مولوی صاحب کا جائزہ لیا۔ [illegible] آدمی تھے۔ [illegible]

[illegible]

www.pdfbooksfree.pk

جواب دیا ''وعلیکم السلام!''۔ جواب مجھ سے بھی زیادہ گاڑھی عربی میں تھا۔

اب مزید تاخیر بے سود تھی۔ میں تیز تیز ڈگ بھرتا آگے بڑھا اور مولوی صاحب کی جوتی اٹھا کر بھاگ اٹھا۔ میری توقع کے برعکس مولوی صاحب نے نہ اپنا عصا اٹھایا اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلے جلے۔ پہلے مجھے بھاگتے دیکھتے رہے پھر ملامت کے انداز میں بولے: ''اے لعین..... ایک غریب مولوی کی پرانی جوتی سے تیرا کیا بنے گا..... اچھی جوتی درکار تھی تو جمعہ پڑھ لیا ہوتا.....''

بھاگتے بھاگتے میں نے ایک نظر مولوی صاحب کی جوتی پر ڈالی تو مجھے بات درست معلوم ہوئی۔ جوتی کی چمک دمک تو بہت تھی لیکن تلے پھٹے ہوئے تھے۔ مولوی صاحب کی جوتی مسجد کے نزدیک پھینک میں مال روڈ پر نکل آیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مولوی صاحب کو جوتی حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ موٹی توند کسی کی بھی ہو، آتے مال کو تھام لیتی ہے، جاتے مال کو روک نہیں سکتی۔

مسجد شہدا سے مال روڈ پہنچا، تو ریگل چوک میں عجیب منظر پایا۔ پولیس کے ہنگامی دستوں نے گیل کانٹے سے لیس ہوکر مال روڈ روک رکھی تھی۔ جب کہ ایک بڑا جلوس اسمبلی ہال کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حکومت کے خلاف پُرجوش نعرے لگ رہے تھے۔ شرکا کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر پولیس نے مال روڈ خالی نہ کیا تو بہت جلد سپاہیوں اور عوام میں تصادم ہوگا۔ جس فٹ پاتھ پر میں کھڑا تھا، وہاں سے کچھ فاصلے پر ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ اپنی جیپوں میں وائرلیس سیٹ لیے بیٹھے تھے۔ کچھ پیچھے آنسو گیس برسانے والا پولیس کا دستہ احکامات کا انتظار کر رہا تھا۔

یکا یک مجھے محسوس ہوا جیسے یہ سارا بندوبست میرا مسئلہ حل کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ خود غرضی کے منصوبے سوچتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ میں یکا یک فٹ پاتھ سے ہٹا اور پولیس والوں کے عقب سے ہوتا مال روڈ کے اس حصے پر پہنچ گیا جہاں جلوس کے شرکا ہاتھوں میں جھنڈے اور بینر اٹھائے حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح آگے بڑھا اور پھر قیادت کرنے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا۔

> میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گریبان تار تار کیا، پھٹی قمیص فضا میں اچھالی اور پھر پوری قوت سے نعرہ لگایا ''گولی لاٹھی کی سرکار نہیں چلے گی۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گریبان تار تار کیا، پھٹی قمیص فضا میں اچھالی اور پھر پوری قوت سے نعرہ لگایا ''گولی لاٹھی کی سرکار نہیں چلے گی۔ اب ہماری تمھاری ہے کھلی جنگ۔'' شاید میرا نعرہ جلوس کے قائد کو اچھا لگا۔ اس نے اپنے کارکنوں کو اشارہ کیا کہ مجھے ٹرک پر سوار کرایا جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں جلوس کا قائد بن گیا۔ اصل قائد نے نجانے کیوں اپنے گلے میں پڑے پھولوں کے تمام ہار اتار میرے گلے میں ڈالے اور مائیک بھی ہاتھ میں تھما دیا۔

''شاباش جوان، جلوس کو ہر قیمت پر اسمبلی ہال تک پہنچانا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ نجانے کہاں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد تھانہ سول

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

لانسز کی پارک میں بیٹھا وہ زخم سہلا رہا تھا جو انھی چارج میں اپنے ناتواں جسم پر وصول کیے تھے۔ البتہ یہ سوچ کر اسے لطف آیا کہ ہمارا ملک بھی کیسا ہے وہاں لیڈر بننے کے لیے صرف اپنا گریبان چاک کر دینا کافی ہے!

تھانہ سول لائنز کی بارک میں جگہ کم اور آدمی زیادہ تھے، اس لیے حبس کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ میں شدید تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن ایک احساس یہ تلخی کم کیے ہوئے تھا کہ میرا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا اور میں ایک بہت بڑے عذاب سے بچ گیا۔ مجھے پولیس کے تفتیشی افسر کا انتظار تھا تاکہ اسے اپنا نام پتا لکھا کر محفوظ ہو جاؤں

لیکن یہ کیا!؟ جلد ہی مجھے اپنے سوالوں کا جواب مل گیا۔ پولیس نے سرکاری لاریوں میں ہم لوگوں کو اس طرح بھرنا شروع کر دیا جیسے بوریاں میں آلو بھر رہے ہوں۔

پھر لاریاں نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں سوچنے لگا کہ شاید یہ لوگ ہمیں ملک کی دور دراز جیلوں میں پہنچائیں گے کہ لاہور کی جیلیں تو تحریک کے قیدیوں میں پہلے ہی بھر چکیں۔ خیر جو کچھ بھی ہو اپنا تو کام بن گیا۔ بوری کے سب آلو پریشان تھے مگر ایک خوش تھا۔ لیکن اس خودغرض آلو کی خوشیاں دیرپا ثابت نہ ہوئیں۔

لاریاں راوی کا پل پار کر اس سڑک کی طرف رواں تھیں جو لاہور کو جڑانوالہ سے ملاتی ہے۔ فیض پور اسٹاپ آتے ہی تمام لاریاں رک گئیں۔ پیچھے سے ایک پولیس کی جیپ آگے آئی جس سے ایک ڈی ایس پی برآمد ہوا۔ وہ ہم سب سے مخاطب ہو کر بولا "صاحبان! آپ لوگ ایک آزاد جمہوری ملک کے باشندے ہیں۔ حکومت اور پولیس آپ کی آزادی کا احترام کرتی ہے۔ امید ہے آپ آئندہ جلسے جلسوں کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔ اب سب لاریوں سے باہر آئیں اور اپنے اپنے گھر کی راہ لیں......!"

ڈی ایس پی کی مختصر تقریر ختم ہوئی اور بوریوں کے منہ کھل گئے۔ کچھ دیر بعد تمام آلو بوریوں سے باہر تھے۔ اور پھر ان میں سے ایک آلو پتی سڑک پر رواں دواں ہو گیا جو فیض پور گاؤں کی طرف جاتی ہے۔ فیض پور پر شام اتر رہی تھی اور اس کا آسمان لہو رنگ شفق میں ڈوبا ہوا تھا!

مشہور شخصیات کے اقوال

☆ میرے نزدیک ادب کی تعریف یہ ہے کہ وہ حسن کلام اور تاثیر کلام ہے۔ یہی دو باتیں ادب کو عام کلام سے ممیز کرتی ہیں۔ جب آدمی اپنی بات کو خوبی کے ساتھ موثر طریق سے ادا کرتا ہے، تو اس قسم کے کلام کو ادب کہتے ہیں۔ (مولانا مودودی)

☆ عظیم ادیب وہ ہوتا ہے جو اپنی کیفیت پڑھنے والے پر ظاہر کر دے۔ (ٹالسٹائی)

☆ ادب کا مقصد محض انسانی تجربات کی کامیاب ترجمانی ہے، یہ تجربات خارجی ماحول کے زیراثر لکھنے والے کے ذہن پر منعکس ہوتے ہیں، لکھنے والے کو چاہیے انھیں من وعن بیان کر دے۔ (فیض احمد فیض)

☆ انسان جو کچھ اپنی ذات اور اپنے معاشرے کے لیے سوچتا ہے، اس کے اظہار کا نام ادب ہے۔ (ملٹن)

☆ موضوع کے سامنے فن کو قطعی نظر انداز کر دینا ادب پارے کو سیاسی اشتہار بنا دیتا ہے، اس مہلک وبا سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے۔ (ماوزے تنگ)

(انتخاب: ارباب خالد، لاہور)

www.pdfbooksfree.pk

بلند و بالا پہاڑی علاقوں میں بسنے والے

واخان کے وخی

ایک قدیم آریائی قوم کی زبان و ادب
بہ حسن و خوبی آشکار کرنے والا قلمی تحفہ

ڈاکٹر عظیم شفیق ملک

افغان پہاڑی علاقے واخان کے باشندوں کی زبان "وخی" ہے جو آج کل افغانستان، تاجکستان اور پاکستان میں منقسم ہیں۔ ان کی آبادی تقریباً ایک لاکھ ہے۔ انھیں بھی وخی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ خود اپنی شناخت بطور خیک اور اپنی زبان خک زک کے طور پر

کرواتے ہیں۔ وخی کے متبادل ناموں میں واخانی، وخیگی اور گوجالی بھی شامل ہیں۔ تاجکستان کے لوگ وخی باشندوں کو واخوان اور ان کی زبان کو ہک زک کہتے ہیں۔

وخی زبان کا تعلق پامیری زبانوں کے جنوبی گروہ سے ہے جنھیں غالچہ کہا جاتا ہے۔ پامیری زبانیں افغانستان اور تاجکستان کے پہاڑی علاقوں پامیر میں بولی جاتی ہیں۔ پامیر اپنے لسانی تنوع، ماضی میں زیرِ استعمال رہنے والے لہجوں اور الفاظ کی وجہ سے دوسرے پہاڑی علاقوں مثلاً کوہ قاف اور شمالی امریکا کے مغربی پہاڑی سلسلے سے مماثلت رکھتا ہے۔

وخی کے علاوہ دیگر پامیری زبانوں میں اشکاشمی، سنگلیچی، شغنی، روشانی، یزغولامی، خوفی، برتنگی، ساریقولی، اشاشمی اور مُونگی شامل ہیں۔ ان تمام زبانوں کا نہ تو کوئی رسم الخط ہے اور نہ انھیں لکھنے کی کوئی روایت موجود ہے۔ یہ زبانیں صرف

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

بولنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ وخی زبان قدیم محاوروں کے حوالے سے مالامال ہے اور اپنی ہمسایہ پامیری زبانوں سے قدرے مختلف جن میں بہت یکسانیت پائی جاتی ہے۔

نسلی طور پر وخی ایک قدیم نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ وخی برادری کے آباؤ اجداد سیتھائی سامری آریا تھے جو چند ہزار سال قبل یوریشیائی میدانی علاقوں میں پھیل گئے۔ لیکن انھوں نے دوسرے آریائی گروہوں کی طرح ایشیائی میدانوں کی سمت ہجرت نہیں کی اور وہیں قیام پذیر رہے۔

افغانستان میں وہ صوبہ بدخشاں کے ضلع واخان میں رہتے ہیں جہاں کی تین چوتھائی آبادی وخی بولتی ہے۔ افغانی وخیوں میں شرح خواندگی بہت کم ہے۔ یہاں لازمی ابتدائی تعلیم کا وخی انتظام نہیں اور مادری زبان میں شرح خواندگی ایک فیصد سے بھی کم ہے۔

پاکستان میں وخیوں کی بڑی آبادیاں چترال کے شمال مشرقی علاقے یارغل' بالائی یرخون اور چترال کی وادی اشکومن اور گوجال' شمشال اور ہنزہ کی وادی چوپرسن میں واقع ہیں۔ پاکستان کی وخی برادری میں شرح خواندگی ساٹھ فیصد ہے۔ مرد اور اسکول جانے والے بچے روانی سے اردو بھی بولتے ہیں۔ نصف سے کم خواتین اردو بول لیتی اور سمجھ سکتی ہیں۔ مجموعی طور پر وخی بولنے والوں کا دوسری زبانیں سیکھنے کی طرف رویہ بہت مثبت ہے۔ ساتھ ہی ان میں اپنی زبان کو برقرار رکھنے کا رویہ بھی بہت شدید ہے۔

مغربی ماہر لسانیات، جیرارڈ فش مین کا کہنا ہے کہ شمالی پاکستان میں بولی جانے والی وخی زبان کو معدوم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ دراصل وخیوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں کسی بیرونی زبان کے بولنے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ الگ تھلگ آبادیوں کے باعث وخی تاریخی' معاشی تبدیلیوں سے بھی بہت کم متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان میں ابھی تک ایسے بہت سے قدیمی الفاظ برقرار ہیں جو تاجکستان میں وخی بولنے والوں کے ہاں ختم ہو چکے۔ اس کی وجہ تاجک زبان کا غلبہ ہے۔

رباعیات

وخی شاعری کی ایک اہم صنف رباعی ہے جس کا ہر دوسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ رباعیات میں عموماً اہل خانہ کے ساتھ تعلق کا ذکر ہوتا ہے۔ اس موضوع کا وخی لوگوں کی زندگی میں بڑا اہم کردار ہے۔ وخی معاشرے کے اندر گھر اور خاندان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہاں رباعیات کی تین مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

جب گھر کے اندر بھائی چارہ ہو
یہ نشانی ہے دولت کی' دولت کی
جب گھر میں جھگڑا اور بدامنی ہو
تو ہر طرف دکھ ہی دکھ دکھائی دیتے ہیں

☆☆

جب خوبانیاں پکنے کو تیار ہوں
تو اس (عورت) کو وقت دو وقت دو
جب تمہارے بچے تمھیں چھوڑ رہے ہوں
انھیں جانے دو انھیں جانے دو

☆☆

زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہیے
جب تم اس دنیا میں ہو اس دنیا میں ہو
موت کے بعد تم چاہے جتنی کوشش کر لو
لیکن ہر چیز فنا ہے ہر چیز فنا ہے

زبانی ادب

تاجک زبان کی طرح وخی میں بھی ضرب الامثال

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

قارئین کے لیے نئے سال کا تحفہ

اپنے بچوں، دوستوں اور رشتہ داروں
و ادب سے روشناس کرائیے۔ آپ
رشتہ شمارے اپنے دوستوں کو تحفتاً
بھی بھجوا سکتے ہیں۔ یہ سہولت اندرون و
بیرون ملک دونوں کے لیے میسر ہے۔

کامیاب افراد کے حالات زندگی، ملک کی نامور شخصیات کے دلچسپ و خصوصی انٹرویوز، سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی کہانیاں، حالات حاضرہ اور سیاست کے بدلتے رنگ، معاشرتی مسائل اور ان کا حل، شکاریات، اسلامی واقعات، سائنس، طب و صحت، ٹیکنالوجی، کھیل، سیرت نبوی، اردو ادب، افسانے، ڈرامے، تازہ ترین معلومات اور بہت کچھ..........

ایک شمارہ
روپے میں

شمارے حاصل کرنے کے لیے اپنا ایڈریس اور موبائل نمبر میسج کریں

subscription@urdu-digest.com

www.pdfbooksfree.pk

کاروان علم فاؤنڈیشن
رجسٹرڈ قائم شدہ 2004ء

ملک و قوم کی خدمت کے دس سال

الحمد للہ

4,359

کم وسیلہ مگر باصلاحیت طلبا و طالبات کو

ساڑھے آٹھ کروڑ روپے

سے زائد کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں۔

اب یہ طلبا و طالبات برسر روزگار ہو کر اپنے خاندانوں کو غربت اور جہالت سے نکال رہے ہیں۔

682

مزید کم وسیلہ باصلاحیت طلبا و طالبات کی درخواستیں سال 15-2014 کے لیے مندرجہ ذیل شعبوں میں زیر غور ہیں

ایم بی بی ایس	181	ایم اے	31	بی ایس آنرز	120	بی اے	10	ایف اے	14
ڈی وی ایم	09	ایم بی اے/ایم پی اے	06	بی اے آنرز	07	ایم فل	03	آئی کام/آئی سی ایس	03
ڈی فارمیسی	14	ایم آئی ٹی	01	بی بی اے	06	ایل ایل بی	02	ایف ایس سی	12
فزیو تھراپی	05	ایم کام	07	بی ایڈ	03	اے سی سی اے	04	بی ٹیک	03
بی ڈی ایس	09	بی ایس انجینئرنگ	167	بی ایس ایڈ	03	سی ایم اے	02	میٹرک	04
ایم ایس سی	14	بی کام	05	ایم ایڈ	01	ایف ایس سی	25	انڈر میٹرک	11

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

آپ کے تعاون نے بدلی ہے ان کی زندگیاں

Mehran Bank — مہران بینک [illegible] پاکستان — اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859

BOP — بینک آف پنجاب [illegible] پاکستان — اکاؤنٹ نمبر 0110 002 000424 0003

بینک آف پنجاب شاہراہ فیصل [illegible] پاکستان — اکاؤنٹ نمبر 0247 002 000827 0003

لاہور 19/21 [illegible] فون 042-37522741-42 فیکس 042-37552576
آفس موبائل 0345-8461122, 0333-8461122, 0321-8461122 ای میل info@kif.com.pk

کراچی آفس 3/1 [illegible] بلاک 6 [illegible] فون 021-34382303 فیکس 021-34832420 موبائل 0300-9280487
اسلام آباد آفس [illegible] G-11 مرکز، اسلام آباد فون 051-2220933 موبائل 0321-5587250, 0300-8187044

USA Address: 'Karwan-e-ilm Foundation' 19-West 34th Street 1024, New York, NY 1001
Ph: (212) 268-3500/3501, Fax: (212) 268-3502

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کہاوتیں اور پہیلیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کہاوتوں سے وخی زبان کے زبانی ادب کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ضرب الامثال

☆ خدا کرے مجھے کوئی لالچی ساجھی نہ ملے۔

☆ گھوڑے سے گرنے والے کی ایک پسلی ٹوٹتی ہے مگر گدھے سے گرنے والے کی سات پسلیاں ٹوٹتی ہیں۔

☆ جانوروں کے بغیر رہا جا سکتا ہے والدین کے بغیر نہیں۔

☆ اس نے شخص کو کپڑا لانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ صرف اس لیے کہہ رہا ہے کہ اسے کہنے کو کچھ چاہیے ورنہ حقیقتاً اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

(یہ کہاوت اُس وقت استعمال کی جاتی ہے جب کسی کنجوس کا ذکر کرنا مقصود ہو)

☆ بچہ گھر سے بھاگنا تو جانتا ہے مگر واپس آنا نہیں۔

☆ بچہ پانا آسان بچہ پالنا مشکل۔

☆ شادی ہو جائے تو ماں باپ کو نہ بھول جاؤ۔

☆ بوڑھا کہہ رہا ہے میں مر رہا ہوں۔ جوان کہہ رہا ہے میں جا رہا ہوں۔

(یہ کہاوت پرانی نسل کے لوگوں کے اپنے وطن سے تعلق کے بارے میں استعمال ہوتی ہے)

☆ سوکھی مٹی دیوار کے ساتھ نہیں چپک سکتی۔

محاورے

ذیل میں چند محاورے دیے جا رہے ہیں۔ انھیں استادِ محترم جناب نذیر ایم گردیزی نے جمع کیا۔

☆ تم پتھروں اور لکڑی کو پگھلانے والے چاند ہو۔

(یعنی تم جیسا کوئی خوبصورت اور وجیہہ نہیں)

صاحب مضمون

ڈاکٹر ندیم شفیق ملک تاریخ، بین الاقوامی تعلقات، زبان وادب اور اقبالیات کے موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان موضوعات پر کتب اور مقالے تصنیف کر چکے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون آپ کی کتاب "صدائے بام دنیا" سے بصد شکریہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب وخی قوم، زبان، ادب و معاشرت پہ بھرپور معلومات فراہم کرتی ہے۔ یہ آپ کی ایم فل ڈگری کا مقالہ ہے جو اب طبع ہو چکا۔ اسے ادارہ فروغ قومی زبان، ایوانِ اردو، ایچ ۸/۱۰ پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد نے خوبصورت انداز میں شائع کیا ہے۔

☆ وہ صبح سے شام تک روتا رہتا ہے۔ (جس کی شکل رونے والوں جیسی ہو)

☆ وہ صحرا میں گھومتا پھرتا ہے۔ (جو شخص خیالی دنیا میں رہتا ہو)

☆ کسی کو کسی شے میں گم ہو سمجھنا۔

☆ میں اس کی شکایت نہیں کر رہا۔ (یعنی قنوطیت پسند)

☆ ہمیشہ کوئی تحفہ لانا۔ (یعنی کوئی اچھی خبر وغیرہ)

☆ ہر سفید پرندہ ہما نہیں ہوتا۔ (کوئی وقت ہمیشہ خوشگوار نہیں رہتا)

وخی شادی

اس قوم کے لوگ شادیاں موسم خزاں میں کرتے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ کئی شادیاں عموماً اکٹھے کی جاتی ہیں۔ وہ شادی کے دن سے تین دن پہلے چولھے پر توا چڑھا دیتے ہیں۔ دن کے وقت روٹیاں پکتی ہیں۔ شام کو وہ جانور ذبح کرتے' رات کے وقت اُسے پکاتے اور چھوٹی ٹوکریوں میں رکھ چھوڑ دیتے ہیں۔ شادی کے دن شربت بناتے اور اس میں بہت سا مکھن ڈالتے ہیں۔ یہ واقعی بہت اچھا شربت بنتا ہے۔

پھر وہ دولھا کو باہر لاتے ہیں' اسے پگڑی پہنائی جاتی ہے اور چہرے پر نشان بنائے جاتے ہیں۔ چہرے کے ایک طرف سرخ اور دوسری طرف سفید نشان بنایا جاتا ہے۔ پھر وہ افراد آپس میں جھگڑا کرتے اور اس کا سرپرست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان میں سے جو بڑا ہوتا وہ دولھا کا دایاں ہاتھ تھام لیتا ہے۔ چھوٹا بایاں ہاتھ تھامتا ہے۔

پھر وہ دولھا کو گھر سے باہر لاتے ہیں۔ لوگوں کے ہاتھوں میں دف ہوتے ہیں۔ وہ شام مبارکباد کے نعرے لگاتے ہیں۔ اس تقریب کو بھی 'شام مبارکباد' کہا جاتا ہے۔ مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ پر ڈوم گانا بجاتے ہیں۔ پھر دولھا وہاں آجاتا ہے۔ اس کے دونوں سرپرست ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہاں موجود تمام خواتین دائرہ بنا کر اس کے گرد چکر لگاتی ہیں۔ پھر دولھا اسٹیج پر جا کر اپنی نشست پر براجمان ہو جاتا ہے۔ پھر ڈوم موسیقی بجاتے اور لوگ اس پر ناچتے ہیں۔ اس طرح وہ شام تک خود کو محظوظ کرتے ہیں۔

اگلے دن تیراندازی کے لیے ایک بڑی جگہ منتخب ہوتی ہے۔ وہاں مٹی کا ایک ڈھیر بنا اس پر تیراندازی کے لیے نشان لگا دیتے ہیں۔ پھر گھوڑوں کے مالکان اپنے گھوڑے لے کر آتے ہیں۔ وہ تیر اور نیزے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوتے ہیں۔ جو تیرانداز صحیح نشانہ لگائے اسے انعام میں رقم' کپڑا یا کوئی دوسری چیز دی جاتی ہے۔ اس کھیل کے بعد دولھا اور اس کے تمام رشتے دار بارات کی صورت سسرال (لڑکی والوں کے) گھر جاتے ہیں۔

اب شادی کی تقریب (نکاح) کا وقت آپہنچا۔ دولھا سامان والے کمرے میں جاتا ہے۔ وہاں خلیفہ شادی کی مذہبی رسوم ادا کرتا ہے۔ ایک آدمی کھانے کا خوان خلیفہ کو پیش کرتا ہے۔ خوان میں جانور کے سینے کا گوشت' شربت کا ایک پیالہ اور روٹی کا ایک ٹکڑا رکھا ہوتا ہے۔ خلیفہ ایک پیالی میں پانی بھرتا اور اس پر دعا کرتا ہے۔ پہلے وہ یہ پانی دولھا کو پینے کے لیے دیتا ہے اور پھر دولھن کو۔ پھر گوشت کا ایک ٹکڑا دولھا کے منہ میں رکھتا ہے۔

دولھا کے دائیں طرف والا سرپرست گواہ اپنے ہاتھ سے اسے کوئی پلاتا ہے جبکہ بائیں طرف والا سرپرست گواہ دولھن کو اپنے ہاتھ سے گوشت کا ٹکڑا دیتا ہے۔ جب شادی کی یہ رسم ختم ہو تو دولھا کا والد بارات کی دعوت کرتا ہے۔ ہر تین افراد کے لیے کھانے کی ایک تھالی رکھی جاتی ہے۔ ہر ایک کو کھانے میں برابر حصہ ملتا ہے۔ یہاں شراب نہیں ہوتی۔ جب تمام افراد کھانا کھا چکتے ہیں' تو خلیفہ فاتحہ پڑھتا ہے۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

کافی ہیلن کی زندگی کا محور بن گئی تھی۔ جی ہاں! وہی کافی جس کی ہر موسم میں طلب رہتی ہے۔ ہیلن کے "سارا کافی ہاؤس" کی کافی پینے کے لیے بھی گرمی سردی کی کوئی شرط نہیں تھی۔ ٹھنڈی کافی ہو یا گرم گرم بھاپ اڑاتی ہوئی، وہ بے حد عمدہ ہوتی۔ کچھ مہنگی بھی تھی مگر ایک اچھی چیز مہنگا ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، بس اس چیز کو عمدہ ہونا چاہیے۔ لوگ پھر دام کی پروا نہیں کرتے۔ ایسی ہی خوبی اور خصوصیت اس کافی میں بدرجہ اتم موجود تھی۔

اس کافی نے نہ صرف قصبہ بیرنگٹن بلکہ آس پاس کے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

تمام قصبوں میں اپنی خوشبو، خوش رنگ اور عمدہ ذائقے کی وجہ سے دھوم مچائی ہوئی تھی۔ ان قصبوں کے کتنے ہی مردوں، عورتوں اور ریستورانوں نے اپنے ناک چنے چبوا لیے مگر وہ "سارا کافی ہاؤس" کی جیسی شاندار کافی نہیں بنا سکے۔

ہیلن بہترین کافی بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی کافی ایسی لاجواب ہوتی کہ پینے والا اش اش کر اٹھتا۔ قصبے کے لوگوں کو منشیات کی طرح اس کافی کی لت پڑ گئی۔ شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو ہر روز "سارہ کافی ہاؤس" آ کر ایک پیالی اور کافی نہ پیے۔ بہت سے تو ایسے تھے جو ایک ہی نشست میں تواتر کے ساتھ دو تین پیالیاں کافی پی جاتے۔ اس بہترین کافی کی وجہ سے قصبے میں شراب اور دوسرے عام مشروبات کی فروخت پر بہت برا اثر پڑا تھا۔

ابتدا میں عام خیال یہ تھا کہ ہیلن کسی ملک سے خاص قسم کی کافی منگواتی ہے، تبھی اس کی کافی لاجواب ہوتی۔ مگر جب تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ وہ قصبے ہی کے کسی بھی جنرل اسٹور سے ایک ہی برانڈ کی کافی کے درجنوں ڈبے خریدتی ہے۔ وہ کون سی کافی استعمال کرتی ہے، یہ سب کو علم تھا۔ وہ گاہکوں کے سامنے ہی کافی بنا کر انھیں پیش کرتی۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ وہ کافی میں کوئی ایسی چیز شامل ضرور کرتی ہے جس سے اس کا کیف اور ذائقہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس میں کسی حد تک صداقت تھی۔ اس کا "کافی ہاؤس" بہت چلتا تھا مگر اس نے اپنے ہاں کسی کو معاون کی حیثیت سے ملازم نہیں رکھا۔ بلکہ وہ تنہا ہی اپنا چھوٹا سا کافی ہاؤس چلا رہی تھی۔ بوڑھوں کا کہنا تھا کہ اچھی کافی بنانے کا کوئی قدیم نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ تبھی تو وہ ایسی شاندار کافی بناتی ہے کہ قصبے میں کوئی بھی اس کا عشر عشیر تک بنا نہیں سکا۔

ہیلن کی زندگی میں اس کافی نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنی ماں کی شدید بیماری کی اطلاع پا کر چار سال بعد قصبے لوٹی تو اسی روز وہ چل بسی۔ اس کی ماں دس برس سے کافی ہاؤس چلا رہی تھی۔ لیکن کمائی کو اس نے شراب نوشی اور ریس کی نذر کر دیا۔ آخری دنوں میں وہ کسمپرسی کی حالت میں دنیا سے چلی گئی۔ ہیلن نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے قصبے میں رہ کر ماں کا کاروبار جاری رکھے گی۔ اسے اپنے قصبے میں بڑی کشش نظر آئی تھی۔ یہاں سکون تھا، نیویارک جیسی مشینی زندگی نہیں تھی۔

مگر ہیلن کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ وہ نیویارک کے کسی چھوٹے کافی ہاؤس کی طرح آرائش و زیبائش سے اپنے کافی ہاؤس کو آراستہ و پیراستہ کرتی۔ نیویارک میں رہ کر وہ جو کچھ کماتی، اس سے پس انداز کر کے اپنی ماں کو رقم ہر ماہ بھیجتی رہتی۔ اس نے دو ایک دن خود ہی کافی ہاؤس کی صفائی کی۔ پھر ایک سہیلی سے پانچ سو ڈالر قرض لے کر کافی ہاؤس کھول لیا۔ کافی ہاؤس میں چلانے کے لیے اس نے نیویارک کا کاروباری حربہ استعمال کیا۔

ہیلن سرو قد اور حسین دوشیزہ تھی۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار میں تیکھا پن تھا جو بے اختیار دل میں اتر جاتا۔ بال بھورے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ وہ جس قدر عمدہ تراش کا نفیس لباس پہنتی تھی، اس سے نوجوانوں اور مردوں کے دل پر بجلی بن کر گرتی۔ پہلے تو لوگ کافی پینے کی غرض سے نہیں بلکہ اس بت طناز کا جلوہ دیکھنے آئے۔ خاص کر نوجوان لڑکوں کا اژدہام رہنے لگا۔ اس نے ایک ہفتے میں بڑا شہرہ حاصل کر لیا۔ بہت سے نوجوانوں نے اس کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کی لیکن کسی کو کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ قصبے کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ہیلن صرف حسین ہی نہیں بلکہ کافی بھی بہت عمدہ بناتی ہے تو پھر کیا تھا، اس کا کافی ہاؤس چل پڑا۔ وہ جلد خوش حال اور آسودہ زندگی گزارنے لگی۔

http://www.booksstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ایک شام کریب نامی نوجوان کسی قریبی قصبے سے کافی کی شہرت سن کر آیا، تو وہ ہیلن کو دل دے بیٹھا۔ وہ نوجوان شائستہ، سنجیدہ اور اس قدر نفیس مزاج کا تھا کہ ہیلن بھی دل دے بیٹھی۔ وہ عموماً دوپہر کے وقت آتا جب اکا دکا گاہک ہوتے۔ ہیلن کو ایک ایسے ہی ہم سفر کی ضرورت تھی۔ کافی نے تو اس کے دل کی دنیا بھی آباد کر دی۔ دونوں نے آئندہ سال شادی کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ کریب اور ہیلن کے خواب یہ تھے کہ ان کے پاس اتنی رقم پس انداز ہو جائے کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کر سکیں۔ ہنی مون سوئٹزرلینڈ میں جا کر اس طرح منائیں کہ وہ ناقابل فراموش بن جائے۔ وہ ایک مہینے یورپ کی اس طرح سیاحت کریں کہ انھیں دنیا کی کوئی فکر لاحق نہ ہو۔ غرض زندگی کی تمام لذتوں سے محظوظ ہو کر واپس آئیں۔ پھر اپنا وقت گھر، کاروبار اور بچوں کو دیں۔ ساری زندگی چین وسکون اور پیار و محبت میں گزار دیں۔

کریب ایک اخبار میں کام کرتا تھا۔ اس کی آمدنی معقول تھی۔ وہ بڑی رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ ادھر ہیلن نے کافی ہاؤس سے اتنا کما لیا تھا کہ اپنے قصبے میں نیا مکان لے لیا۔ ہنی مون اور سیر و سیاحت کے لیے بھی معقول رقم پس انداز کر لی۔ دونوں نے موسم بہار میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ جمعرات کا دن تھا۔ اس روز سات بج کر پچاس منٹ پر ہی نہ صرف پورا قصبہ بلکہ ہیلن کا کافی ہاؤس بھی ویران اور سنسان ہو گیا۔ حتیٰ کہ جنرل اسٹور اور بار بھی بند ہو گئے۔ دراصل ہالی وڈ کا مشہور اداکار راک ہڈسن ایڈز کی بیماری کے باعث مر گیا تھا۔ اب رات آٹھ بج کر بیس منٹ پر اس کے فن اور زندگی پر ٹی وی میں ایک پروگرام پیش ہونا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کا پروگرام تھا۔ اس نے جذباتی رنگ اختیار کر لیا۔ اسی لیے سب پہلے ہی گھروں میں نظر بند ہو گئے۔ ہیلن نے بھی آٹھ بج کر دس منٹ پر اپنا کافی ہاؤس بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

سات بج کر پچاس منٹ پر وہ اپنا پھیلا ہوا سامان سمیٹ رہی تھی کہ کافی ہاؤس کا دروازہ دھماکے کے ساتھ کھلا۔ دوسرے ہی لمحے چار آدمی اندر تھے۔ ان کے کرخت چہروں پر وحشی درندوں جیسی بے رحمی تھی۔ آنکھوں سے درندگی جھانک رہی تھی۔ ہیلن کو ان کے پستولوں نہیں بلکہ آنکھوں اور چہروں سے خوف محسوس ہوا۔ مقصد ایک بچہ بھی آسانی سے جان سکتا تھا۔ ہیلن بھی سمجھ گئی۔ اس وقت اتفاق سے ایک گاہک بھی موجود نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو اس کی موجودگی سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ بلکہ اس کی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا۔ تاہم ہیلن نے پھر بھی اپنے اعصاب پوری طرح قابو میں رکھے۔

وہ بدمعاش تو بیرونی دروازے کے پاس قریب کھڑے ہو گئے۔ تیسرا بدمعاش کھڑکی کے پاس میز پر بیٹھ کر پردے کا کونا ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ چوتھا بدمعاش اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انگلیوں پر پستول نچاتے ہوئے ہیلن پر بری نظر ڈالی پھر اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ پستول کا رخ ہیلن کی طرف اس کی منجمد آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا: "سنو بے بی! ہمارے پاس وقت بالکل نہیں۔ تمھارے پاس جتنی نقدی ہے، وہ ہمارے حوالے کر دو۔ اپنی کار کی چابی بھی ہمیں دو۔ ہماری کار تمھارے منحوس قصبے میں آ کر خراب ہو گئی ہے۔"

ہیلن کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ یہ چاروں بدمعاش اس کی دن بھر کی کمائی لوٹنا چاہتے تھے۔ اس نے کمائی بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔ وہ ان بدمعاشوں کے سامنے بے بس تھی۔ پھر بھی اس نے حوصلہ کر کے چاروں بدمعاشوں کی طرف دیکھا اور بولی "کار کی چابی تم شوق سے لے جاؤ۔"

www.pdfbooksfree.pk

اس نے کاؤنٹر کی دراز سے پرس نکالا۔ وہ اس کی زپ کھول رہی تھی کہ بدمعاش نے پرس جھپٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف اچھال دیا۔ جب وہ پلٹا تو ہیلن نے خوف زدہ ہرنی کے مانند دہشت سے انھیں دیکھا پھر بہ وقت تمام حوصلہ کر کے بولی "تم چند سو ڈالر حاصل کر کے کیا کرو گے؟ یہ چھوٹا سا کافی ہاؤس ہے۔"

"قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے۔" اس بدمعاش نے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا۔ "ہم چار جگہوں سے کامیاب لوٹے ہیں۔ ملنے والے چند سو ڈالر کے علاوہ ہیرے کی جڑاؤ انگوٹھی اور کانوں میں جھلملاتے آویزے بھی بہت قیمتی معلوم ہوتے ہیں۔" وہ توقف کر کے کینہ توز نظروں سے اسے گھورنے لگا، تو ہیلن کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ "پھر ہم یہاں سے انمول خزانہ بھی تو لے جائیں گے۔"

"خزانہ؟" ہیلن اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ "کیسا خزانہ؟ یہاں کوئی خزانہ نہیں۔"

"یہ سامنے تو ہے خزانہ۔" بدمعاش کی نظریں اس کے بدن میں چبھنے لگیں۔ وہ اندر ہی اندر کھول اٹھی۔ چاروں نے مل کر بھونڈے انداز میں قہقہے لگائے۔ پھر اس نے کاؤنٹر پر جھک کر سرگوشی کے انداز میں پوچھا "کیا تم کسی خزانے سے کم ہو؟"

ہیلن نے اس کی بے ہودہ بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر دیوار گھڑی کی طرف اٹھ گئی، آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ مگر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پانچ صدیاں باقی ہیں۔ دراصل ٹھیک آٹھ بجے شیرف اور اس کا ساتھی رینالڈ بلا ناغہ کافی پینے آتے اور پھر چلے جاتے تھے۔ شیرف اور گھڑی کی سوئی میں کبھی فرق نہیں پڑا تھا۔ وقت کی یہ پابندی اس وقت سے چلی آ رہی تھی جس روز شیرف نے پہلی بار کافی پی۔ ہیلن تو اپنی گھڑی کا وقت اکثر شیرف کی آمد پر ملاتی۔ اس کی دستی گھڑی اکثر صحیح وقت نہیں بتاتی تھی مگر شیرف ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا۔ لیکن شاید آج وہ ٹی وی پر راک بڈسن کا پروگرام دیکھ کر آئے۔ ہیلن نے مایوسی اور دل شکستگی سے سوچا وہ بھی تو، راک بڈسن کا عاشق تھا۔

"تم گھڑی کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا تمھارا منگیتر تمھیں لینے پہنچنے والا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے جلدی سے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "روزانہ ٹھیک آٹھ بجے شیرف اور اس کا ایک ساتھی کافی لینے آتے ہیں۔ بس اب وہ آنے ہی والے ہیں۔"

کیا وہ دونوں کافی یہاں بیٹھ کر پیتے ہیں؟"

"نہیں۔" ہیلن نے جواب دیا۔ "وہ اپنے کلاس لے کر چلے جاتے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" اس نے تمسخر سے کہا۔ "سنو بے بی! ہم یہاں کوئی خون خرابا کرنا نہیں چاہتے۔ تم ہم سے تعاون کرو، تو شاید ہم تمھیں ساتھ نہ لے کر جائیں۔ جس وقت شیرف اور اس کا ساتھی یہاں داخل ہوں، تم خود کو پوری طرح قابو میں رکھو گی اور انھیں کوئی اشارہ نہیں کرو گی۔ اگر تم نے کوئی تدبیر اور چالاکی دکھائی تو سب سے پہلے میری گولی تمھارا سر پھاڑے گی۔ شیرف اور اس کے ساتھی سے نمٹنے کے لیے میرے یہ تین دوست کافی ہیں۔ ان کے نشانے کبھی نہیں چوکتے۔ ان کے ہاتھوں میں بجلیاں بھری ہیں۔ اب تم جلدی سے ہمارے لیے کافی تیار کرو، سمجھیں۔"

ہیلن نے کسی سعادت مند شاگرد کی طرح اپنا خوشامد بلایا تو دروازے میں کھڑے بدمعاش نے کاؤنٹر کے پاس آ کر پوچھا "یہ دونوں گدھے بلا ناغہ کافی پینے کے لیے صرف یہیں کیوں آتے ہیں؟"

"صرف وہ دونوں ہی نہیں بلکہ بہت سے کاؤ بوائے۔" ہیلن کہنے لگی "آج یہاں سناٹا اس لیے ہے کہ ٹی وی پر

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

راک ہڈسن کی زندگی کے بارے میں ایک فلم دکھائی جانے والی ہے۔" وہ توقف کر کے مگ کاؤنٹر پر رکھنے لگی۔ "میں بہت شاندار کافی بناتی ہوں۔ جو ایک بار پی لے، اسے چسکا لگ جاتا ہے۔ وہ کسی نشے کی طرح اس کا عادی ہو جاتا ہے۔"

"ہم نے بھی بڑی تعریفیں سنی ہیں۔" تیسرا بدمعاش جو کھڑکی کے قریب میز پر بیٹھا تھا، پردے کا کونا چھوڑ کر بولا "کافی کی اور تمھاری بھی! سچ پوچھو تو کافی ہی ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ مگر تم کافی کے مقابلے میں زیادہ شہرت رکھتی ہو۔ آج دیکھا تو یقین آگیا کہ تم واقعی حسن کا بے مثال نمونہ ہو۔"

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم لوگ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ تم اس قصبے کے شیرف کو نہیں جانتے۔ وہ بڑا تندمزاج اور سخت گیر ہے۔ اسے بلاوجہ غصہ بھی آتا رہتا ہے۔ بے حد [illegible] ہے، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔ آج تک کوئی مجرم شیرف کے ہاتھ سے بچ نہیں سکا۔"

"اپنی زبان بند رکھو اور اپنے کام سے کام رکھو، ورنہ..."

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک کار کی روشنی کھڑکی کے شیشے سے ہوتی ہوئی اندر آئی، پھر دوسرے لمحے غائب ہو گئی۔ چاروں نے تیزی سے ایک ایک الگ میز سنبھالیں۔ وہ ایک ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہیلن نے ان کی پوزیشنیں دیکھیں تو وہ سمجھ گئی کہ یہ پیشہ ور بدمعاش ہیں۔ جس انداز میں بیٹھے، اس سے وہ شیرف اور اس کے ساتھی کو آسانی سے نشانہ لے سکتے تھے۔ شیرف یا اس کا ساتھی ان چاروں میں سے کسی ایک کو بھی نشانہ نہ بنا پاتے۔

وہ خود کو قابو میں رکھ کر کافی تیار کرنے لگی مگر اس کا ذہن تیزی سے کوئی ایسی تدبیر سوچ رہا تھا کہ شیرف اور اس کے ساتھی کو بدمعاشوں کے ارادوں کا علم ہو جائے۔ وہ شیرف کو ایسا اشارہ دینا چاہتی تھی کہ بدمعاشوں کو ہوا تک نہ لگے۔ آنکھوں کی زبان سے اشارہ دینا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے کہ ان بدمعاشوں کی نگاہیں اس کی حرکات و سکنات پر مرکوز تھیں۔ وہ کوئی ایسی حماقت کرنا نہیں چاہتی تھی کہ تین لاشیں خون میں لت پت پڑی ہوں۔ وہ کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہتی تھی کہ سانپ مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

اسی پل ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح آیا۔ کافی سے وہ کوئی مدد لے سکتی ہے؟ اشارہ دے سکتی ہے؟ اس کافی نے آج تک اسے خوشیاں دی تھیں، اب یہی کافی آج اس کے لیے عذاب بن رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی، تو اس نے سوچا، کیا ایسا ممکن ہے کہ یہ کافی مجھے ان بدمعاشوں سے نجات دلا دے؟ مگر اسے امید نہیں تھی کہ اس کی تدبیر کارگر ثابت ہو۔

> یہ چاروں بدمعاش اس کی دن بھر کی کمائی لوٹنا چاہتے تھے۔ اس نے کمائی بڑی محنت سے حاصل کی تھی۔

ادھر گھڑی میں ٹھیک آٹھ بجے ادھر شیرف تب اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ تنہا چلا آتا تھا اور اس کا ساتھی گاڑی ہی میں بیٹھا رہتا۔ ہیلن اس قدر پرسکون تھی کہ اسے خود بھی حیرت تھی۔

اس نے کنکھیوں سے بدمعاشوں کی طرف دیکھا جو شریف صورت بنائے بیٹھے بظاہر ایڈز کی بیماری کو اپنی گفتگو کا موضوع بنائے ہوئے تھے مگر وہ غیر محسوس طریقے سے پوری طرح چوکنا تھے۔ ان سب کی نظریں اس کی حرکات و سکنات پر جمی ہوئی تھیں۔

معمول کے مطابق شیرف نے اندر داخل ہو کر رسمی جملوں کا تبادلہ کرتے ہوئے کرسمس کے بارے میں پوچھا۔ پھر اسٹول پر بیٹھ کر ان چاروں بدمعاشوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور ہیلن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "آج پہلی بار تمھارے ہاں چند گاہک دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں!" ہیلن خوش دلی سے بولی "ٹی وی پر آج جو

www.pdfbooksfree.pk

پروگرام دکھایا جا رہا ہے وہ ایسا ہے کہ ایک گھنٹا پہلے ہی سے قصبہ ویران اور سنسان ہو گیا۔"

"راک ہڈسن ہمیشہ میرا پسندیدہ اداکار رہا ہے مگر اس کی موت بڑی عبرت ناک تھی۔" شیرف نے پژمردگی سے کہا۔

ہیلن نے کافی کے دو گلاس تیار کیے اور شیرف کی طرف بڑھا دیے۔ شیرف اٹھ کھڑا ہوا۔ بٹوہ نکال کر اس کی قیمت ادا کی، گلاس اٹھا کر جانے کے لیے مڑا، پھر جاتے ہوئے ان بدمعاشوں پر ایک نظر ڈال نکل گیا۔

شیرف کی کار جیسے ہی اسٹارٹ ہو کر چلی، چاروں بدمعاش سرعت اپنی کرسیوں سے اٹھ کر اس کی طرف لپکے۔ [illegible] منگنی کی انگوٹھی اور کانوں سے آویزے اتار لیے اور اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ نقصان [illegible] تو ساتھ نہیں لے جائیں گے؟" ہیلن نے [illegible]

"کہا تو تھا" وہ بولا "مگر تم [illegible] کافی بھی تو پی [illegible] ہے۔ جب تک [illegible] نہیں [illegible] تم کافی [illegible] ہم صرف کافی پینے کے لیے ہی جا رہے ہیں۔"

ہیلن [illegible] اس کی تدبیر ناکام ہو گئی۔ [illegible] بدمعاشوں [illegible] اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اب [illegible] اس کی لاش ہی [illegible] ہو سکتی تھی۔ اس ہولناک تصور سے اس کے بدن پر لرزہ طاری [illegible] تھا۔ وہ غم و صدمے سے نڈھال تھی۔ اس کا دل اندر [illegible] رہا تھا۔ بدمعاش اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ آگے دو اور پیچھے دو بدمعاش اسے لیے نکلے۔

دفعتاً ہیلن کو ایسا محسوس ہوا کہ بھونچال آ گیا ہو۔ چاروں طرف سے سنسناتی ہوئی گولیوں نے کار کے ٹائر پنکچر کر ڈالے۔ کار کا ستیاناس ہو گیا پھر کار روشنی میں نہا گئی۔ دو بدمعاشوں نے بڑی سرعت کے ساتھ باہر نکل کر پوزیشن لینے کی کوشش مگر وہ گولیوں کا نشانہ بن کر ڈھیر ہو گئے۔ باقی دونوں بدمعاشوں نے پستول باہر پھینک کر اپنی جانیں بچائیں۔

☆☆☆

ایک گھنٹے بعد ہیلن اپنے کافی ہاؤس میں شیرف اور اس کے ساتھی کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ ہیلن نے پوچھا "تم دور جا کر فوراً ہی واپس آ گئے؟ کیا تمھیں بعد میں احساس ہوا کہ میرے ہاں مفرور بدمعاش بیٹھے ہوئے ہیں یا ریڈیو پر تمھیں ان کے بارے میں کوئی اطلاع ملی تھی؟"

"تمھاری کافی نے واپسی پر مجبور کر دیا۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ میں کس قدر غصے میں واپس آیا۔"

"وہ کس لیے؟" ہیلن نے دل فریب انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

"اس لیے کہ تمھاری خبر لے سکوں۔" شیرف بولا "کافی ہاؤس پہنچ کر کار سے اتر رہا تھا کہ تمھاری کار تیزی سے جاتے ہوئے دکھائی دی۔ میں نے اس خیال سے تمھارا تعاقب کیا کہ تمھاری سرزنش کر سکوں۔ اتنے اونچے دام اور ایسی واہیات کافی! میں نے اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسی بدمزہ، تلخ اور زہریلی قسم کی کافی نہیں پی۔ اسی کافی نے تو مجھے فوراً واپسی پر مجبور کر دیا۔"

"میں جانتی تھی کہ تم بدمزہ کافی پی کر فوراً واپس آؤ گے اور ان بدمعاشوں سے نجات دلاؤ گے۔ بدمزہ کافی ہی ایک اشارہ اور تدبیر تھی اپنے آپ کو بچانے کی [illegible] یوں یہی میری تدبیر شیرف!"

"بہت اچھی، بہت عمدہ بالکل اس کافی کی طرح۔" اس نے کافی کا پیالہ آگے کرتے ہوئے کہا "مگر خدا کے لیے پھر کبھی ایسی بدمزہ اور زہریلی کافی نہ بنانا۔"

شیرف نے ایسا برا منہ بنایا کہ وہ ہنس پڑے۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

غیر ملکی کھلاڑی

عظیم ترین بلے باز

سرڈان بریڈمین

اس شاندار کرکٹر کا قصۂ حیات جس نے
ناقابل شکست ریکارڈ بنا کر اپنا نام امر بنا لیا

رانا محمد شاہد

دنیائے کرکٹ میں کئی ستارے چمکے اور پھر بجھ گئے۔ لیکن کچھ ستارے ایسے بھی ہیں جن کی چمک دمک آج تک ختم نہیں ہوئی۔ انہی ستاروں میں سے ایک ایسا ستارہ ہے جس کے کارناموں سے کرکٹ کا میدان جگمگا رہا ہے۔ اس کا نام سر ڈان بریڈمین ہے۔ بریڈمین کرکٹ کے بادشاہ تھے بلکہ کھیل میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا۔

ان کا پورا نام سر ڈان جارج بریڈ تھا۔ وہ ۲۷ اگست ۱۹۰۸ء کو آسٹریلوی ریاست شہر نیو ساؤتھ ویلز کے قصبے کوٹمندرا میں پیدا ہوئے۔ والد ایک کسان تھے جو بعد میں بڑھئی کے پیشے سے بھی منسلک رہے۔ سر ڈان بریڈمین نے پہلا ٹیسٹ ۲۹۔۱۹۲۸ء کے سیزن میں کھیلا جس کی دونوں اننگز میں وہ صرف اکاون اور ایک رن بنا

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

سکے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے ایسے کارنامے انجام دیے کہ انھیں نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود بھلایا نہیں جا سکا۔

بریڈمین کے ٹیسٹ کرکٹ میں آنے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ یہ ۱۹۲۰-۲۱ء کی بات ہے۔ وہ اپنے علاقے کی مقامی ٹیم میں بطور اسکورر کام کرتے تھے۔ اس ٹیم کے کپتان ان کے چچا، جارج وائٹ مین تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جب یہ محسوس ہوا کہ ٹیم میں ایک کھلاڑی کم ہو چکا، تو ڈان بریڈمین کو ٹیم میں جگہ دے دی گئی۔

انھوں نے دونوں اننگوں میں ناقابل شکست رہتے ہوئے ۳۷ اور ۲۹ رنز کی کھیلیں۔ اسی سال ان کے والد انھیں ایشیز ٹیسٹ سیریز دکھانے سڈنی کرکٹ اسٹیڈیم لے گئے۔ بریڈمین ایک پُرعزم انسان تھے۔ چنانچہ عالمی شہرت یافتہ کرکٹروں کو کھیلتے دیکھ کر انھوں نے عزم کیا کہ وہ بھی کرکٹ کی دنیا میں اپنے وطن کا نام روشن کریں گے۔ بریڈمین نے پہلے روز کا کھیل دیکھنے کے بعد اپنے والد سے کہا "جب تک میں اس اسٹیڈیم میں نہیں کھیلتا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

اس عزم میں یقیناً ان کے والد کی دعا بھی شامل تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا اور وہ جلد قومی ٹیم کا حصہ بن گئے۔ ۵ فٹ ۷ انچ کے مالک بریڈمین دائیں ہاتھ سے بلے باز اور دائیں ہاتھ سے ہی لیگ بریک سپنر تھے۔ فرسٹ کلاس کرکٹ میں ان کے حصے میں جو اعزازات آئے، وہ شاید ہی کسی کا مقدر بن سکے۔

ڈان بریڈمین نے فرسٹ کلاس کرکٹ کی ۳۳۸ اننگز میں ۴۳ بار ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے ۲۸ ہزار ۶۷ رنز بنائے۔ ۱۱۷ سنچریاں اسکور کیں۔ ان کی بیٹنگ اوسط ۹۵٫۱۴ تھی۔ یہ اب تک ناقابل شکست ریکارڈ چلا آ رہا ہے۔ ان کا زیادہ سے زیادہ اسکور ۴۵۲ ناٹ آؤٹ رہا۔ اسی طرح فرسٹ کلاس کرکٹ میں ۱۳۳۱ ایک روزہ میچ کھیلے جن میں ۶۴ بار ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے ۲۲۶۶۴ رنز بنائے۔ سب سے بڑی اننگز ۳۲۰ رنز ناٹ آؤٹ پر مشتمل تھی۔ سنچریوں کی تعداد ۹۴ رہی۔

ڈان بریڈمین نے پہلا ٹیسٹ ۳۰ نومبر ۱۹۲۸ء کو انگلینڈ کے خلاف جب کہ آخری ٹیسٹ بھی اسی ملک کے خلاف ہی کے خلاف ۱۸ اگست ۱۹۴۸ء کو کھیلا۔ اپنے اس بیس سالہ ٹیسٹ کیریئر میں انھوں نے ۵۷ ٹیسٹ میچوں میں حصہ لیا، ۸۰ اننگز میں ۱۰ مرتبہ ناٹ آؤٹ رہتے ہوئے ۹۹٫۹۴ کی ناقابل یقین اوسط سے ۶۹۹۶ رنز بنائے جس میں ۲۹ سنچریاں اور ۱۳ نصف سنچریاں بھی شامل تھیں۔ ان کی بہترین اننگز ۳۳۴ رنز پر مشتمل تھی جو انھوں نے ۱۹۳۰ء میں انگلینڈ کے خلاف لیڈز کے مقام پر کھیلی۔ ۳۲ کیچز پکڑے اور ۲ رنز دے کر ۳۶ کی اوسط سے دو وکٹیں بھی حاصل کیں۔ ۸ رنز کے عوض ایک وکٹ ان کی بہترین کارکردگی تھی۔

ڈان بریڈمین اپنی ۲۲ ویں سالگرہ تک کئی ریکارڈ بنانے کی وجہ سے دنیا بھر میں مرکزِ نگاہ بن چکے تھے۔ اپنے اس شاندار کھیل کی وجہ سے ایک بار ان کے کپتان بل وڈفل کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے: "ڈان بریڈمین آسٹریلیا کے لیے بڑا سرمایہ ہیں۔" اس کے بعد انھوں نے نہ صرف اپنے کپتان کے جملے کی لاج رکھی بلکہ اس سے بھی زیادہ اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

ڈان بریڈمین اچھے کھلاڑی ہی نہیں عمدہ کپتان بھی تھے۔ جس کا اندازہ ان کی کارکردگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ۲۴ ٹیسٹ میچز میں آسٹریلوی ٹیم کی قیادت کی،

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

جس میں سے ۱۵ ٹیسٹ جیتے، ۳ ہارے جب کہ ۶ بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گئے۔ کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد ڈان بریڈمین تین دہائیوں تک منتظم، سلیکٹر اور لکھاری کی حیثیت سے کرکٹ کے افق پر چھائے رہے۔ ۲۰۰۱ء میں آسٹریلوی وزیراعظم جان ہاورڈ نے انھیں Greatest Living Australian (آسٹریلیا کا سب سے عظیم زندہ انسان) قرار دیا۔ بریڈمین ۲۵ فروری ۲۰۰۱ء کو ساؤتھ آسٹریلیا کے شہر کنگسٹن میں اس وقت ان کی عمر ۹۲ سال تھی۔

ڈان بریڈمین کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ کرکٹ کے زندہ چیمپئن ٹنڈولکر، برائن لارا اور ای این بوتھم، ان سے ملاقات کرنے اور آٹوگراف لینے کو بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ وہ وکٹ کے چاروں طرف جارحانہ انداز میں کھیلنے والے اور مخالف ٹیم کے سامنے سیسہ پلائی دیوار کی مانند ڈٹ جانے والے ایک بہادر اور مستقل مزاج بلے باز تھے۔

ڈان بریڈمین کی وفات کے بعد ان کی تصویر ڈاک ٹکٹوں اور سکوں پر بھی شائع ہوئی۔ ۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء کو سر ڈان بریڈمین کا پورٹریٹ آئی سی سی کرکٹ ہال میں ہمیشہ کے لیے سجا دیا گیا۔ گیری سوبرز نے بلے بازی میں نام کمایا۔ جیفری بائیکاٹ آئیڈیل بلے باز کہلائے۔ جاوید میانداد نے بھی عظیم کارنامے انجام دیے۔ ڈیوڈ گاور نے بیٹنگ کو خوبصورت انداز دیے۔ سنیل گواسکر نے رنز کے انبار لگائے۔ ایلن بارڈر نے کرکٹ کی ۱۰۰ سالہ تاریخ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ مگر آج تک کوئی بھی سر ڈان بریڈمین کے کارناموں کو نہیں دھندلا سکا۔

سر ڈان بریڈمین کا نام ان کے ریکارڈوں کی وجہ سے عظیم ترین کرکٹ کھلاڑیوں میں شامل رہے گا۔

کتھارسس

گزرے ہیں کچھ اس طرح سے کچھ اپنے روز و شب
جیسے کہ جی رہے ہوں دنیا میں بے سبب
منظر اک حشر کا آنکھوں کے سامنے
طوفان نوح ہے موجزن کوئی میرے عقب
آیا ہے مانگنے کا سلیقہ نہ آج تک
داتا نے سب عطا کیا اور وہ بھی بے طلب
کھایا تھا بے وفائی کا جو زخم ایک بار
رکھتا ہے آج بھی دل مجروح کو مضطرب
کب تک رہیں گے متقاضی اپنے حقوق کے
صدیوں سے جو ہو رہے ہیں آج تک غصب
کوئی بتائے کہ ان تک رسائی ہو کس طرح
بھیجا اسمبلیوں میں جنھیں کر کے منتخب
ساری محبتوں کو کہیں راکھ کر نہ ڈالے!
بھڑکی ہوئی ہے اس طرف جو آتش غضب
ان کی رفاقتوں کا گلہ کیا کریں ضیا
جن کے طفیل آج ہم بیٹھے ہیں جاں بلب

ضیاء فراشوی (اسلام آباد)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

دنیا جہاں سے نرالے

"ہم" سے ملاقات

"میں" کی کٹر دشمن ایک خاتون کی انقلابی باتیں

ام احمد

آج اس کی گہری سہیلی بینہ کا بیان تھا۔ وہ والدہ کے ہمراہ تقریب میں شریک تھی۔ اب متجسس نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی تاکہ بوریت دور کرنے کا حیلہ ہاتھ آئے۔ یکایک اس کی نگاہیں ایک سمت مرکوز ہوئیں اور وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اس کے دائیں طرف تھوڑی دور ایک ادھیڑ عمر خاتون خوبصورت لباس میں ملبوس بڑے رکھ رکھاؤ سے تشریف فرما اپنی ساڑھی کا پلو بار بار انگلیوں پر لپیٹ رہی تھیں۔ لب بھی مسلسل ہل رہے تھے۔ عنیزہ نے اپنے حواس ادھر لگا دیے۔ سامنے بیٹھی خاتون ان کی باتوں پر زور شور سے اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ دلچسپ جملے کانوں میں پڑے تو عنیزہ کی متجسس طبیعت نے قدم ادھر بڑھا دیے۔

"ہم بہت پریشان تھے، ہم رات ۸ بجے گھر پہنچے، ہم صبح نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئے۔ ہم نے آپ کو فون کیا تھا، ہم ابھی آئے ہیں۔"

عنیزہ نے دائیں بائیں نظر دوڑائی کہ شاید کوئی جمع متکلم نظر آئے مگر سوائے موصوف اور سامنے سر دھننے والی خاتون کے کوئی موجود نہ تھا۔

"آنٹی [illegible] معاف کیجیے گا، کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟" [illegible] مسکراہٹ سجائے عنیزہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ [illegible] ادب سے یہ جملے ادا کرتے وہ آداب کا مجسم ظہور بنی ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں... آؤ بیٹھو، ہم [illegible] بور ہو رہے تھے۔" خاتون نے جواب دیا۔

عنیزہ فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پریشان ہو گئی۔ خاتون سامنے بیٹھی مخاطب کے ساتھ دوبارہ جمع متکلم میں

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/

www.pdfbooksfree.pk

بات کرنے لگیں۔ اس دوران عنیزہ ذہن میں بہت سارے سوالات تیار کر چکی تھی۔ ''معاف کیجیے گا، یہاں تو آپ کے ساتھ اور کوئی بھی نظر نہیں آ رہا، کیا آپ اپنے ساتھ کسی جمع غائب کی بات کر رہی ہیں؟'' سوالات کا آغاز ہوا۔ دور بیٹھی عنیزہ کی امی اس کی بوریت دور ہوتے دیکھ کر مسکرا اٹھیں۔

''نہیں تو! ہم اپنے آپ کو ہی ہم کہہ رہے ہیں۔ کسی اور کی بات بھلا ہم کیوں کریں گے؟ ہم تو اپنی ہی بات کرتے ہیں۔'' خاتون ادائے بے نیازی سے گویا ہوئیں۔

''دیکھیے بُرا نہ منائیں، کیا میں آپ سے یہ سوال پوچھ سکتی ہوں کہ آپ خود کو ''ہم'' کیوں کہتی ہیں؟'' عنیزہ دبی دل میں چھپا کر بولی۔

''میں سے بچنے کے لیے۔'' جواب ملا۔

''آپ کافی دلچسپ خاتون ہیں، آج تو مزے ہو گئے۔'' عنیزہ نے سوچا اور سوال داغ دیا۔ ''لیکن خالہ! ''ہم'' میں تو بہت ساری ''میں'' جمع ہو جاتی ہیں۔''

''نہیں..... ہم تو ایسا نہیں سمجھتے۔ دراصل یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، ہر کسی کی سمجھ میں یہ باتیں آنے کی نہیں۔ سمجھنے والے سوئے ظن پر اتر آتے ہیں حالانکہ ہم تو خلوص نیت ہی سے ایسا کرتے ہیں۔'' موصوفہ وضاحت کر رہی تھیں۔ ''لوگوں کے سوال و جواب پر ہم بہت پریشان ہوتے ہیں۔''

خاتون تو اپنے غم دل کا اظہار کر رہے ہیں، او ہو بھئی، کر رہی ہیں۔ عنیزہ اپنی ہی سوچوں میں گڑبڑا گئی۔ پھر مسکراتے ہوئے تاریخی سوال کر دیا ''کیا آپ کا یہ انداز گفتگو بچپن سے ہے؟''

''جب ہم چھوٹے اور ناسمجھ تھے نا، اس وقت ہم میں، میں ہی کرتے' اوہ سوری، کہتے تھے۔ لڑکپن سے گزر کر جوانی میں قدم رکھا' تو اس شعوری بلوغت سے بہرہ ور ہوئے۔'' خاتون اپنے تاریخی ارتقا کی داستان میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ ان کے نزدیک سوالات دلچسپ تھے اور عنیزہ، وہ کب چوکنے والی تھی، اس کا تو کالم تیار ہو رہا تھا۔

''آپ اپنی اس ترقی کی وجہ بتانا پسند کریں گی؟'' بات آگے بڑھانے کا سامان وافر مقدار میں تھا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں، اصل میں ہم بچپن ہی سے بہت ساری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ گھر، خاندان، رشتے دار، دوست، غرض ہر جگہ ہمیں بڑی پذیرائی ملتی۔ ہم نے ہمیشہ اپنے کانوں سے اپنی تعریف ہی سنی..... کوئی ان جیسا نہیں، کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا، ان جیسی صلاحیت کسی میں ہے ہی نہیں۔ اس طرح کے سیکڑوں فقرے ہمارے ذہن میں ہماری اہمیت بٹھاتے رہے۔ تنقید تو کبھی کسی نے کی ہی نہ تھی۔ اگر کسی نے ہمت کی، تو اسے منہ کی کھانا پڑی۔''

> ہر فرد شب و روز کثرت سے ''میں'' میں'' کرتا ہے اور ہم..... ہم تو اکیلے کئی ایک پر بھاری ہیں۔

''لیکن ان باتوں کا ''میں'' اور ''ہم'' سے بھلا کیا تعلق؟ میرا مطلب ہے میرے سوال سے ان کا کیا تعلق ہے؟'' عنیزہ کے پے در پے سوالات خاتون کے دل میں اپنی اہمیت اور بھی بڑھا رہے تھے۔ قریب بیٹھی خاتون دلچسپی سے مسکرانے لگیں۔ وہاں بیٹھ کر عنیزہ کو محسوس ہوا کہ ان دونوں کا کوئی رشتہ ناتا نہ تھا، بلکہ وہ مجبوراً حق ہمسائگی نبھا رہی تھیں۔ اس نے دیکھا، امی اب بھی والدہ سے مصروف گفتگو ہیں۔ وہ جواب لینے خاتون کی طرف جھک گئی۔

''ہم آپ کے جواب ہی کی طرف آ رہے تھے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

آپ نے ہماری بات کاٹ کر اچھے اخلاق کا ثبوت نہیں دیا۔" موصوف برہم نظر آنے لگیں۔ "خیر اب محتاط رہیے گا، تو ہم بات کر رہے تھے کہ ہمیں پذیرائی کا ماحول بہت اچھا لگتا۔ رفتہ رفتہ ہم سمجھنے لگے کہ ہم دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ ہم بہتر و برتر ہیں۔ ہمارے دماغ نے یہ فیصلہ دیا کہ ہماری تو ہر ادا منفرد اور تنوع کا رنگ لیے ہوئے ہونی چاہیے۔ سن رہی ہیں آپ!" موصوف نے سامنے بیٹھی خاتون کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ عنیزہ بھی محتاط ہو کر بیٹھ گئی۔ بات جوش سے جاری رہی:

"ہم نے دوسروں کی اداؤں پر غور کیا، تو ایک بنیادی نکتہ ہماری سمجھ میں آیا۔ وہ یہ کہ ہر فرد شب و روز شدت سے "میں، میں" کرتا ہے اور ہم... ہم تو اکیلے ہی ایک پر بھاری ہیں۔ ہمارے ارد گرد رہنے والے دن رات ہمیں یہی جتلاتے کہ ہم تنہا کئی لوگوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کوئی ہمیں پچھاڑ نہیں سکتا، تو پھر ہمیں تو "میں، میں" کا مجموعہ ہونا چاہیے۔ یوں ہمارا زمین سے ہوائی کا سفر شروع ہوا۔ ہم نے "میں سے ہم" تک کا سفر مکمل کر لیا۔"

> آپ تصور کریں کیا عالم ہو گا جب دنیا "میں میں" کی رٹ لگانے والوں کو ان سائے پناہ ملی، تو صرف "ہم" میں ہیں

خاتون داد طلب نگاہوں سے عنیزہ کو تکنے لگیں۔ عنیزہ کی ایڈونچر پسند طبیعت نے بڑا حسین انتخاب کیا تھا۔ "اس سفر میں آپ کو کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟" عنیزہ نے سوال کیا۔

"ہاں، ہاں... کیوں نہیں! جو کام غیر معمولی ہو اس کے لیے اتنی ہی جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ یہ ہمارا انقلابی فیصلہ اور سفر تھا جس میں ہم کامیاب ٹھہرے۔ مشکلات اور آزمائشیں ہمارے عزائم سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں۔ بہت سوں نے خیر خواہ بن کر ہمیں اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ دوستی کے لبادے اوڑھ اوڑھ کر آئے، لیکن ہم نے ان مشوروں پر شکریہ ادا کیا کیونکہ ہم اپنا برا بھلا خود سمجھتے تھے۔ وہ ہم ہی کیا ہوئے جو ہمت ہار جاتے۔" خاتون فخریہ انداز میں بول رہی تھیں۔

عنیزہ کی نگاہیں شادی ہال کا جائزہ بھی لے رہی تھیں۔ وقت خاصا ہو چکا تھا۔ ایک دو اور خواتین بھی گفتگو میں شریک ہو گئیں۔ ماحول اچھا خاصا دلچسپ تھا۔

"کیا آپ اپنے خیر خواہوں میں سے کسی کو قائل کرنے میں کامیاب ہوئیں؟" عنیزہ اب جلد گفتگو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی۔ کھانے کی خوشبو ہال میں پھیل رہی تھی اور اسے اپنی ٹیبل تک بھی پہنچنا تھا۔ خاتون کو سوچ میں گم دیکھ کر عنیزہ نے سوال دہرایا: "میرا مطلب ہے، کسی اور نے بھی "میں، میں" چھوڑ کر "ہم" کا لبادہ اوڑھا؟"

"ہاں، ہاں... آ... آں نہیں کوئی خاص نہیں۔ ہم نے قائل کرنے کی کوشش تو بہت کی لیکن جیسا کہ ہم بتا چکے، یہ بات ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آنے کی کہاں ہے۔ اسے تو اعلیٰ و ارفع دماغ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مایوس ہو گئے ہیں... نہیں بالکل نہیں ہماری جدوجہد جاری ہے۔ ہم نے دیا جلا دیا، پروانے آ رہے ہیں۔ چند ایک ہمارے ارد گرد جمع ہو رہے ہیں اور ہمارے نقش قدم پر چلتے ہوئے "میں، میں" کی رٹ چھوڑ کر "ہم" کا حسین سفر شروع کر چکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہی ہمارے مخلص ہم سفر ہیں۔"

سوال ہوا: "کیا آپ اپنی اس کامیابی پر اپنے جذبات، احساسات دوسروں تک پہنچانا پسند کریں گی؟"

"ہاں ضرور! ہم اپنی خوشی بیان کرنے سے قاصر

www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ ''ہم'' کا حسین لبادہ اوڑھنے والے مٹھی بھر لوگ عمل کی دنیا میں عظیم انقلاب برپا کریں گے۔ آپ تصور کریں کیا عالم ہوگا جب دنیا ''میں میں'' کی رٹ لگانے والوں کو کوئی جائے پناہ ملی، تو صرف ''ہم'' میں ہوں گی۔

''دراصل ہماری پسماندگی کی اصل وجہ ہی یہ ہے کہ لوگ اپنی پست سطح سے بلند ہونا ہی نہیں چاہتے۔ ''ہم'' کی دنیا میں جو فسوں ہے، میں، میں کرنے والے کیا جانیں! ہمیں ایسے لوگوں سے ہمدردی ہے، ان کے لیے ہمارا پیغام ہے کہ وہ ہمت سے کام لیں، ہمارے ہاتھوں میں ہاتھ دیں اور ہماری تقلید کریں، کامیابی ان کے قدم چومے گی۔'' خاتون نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے بات مکمل کی اور ساڑھی کا پلو درست کرنے لگیں۔

عنیزہ نے دیکھا، بیرے کھانا لگا رہے ہیں۔ وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ ڈائری اور قلم کو بیگ میں رکھنے سے پہلے اس نے خاتون کی سوالیہ نگاہیں پڑھنے کی کوشش کی۔

''آپ بے فکر رہیے، آپ کی گفتگو عنقریب اہم جریدے کی زینت بنے گی۔ ''ہم'' اس کو نمایاں جگہ دیں گے۔ ہم اخبار میں کام کرتے ہیں۔'' عنیزہ شوخی سے کام لیتے ہوئے خاتون کے لہجے میں بات کرنے لگی۔

''شکریہ، ہمیں آپ کی یہ آخری بات بہت اچھی لگی۔ ہم اسی کے منتظر رہتے ہیں کہ ہمارا نام دنیا کے سامنے آئے۔ اس سے ہمیں روحانی سکون ملتا ہے، آپ ملتی رہیے گا۔'' خاتون نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

کھانا لگ چکا تھا۔ لوگ اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ خاتون بھی اپنا رکھ رکھاؤ بالائے طاق رکھ بھیڑ میں گھس گئیں۔ عنیزہ نے مسکراتے ہوئے قدم دور بیٹھی امی کی طرف بڑھا دیے۔ مینہ سے ملاقات ابھی باقی تھی۔

◆◆◆

امام ابوحنیفہؒ

☆ میں بخیل کو عادل نہیں سمجھتا اور نہ ہی اس کی گواہی قبول کرتا ہوں کیونکہ بخل، بخیل کو اپنے حق سے زیادہ لینے پر مجبور کرتا ہے۔

☆ کوئی تم سے حسن سلوک کرے یا نہ کرے، تم اس سے اچھا برتاؤ کرتے رہو۔

☆ ذلیل اور گھٹیا لوگوں سے دوستی نہ کرو، جس کا ظاہر اچھا نہیں اس سے ملاپ نہ رکھو۔

☆ پنجگانہ نماز پابندی سے ادا کرو، اور لگن جاری رکھو کیونکہ بخیل کبھی سردار نہیں بنتا۔

☆ ہر کسی کی دعوت قبول نہ کرو، بدامنی پیدا نہ کرو کوئی تمھیں ڈانٹے تو تم ایسا ہرگز نہ کرو۔

امام شافعیؒ

☆ زندگی ہمیں اس لیے نہیں عطا کی گئی کہ ہم اسے ان اشغال میں صرف کر دیں، جو ہمیں موت کے وقت اس دنیا ہی میں چھوڑنے پڑیں۔

☆ جب کام زیادہ ہوں تو اس کام کو ہاتھ میں لو جو سب سے زیادہ اہم ہو۔

☆ اپنی ضرورتیں کم کرو تو راحت ملے گی۔

☆ سب سے زیادہ جاہل وہ ہے جو گناہ سے باخبر ہوتے ہوئے بھی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

☆ ایماندار تاجر عابد سے بہتر ہے کیونکہ تجارت میں امانت سخت مشکل کام ہے۔

☆ جب تک کوئی تمھیں سامنے سے نہ پکارے جواب مت دو کیونکہ پیچھے سے پکارنا جانوروں کے لیے مخصوص ہے۔

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

اردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

560 روپے کی غیر معمولی بچت پائیے ۔ اس قیمت میں خصوصی نمبر بھی حاصل کیجیے

اردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے

دلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ____________ فون نمبر ____________

پتا ____________ ای میل ____________

میں ماہ ____________ 20ء سے اردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔

1۔ بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔ یا

2۔ میں مطلوبہ رقم -/1000 روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔ یا

3۔ میں نے -/1000 روپے اردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر 110-800380 بینک آف پنجاب ٹاؤن شپ میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔ اور اپنا ایڈریس ای میل کر رہا ہوں۔ یا

4۔ ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔ یا

5۔ ہمیں 0300-4005579 پر ایس ایم ایس کریں۔ ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔

تاریخ ____________ دستخط ____________

+92-42-37589957 +92-42-35290738
+92-42-35290731 urdudigest.pk subscription@urdu-digest.com

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے حالات زندگی پر

علامہ عبدالستار عاصم کی معرکہ آرا کاوش

انسائیکلوپیڈیا

جہانِ قائدؒ

تقدیم ڈاکٹر عبدالقدیر خان

تعارف ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی

فی سیٹ -/15000

فی جلد -/3000

مقبول اکیڈمی

199۔ سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور

0300-0515101
0323-4393422
0333-4393422

E-mail: qalamfoundation3@gmail.com

www.pdfbooksfree.pk

TENDER NOTICE.

1. Sealed tenders based on item rates are hereby invited, for the works mentioned below from the Contractor/Firms enlisted/renewed with C&W Department for the current financial year in the relevant category.

2. Tenders documents can be obtained from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/upto date renewal letter, PEC license, Identity Card of Contractor / Managing Partner / Director of the firm alongwith registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR / Bank Drafi / Cashier's Cheque of scheduled bank:- (in favour of E.E Ist P.B. Divn: Lahore)

vii) Chief Engineer Punjab Buildings Deptt: (N.Z).,
viii) Commissioner Lahore Division Lahore.
ix) Superintending Engineer Provincial Buildings Circle No.1, Lahore.
x) District Coordination Officer, Lahore.
xi) Executive Engineer, Ist Provincial Buildings Division, Lahore.
xii) Assistant Commissioner City Lahore.

3. Tenders rates and amounts should be filled in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender document. No rebate on tender rates will be acceptable.

4. Tenders will be received in the office of Commissioner Lahore Division Lahore and will be opened on fixed date and time by the respective Tender opening Committee at the above venue in the presence of intending contractors or their representatives.

5. Conditional tenders and tenders not accompanied with **earnest money @ 2%** of the bid cost in shape of CDR / Bank Draft / Cashier's Cheque of any scheduled Bank (in favor of E.E. Ist P.B. Divn: Lhr.) and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

6. The competent authority reserves the right to accept or reject all the tenders as per PPRA rules.

The tenders will be opened 30-minutes after closing time of bids as per PPRA rules 30 (i).

Last date for submission of application to purchase tender 16.03.2015
Last date & time for receipt/ opening of Tenders 18.03.2015 at 11.00 Am / 11.30 A.M

S.No.	Name of Work	Bid Cost	T.S No. & date	Tender Fee.
1	M/R to College of Opthalmology & Allied Vision Sciences (COAVS) in Mayo Hospital, Lahore (Front side).	294300	E.E. Ist No.939/C, dated.18.02.2015	150

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

2	S/R to Chief Engineer Highways 2-Lake Road Lahore (Roof Tiles On Garrages & Misc Works)	286000	E.E Ist No.6085/C dt.29.12.2014	150
3	M&R to Security measure at Lady Willingdon Hospital, Yakki Gate, Lahore (Boundary Wall Darbar East side).	299900	E.E. Ist No.912/C, dated.16.02.2015	150
4	S/R to Flat No.155/K in GOR-IV, Lahore.	59000	S.E. PBC No.2396/B, dated.23.05.2014	30
5	S/R to Chief Engineer Highways 2-Lake Road Lahore (Room In Front Of Central Stair In Basement And Other Items)	258000	E.E Ist No.6029/C dt.26.12.2014	130
6	S/R to P&D Housing Colony Lahore (Roof treatment (C Block No.1).	162000	E.E Ist No.6031/C dt.27.12.2014	80
7	M&R to Security measure at Lady Willingdon Hospital, Yakki Gate, Lahore (Razor wire front North side).	284300	E.E. Ist No.913/C, dated.16.02.2015	150
8	S/R to Chief Engineer Highways 2-Lake Road Lahore (Basement & 3rd Floor)	299000	E.E Ist No.6031/C dt.27.12.2014	150
9	S/R to Machinery Maintenance Division Sherpao Bridge Lahore (bath room)	260000	E.E. Ist No.5205/C, dated.10.11.2014	110
10	M&R to back side Bio-chemistry at post Graduate Medical Insitute, Lahore.	242200	E.E. Ist No.719/C, dated.06.02.2015	130
11	M&R to Public Health Nursing School, Lahore (MNCH Centre).	223200	E.E. Ist No.692/C, dated.02.02.2015	120
12	M&R to Security measure at Lady Willingdon Hospital Lahore (Provision of Razor wire at Back side wall).	294600	E.E. Ist No.914/C, dated.16.02.2015	150
13	M/R to College of Ophthalmology & Allied Vision Sciences (COAVS) in Mayo Hospital, Lahore (Left side Gate Piller).	195200	E.E. Ist No.835/C, dated.12.02.2015	150
14	M&R and renovation of Building of Public Health Nursing School Lahore (Admn. Block & class room).	216700	E.E. Ist No.682/C, dated.02.02.2015	110
15	M&R to Security measure at Lady Willingdon Hospital, Lahore (Razor wire front South side).	221500	E.E. Ist No.915/C, dated.16.02.2015	150
16	M&R and renovation of Building of Public Health Nursing School Lahore (Hostel).	298100	E.E. Ist No.684/C, dated.02.02.2015	150
17	S/R Punjab Public Service Commission Lahore.(Conference hall, Library, Rasheed block)	258000	E.E. Ist No.5513/C, dated.25.11.2014.	130
18	M&R to Security measure at Lady Willingdon Hospital, Lahore (Boundary wall Road side).	225900	E.E. Ist No.915/C, dated.16.02.2015	150

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

19	M&R to staff office back side lecture theatre I at post Graduate Medical Institute. Lahore.	91300	E.E. Ist No.719/C, dated.06.02.2015	
20	M/R to College of Ophthalmology & Allied Vision Sciences (COAVS) in Mayo Hospital, Lahore (First floor).	199800	E.E. Ist No.835/C, dated.12.02.2015	150
21	M&R to Director General Public Relation Lahore.	154000	E.E. Ist No.4266/C, dated.17.10.2014	80
22	S/R to P.W.D Compound Mcleod Road, Lahore. (Ist P.B Division, Lahore).	248000	E.E Ist P.B. Divn: Lhr. No.322/C, dated.12.01.15.	130
23	M/R to College of Ophthalmology & Allied Vision Sciences (COAVS) in Mayo Hospital, Lahore (From side Gate & Vicket gate).	214000	E.E. Ist No.945/C, dated.18.02.2015	150
24	S/R to Director General Public Relation Lahore (Mosque and chowkidar hut).	297000	E.E. Ist No.4266/C, dated.17.10.2014	150
25	M&R to Public Health Nursing School, Lahore (Nursing Hostel side).	201700	E.E. Ist No.686/C, dated.02.02.2015	110
26	S/R to P.W.D Sectt: Lahore (E.I portion).	298000	E.E Ist P.B. Divn: Lhr. No.354/C, dated.13.01.15.	150
27	S/R to Chief Engineer Highways 2-Lake Road, Lahore (E.I and Chemical polish at corridor Ist and 2nd floor).	298000	E.E. Ist No.4361/C, dated.24.09.2014	150
28	M/R to College of Ophthalmology & Allied Vision Sciences (COAVS) in Mayo Hospital, Lahore (Back side).	298900	E.E. Ist No.949/C, dated.18.02.2015	150
29	S/R to C&W Sectt: Lahore (Room PA to Ast-2/Staff P. Secy & other Misc. works).	273000	E.E Ist P.B. Divn: Lhr. No.6141/C, dated.30.12.15.	140
30	S/R to Ghazali Flat in GOR-IV, Lahore. (Roof treatment block No.3 B).	216000	E.E. Ist No.4470/C, dated.29.09.2014	110
31	S/R to Flat No.18/G, in GOR-IV, Lahore.	115000	C.E. PB. Bldgs: Deptt: No.2183/D2(dt.19.01.15	60

IPL-1986

EXECUTIVE ENGINEER,
Ist Provincial: Buildings Division,
Lahore.

(IJAZ AHMED SHEIKH)
SUPERINTENDING ENGINEER,
Provincial: Buildings Circle No.1,
Lahore.

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں تو جانیں

مرتب: سجاد قادر

(جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر 18 سے 28 سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ فروری میں دیے گئے اسلامی کوئز کے درست جوابات

اسلامی کوئز ۱۔ (الف) غزوہ احد ۳ ہجری، شوال ۳ ہجری (ب) سورۃ التوبہ۔ اسلامی کوئز ۲۔ (الف) غزوہ احزاب، غزوہ خندق (ب) سورۃ احزاب

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

1۔ سویرا اعظم (ہری پور) 2۔ مریم کاشف (حیدرآباد) 3۔ ملک ساجد ممتاز (چکوال) 4۔ مدیحہ نسیم (فیصل آباد)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

مادرخ (حیدرآباد)، ابتسام الرحمن (ہری پور)، سویرا اعظم (ہری پور)، محمد ہشام صابر (ہری پور)، محمد حذیفہ (ہری پور)، حیدر شمشاد خان (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، محمد شکیل عباس جنجوعہ، محمد مجتبیٰ عباس جنجوعہ، محمد تنزیل عباس جنجوعہ، محمد بلال حسن جنجوعہ (سرگودھا)، مریم کاشف (حیدرآباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدرآباد)، طہٰ حسین (حیدرآباد)، اقبال سلیم (حیدرآباد)، ولی حسین (حیدرآباد)، توصیف احمد (حیدرآباد)، صادق احسان (اسلام آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، ملک ساجد ممتاز (چکوال)، مدیحہ نسیم (فیصل آباد)، ... صدف نسیم (راولپنڈی)، فائزہ بتول (فیصل آباد)۔

اسلامی کوئز ۱

قرآن مجید کی ۸۸ویں سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ غاشیہ کے معنی ڈھانپ لینے والی چیز ہے۔ اس سورت میں ان لوگوں کو جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے، جھنجھوڑا گیا ہے۔ انھیں اس آفت کا ذکر ہے جو ساری کائنات پر چھا جائے گی اور انسان اس وقت دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک گروہ سخت عذاب جھیلے گا اور دوسرا جنت میں مزے کرے گا۔ آیات ۱۷ تا ۲۰ میں اس بات کا ذکر ہے کہ یہ انسان اپنے اردگرد کی چیزوں کو نہیں دیکھتا، ... سامنے پیش آتا ہے، سبق نہیں لیتا کہ ... کیسے بنائی گئی ہیں اور وہ خدا جو ان سب کا خالق ہے، ... قادر نہیں ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کر سکے۔

(الف) اس سورت کا نام بتائیں، یہ کس پارے میں ہے؟ (ب) اس سورت کے کتنے رکوع ہیں؟

اسلامی کوئز ۲

امام غزالی ... نام محمد، لقب حجۃ الاسلام، معروف غزالی۔ ان کے والد ... تھے۔ اس مناسبت سے ان کا خاندان غزالی کہلایا کیونکہ ... کاتنے والے کو عربی میں غزال کہتے ہیں۔ امام صاحب کے والد تعلیم سے محروم تھے جس کا انھیں بہت قلق تھا۔ مرتے وقت والد نے دونوں بیٹوں کو ایک بزرگ کے سپرد کر گئے کہ ان دونوں بچوں کو تعلیم دلانا۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم طوس ہی میں ... کتابیں احمد بن محمد راذکانی سے پڑھیں۔

(الف) عربی میں غزالی کس کو کہتے ہیں؟ (ب) امام غزالی کی تاریخ پیدائش اور وفات بتائیں؟

نوٹ: تمام قارئین اپنا نام و پتا جس پر TCS پہنچ سکے درست لکھیں اور ساتھ میں اپنا موبائل نمبر یا پی ٹی سی ایل نمبر دینا لازم ہے ورنہ TCS پہنچ نہیں پاتا اور گزشتہ کئی ماہ سے کئی TCS واپس مل رہے ہیں۔ (مدیر اردو ڈائجسٹ)

انعامات کے بہ تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

منصورہ ملتان روڈ لاہور

www.pdfbooksfree.pk

قرآنی آیات اور سائنسی حقائق

مصنف: ڈاکٹر ہلوک نور باقی، مترجم: سید محمد فیروز شاہ گیلانی، ناشر: انڈس پبلشنگ کارپوریشن، ۳۰۱-سی، ۲۵۷-اے، اے لائنز، بالمقابل سندھ اسمبلی، ہائی کورٹ روڈ، کراچی۔ قیمت: ۳۶۰ روپے۔

دورِ جدید میں عام خیال یہ پھیل چکا کہ مذہب اور سائنس کوئی مطابقت نہیں رکھتے۔ یہ نظریہ دراصل ان

مغربی ماہرین نے پھیلایا جنھوں نے صرف بائبل اور عیسائیت و یہودیت کی دیگر کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کتابوں میں دیومالائی واقعات اور عقل سے مطابقت نہ رکھنے والی باتیں بھی ملتی ہیں۔ لیکن ایسا ہونا ہی تھا کہ یہ انسانی نقطۂ نظر کے مطابق تحریف شدہ ہیں۔

لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حقیقی کلام کا مطالعہ کیا جائے، تو انکشاف ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جو سائنسی نظریات کو جھٹلائے۔ اس کے برعکس بہت سی آیات جدید سائنسی نظریوں کی تائید کرتی ہیں۔ اسی لیے جب نومسلم قرآن مجید کا مطالعہ کریں، تو یہ عقلی باتیں پڑھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں ایسی آیات قرآنی کو جمع کر دیا گیا ہے جو سائنسی نظریات و ایجادات سے متعلق ہیں۔

کتاب کے مصنف ڈاکٹر ہلوک نور باقی ایک ترک

www.pdfbooksfree.pk

دانشور ہیں۔ انھوں نے بڑی تحقیق اور محنت کے بعد ایسی آیات ڈھونڈ نکالیں جو مختلف سائنسی علوم مثلاً طبیعیات، ارضیات، ماحولیات، طب و صحت، فلکیات، کونیات، کمپیوٹر سائنس وغیرہ کے نظریات کی تشریح کرتی ہیں۔ کتاب عمدہ انداز میں طبع ہوئی ہے۔ قرآن اور سائنس کا تقابلی مطالعہ کرنے والے اسے پسندیدہ پائیں گے۔

نوید فکر

مصنفہ: افشاں نوید، ناشر: حریم ادب، پاکستان۔ ملنے کا پتا: ڈی/۲۵، بلاک ۵، ایف بی ایریا، فون: ۳۶۳۴۹۸۴۰، قیمت: درج نہیں۔

دنیائے انٹرنیٹ میں انونیمس (Anonymous) اس رضا کار کو کہتے ہیں جو اپنی شناخت پوشیدہ رکھ کر حق و انصاف کے لیے لڑے اور مظلوموں کا ساتھ دے۔ مشہور امریکی مصنفہ، ورجینیا وولف کا قول ہے: ''تاریخ میں بیشتر انونیمس انسان خواتین رہی ہیں۔'' یہ بات خواتین کی دلیری و اہمیت اجاگر کرتی ہے۔

بیسویں صدی میں اردو نثر کا غلغلہ بلند ہوا، تو برصغیر پاک و ہند میں بیشتر خواتین شاعری یا افسانہ کی سمت متوجہ ہوئیں۔ لیکن اب بہت سی خواتین اخبارات و رسائل میں سیاسی، معاشرتی و معاشی مسائل پر بھی عمدگی سے مضامین و کالم لکھ رہی ہیں۔ اس کی ایک مثال زیرتبصرہ کتاب ہے۔

محترم افشاں نوید ایم اے کرنے کے بعد درس و تدریس سے منسلک رہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، چناں چہ روزنامہ جسارت میں کالم لکھنے لگیں۔ قارئین نے ان کالموں کو پسند کیا جو اخلاقی و معاشرتی مسائل بخوبی اجاگر اور غور و فکر کے نئے در وا کرتے ہیں۔ ''نوید فکر'' انہی منتخب کالموں کا مجموعہ ہے۔

یہ کالم ادبی چاشنی لیے ہوئے ہیں اور معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ قاری کی اخلاقی تربیت بھی کرتے ہیں۔ پاک و منزہ نثر پسند کرنے والے مطالعے کے شوقین اسے معیاری کتاب پائیں گے۔ اس سادہ و پروقار کتاب کی پیش کش عمدہ ہے۔

تھر، پیاس اور پانی

مصنف: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، ناشر: علم و عرفان پبلی کیشنز، الحمد مارکیٹ، ۴۰، اردو بازار لاہور۔ فون:

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

۳۷۲۳۳۳۶، قیمت ۲۵۰ روپے۔

تھرپارکر دنیا کا واحد صحرا ہے جہاں سبزہ بھی پایا جاتا ہے۔ یہ زرخیزی وقتاً فوقتاً ہونے والی بارشوں کے سبب ہے۔ اسی لیے صحرا میں دس لاکھ سے زائد انسان بھی آباد ہیں جو مویشی پال کر یا کھیتی باڑی کے ذریعے گزر بسر کرتے ہیں۔ لیکن جب علاقے میں بارش نہ ہو اور قحط جنم لے، تو تھری قدرتی آفت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس سے بھوک، پیاس اور موت ان پر حملہ آور ہوتی اور ان کی زندگی اجیرن بنا ڈالتی ہے۔ افسوس کہ اس کٹھن گھڑی حکومت ان کی بہت کم مدد کرتی ہے۔ اسی باعث تھری سسک سسک کر زندگی گزارتے اور بمشکل جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھتے ہیں۔

مصیبت کے اس وقت فلاحی تنظیمیں اور انسان دوست افراد تھریوں کی مدد نہ کریں، تو ان بیچاروں کی حالت مزید خراب ہو جائے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ تھریوں میں تقریباً چار لاکھ ہندو ہیں۔ حکومت کو خصوصاً ان کی دیکھ بھال کرنا چاہیے تاکہ یہ وطن ملک ہمارے وطن کا منفی تاثر جنم نہ لے۔ مگر کارپردازنِ حکومت کو اس امر کی کوئی پروا نہیں۔

تھریوں کا دکھ درد بٹانے والے پاکستانیوں میں ڈاکٹر آصف محمود جاہ نمایاں ہیں۔ آپ کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ جیسے بھی بن پڑے، دکھی انسانیت کی خدمت کی جائے۔ لہٰذا وہ زیادہ بندوبست کیے بغیر کارِ خیر کرنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے اس محبوب بندے کو اسباب مہیا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مع ساتھیوں کے متاثرہ علاقوں میں غریب مرد و زن کا علاج کرنے کے علاوہ سامان خورونوش بھی تقسیم کرتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب تھرپارکر میں ڈاکٹر صاحب کے اسفار پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مع ٹیم ہندو مسلم کی تفریق کے بغیر بیماریوں کا علاج کیا اور ضرورت مندوں میں اشیا تقسیم کیں۔ ان اسفار کے دوران کئی یادگار واقعات پیش آئے جن کا ذکر کتاب کی وقعت بڑھاتا ہے۔ یہ تصنیف ہمیں تھر کی تاریخ، روزمرہ معاشرتی زندگی اور رسوم و رواج سے آگاہ کراتی ہے۔ پیش کش معیاری ہے اور چھپائی عمدہ۔ صحرائے تھر کی بودوباش اور باسیوں سے دلچسپی رکھنے والے اسے مفید کتاب پائیں گے۔

آب زم زم اور عجوہ کھجور سے علاج

تالیف: ڈاکٹر محمد اعظم رضا تبسم۔ ناشر: رحمانی ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، کمیٹی چوک، راولپنڈی۔ فون: ۵۵۵۱۵۱۹، قیمت: ۳۰۰ روپے۔

خوش نصیب پاکستانی جب بھی حرم شریف سے وطن

www.pdfbooksfree.pk

واپس آئیں، تو اپنے پیاروں کے لیے دو تحائف ضرور لاتے ہیں۔ اول آب زم زم اور دوم کھجوریں۔ یہ دونوں ایسے مقدس تحفے ہیں کہ ان کی برکت سے باہم محبت و الفت بڑھتی ہے اور حسد و کینے جاتے رہتے ہیں۔ اب ڈاکٹر محمد اعظم نے اپنی تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ یہ دونوں تحفے بہت سی طبی خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔

جناب محقق نے سب سے پہلے چشمہ زم زم کی تاریخ بیان فرمائی ہے جو بہت معلومات افروز ہے۔ بعدازاں اس آب کے سائنسی تجزیے سے ہم پر آشکارا کیا ہے کہ یہ مقدس پانی کس قسم کی معدنیات اور دیگر مفید غذائی اجزا رکھتا ہے۔ ڈاکٹروں نے اس آب پاک کو کئی بیماریوں میں شفا قرار دیا ہے۔

آب زم زم کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کھجور کے طبی فوائد کو موضوع تحقیق بنایا۔ کتاب میں ان مختلف نسخوں کا ذکر ہے جنھیں استعمال کرنے سے مختلف امراض جاتے رہے اور انسان کو صحت کاملہ ملتی ہے۔ کتاب عمدہ انداز میں طبع ہوئی ہے۔ قدرتی علاج پسند کرنے والے اسے مرغوب پائیں گے۔

تعلیم: مسائل و افکار

مصنف: ڈاکٹر سید جعفر احمد، ناشر: فکشن ہاؤس بک انٹرپرائز، ۳۹۔مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: ۳۷۲۳۷۴۳۰، قیمت: ۴۰۰ روپے۔

وسط ۲۰۱۳ء میں ایک نئے اخبار "جہان پاکستان" کی نیو پڑی جس کے تب مدیر اعلیٰ محمود شام تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر سید جعفر احمد سے درخواست کی کہ اس اخبار میں تعلیمی موضوعات میں سلسلہ مضامین شروع کیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد آمنا صادقا کہہ دیا۔ یوں انھوں نے مختلف علمی، ادبی، سیاسی و معاصر موضوعات پر مضامین پر قلم کیے جن کا انتخاب زیر تبصرہ کتاب کی شکل میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد جامعہ کراچی کے ادارے، پاکستان اسٹڈی سینٹر سے بہ حیثیت پروفیسر منسلک ہیں۔ پاکستانی سیاست پر تین کتابیں لکھنے کے علاوہ متعدد کتب مرتب کر چکے۔ علم و ادب اور قومی سیاست پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے آپ کے تحریر کردہ مضامین فکر انگیز،

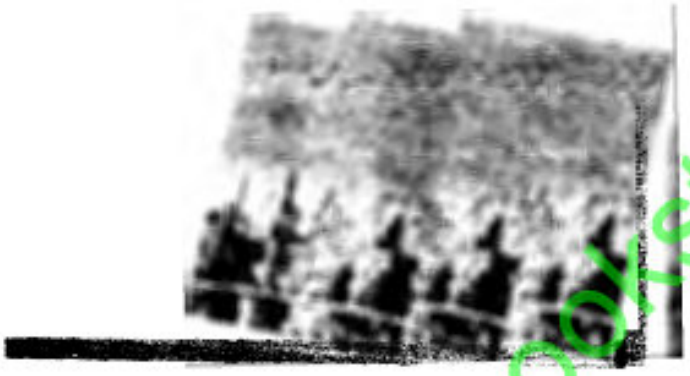

معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ انسان ان میں غور و فکر پر ابھارنے والے کئی موتی پاتا اور اپنے آپ کو شعور کی دولت سے مالا مال کرتا ہے۔

کتاب کا ایک حصہ "چراغوں کی روشنی" خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف علما، ادبا اور قومی راہنماؤں سے متعلق اپنی یادداشتیں لطف اور گیان کے انداز میں تحریر کی ہیں۔ یہ خاصے کی چیز ہیں۔ کتاب کی طباعت معیاری اور مجموعی پیش کش عمدہ ہے۔ سنجیدہ تحریریں پڑھنے والے اسے من پسند مجموعہ پائیں گے۔

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے لیے دلچسپ قصوں کا مجموعہ ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بہت کچھ سکھاتا اور زندگی کو بامقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔ دلچسپ معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو غور سے پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کی جائے گی اور دو خوش نصیبوں کو "اردو ڈائجسٹ" کے ۹ شماروں کی اعزازی ترسیل کے علاوہ منشورات کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتا: **مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ** ۳۲۵۔جی تھری جوہر ٹاؤن لاہور

ماہ جنوری میں دیے گئے قصہ کوئز کے صحیح جوابات

قصہ کوئز 1۔ (الف) امام بخاری، بخارا — (ب) صحیح بخاری

قصہ کوئز 2۔ (الف) ازبکستان، تاشقند — (ب) ۱۹۹۱ء

قصہ کوئز 3۔ (الف) استنبول — (ب) آیا صوفیہ، توپ کاپی

درست جوابات دینے والوں کے نام

طہٰ نعیم (حیدر آباد)، مرزا ہادی بیگ (حیدر آباد)، مدثرہ شکیل (دینہ)، حسن روحانی (اسلام آباد)، فیضان آزر (میرپور)، مرزا اسفار بیگ (حیدر آباد)، حاجی شوکت علی (اوکاڑہ)، حسن مظفر (راولپنڈی)، احبیب چان (واہ کینٹ)، پرویز اختر (ہری پور)، خواجہ عنایت (پشاور)، محمد الیاس (منڈی بہاؤالدین)، عصمت اللہ ساجد (واہ کینٹ)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ (لاہور)، اویس شیخ (ٹوبہ ٹیک سنگھ)، حماد انور (راولپنڈی)، محمود منور خان (سرگودھا)، محمد بلال حسن جنجوعہ (سرگودھا)، محمد تنزیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد شکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد مبشر عباس جنجوعہ (سرگودھا)، حمزہ شمشاد خان (سرگودھا)، نصیر احمد انصاری (حیدر آباد)، عبدالنعیم انصاری (حیدر آباد)، محمد احمد (کراچی)، ولی حسین (حیدر آباد)، میر محمد اقبال (جڑانوالہ)، محمد داؤد (جڑانوالہ)، شائل حبیب (کراچی)، میاں محمد اویس مظہر (لاہور)، نائلہ کوکب (لاہور)، کمانڈر (ر) محمد سلیمان (اٹک)، محمد حمزہ قادری (حیدر آباد)، ملک ساجد ممتاز (چکوال)، اویس حبیب (فیصل آباد)، شمیم وحید (فیصل آباد)، محمد حبیب (فیصل آباد)، محسن حبیب (فیصل آباد)، فواد بشیر (ڈیرہ غازی خان)

انچارج کوئز: غلام سجاد

دلچسپ معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- نائلہ کوکب (لاہور)
- فواد بشیر (ڈیرہ غازی خان)

نوٹ: تمام قارئین اپنا مکمل نام و پتا اور موبائل یا پی ٹی سی ایل نمبر لکھنا ہرگز نہ بھولیں۔ اس کے بغیر کوریئر سروس کا نمائندہ آپ تک نہیں پہنچ پاتا۔ (ایڈیٹر)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

قصہ کوئز 1

ابوالاعلیٰ مودودیؒ مفسرِ قرآن، عالم دین، جماعت اسلامی کے مؤسس۔ اورنگ آباد، دکن میں پیدا ہوئے، باضابطہ تعلیم صرف میٹرک تک تھی، لیکن خداداد ذہانت اور اپنی ذاتی محنت اور لگن سے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں اتنی استعداد حاصل کر لی کہ اب ان کی اپنی تصانیف کے تراجم ان زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ صحافتی زندگی کا آغاز سترہ برس کی عمر میں اخبار "مدینہ" سے کیا۔ پھر تاج (جبل پور) اور ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء جمعیت العلمائے ہند کے اخبار "مسلم" کے مدیر رہے۔ ۱۹۲۸ء میں "الجمعیت" کی ادارت ترک کی اور حیدرآباد دکن چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں "ماہنامہ ترجمان القرآن" جاری کیا جو آج تک جاری ہے۔ ان کی تصنیف الجہاد فی الاسلام اور رسالہ "دینیات" نے مولانا صاحب کو بہت جلد پورے ہندوستان میں متعارف کرا دیا۔

(الف) ان کی تاریخ وفات بتائیں اور قبر کہاں واقع ہے؟

(ب) ان کی کوئی سی دو تصانیف کے نام بتائیں؟

قصہ کوئز 2

شاعر، افسانہ نگار، مدیر ۲۰ جون ۱۹۱۶ء کو موضع ونگہ ضلع خوشاب میں پیدا ہوئے۔ خاندانی نام احمد شاہ اور والد کا نام پیر غلام نبی تھا لیکن "چن پیر" کے نام سے معروف تھے۔ قرآن مجید کی تعلیم اپنے گاؤں کی مسجد میں حاصل کی۔ میٹرک ۱۹۳۱ء میں شیخوپورہ سے اور بی اے ۱۹۳۵ء میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور سے کیا۔ ۱۹۳۹ء میں ملتان کے ایکسائز آفس میں سب انسپکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۲ء میں مستعفی ہو کر دارالاشاعت پنجاب لاہور سے وابستہ ہو گئے اور یوں ہفت روزہ "پھول" اور "تہذیب نسواں" کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۴۴ء میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "بو" ادب لطیف میں شائع کرنے پر مقدمہ چلا، مگر بری ہو گئے۔ آپ کی شاعری کے نو مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔

(الف) کن صاحب کا ذکر ہے۔ نام بتائیں اور ان کی کوئی سی دو شاعری کتب کا نام بھی بتائیں؟

(ب) ان کو ملنے والے میڈلز میں سے دو کے نام بتائیں؟

قصہ کوئز 3

پاکستان کی پہلی نجی یونیورسٹی، حکومت پاکستان نے ۱۶ مارچ ۱۹۸۳ء کو منظوری دی۔ باقاعدہ افتتاح ۱۹۸۵ء میں ہوا۔ اس یونیورسٹی کا مقصد نئے سائنسی علوم کا فروغ اور ترقی پذیر ممالک کو پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے انسانی وسائل کی ترقی ہے۔ یونیورسٹی کی پہلی فیکلٹی طب ہے، چناں چہ طبی خدمات کی تنظیم یوں کی گئی ہے کہ ایک میڈیکل کالج قائم کیا گیا ہے اور ایک نرسنگ اسکول۔ کالج کا بنیادی مقصد ڈاکٹروں اور نرسوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ فی الحال ایم بی اور بی ایس کے پانچ سالہ نصاب کے مطابق تعلیم و تربیت کا منصوبہ چل رہا ہے۔ یونیورسٹی کیمپس میں ایک اسپتال بھی قائم کیا گیا ہے جس کا الحاق ایک معاہدے کے تحت یونیورسٹی سے ہو چکا ہے مگر اس کا نظم و نسق جداگانہ مجلس کے سپرد ہے۔

(الف) کون سی یونیورسٹی کا تذکرہ ہے یہ کون سے شہر میں واقع ہے؟

(ب) یہ یونیورسٹی کب اور کس کے دور حکومت میں قائم ہوئی؟

انعامات کے لیے تعاون

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور
042-35434909
042-35425356

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

''ژ'' کے الفاظ

اردو لغت کے مطابق ''ژ'' ہمارے حروفِ تہجی کا پندرھواں حرف ہے۔ یہ حرف ثقیل ہے، یعنی دیگر حروف کے ساتھ مل کر لفظ بناتا ہے۔ گویا اس حرف سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔ میں نے ''ژ'' سے شروع ہونے والے دو الفاظ دریافت کر لیے ہیں۔

پہلا لفظ ''ژشان'' ہے۔ اس لفظ کے معنی ہیں: جالی دار پتا یا پتی۔ دوسرا لفظ ''ژشفہ'' ہے۔ اس کا مطلب ہے: جالی دار نمونہ۔ یہ دونوں الفاظ فارسی اصل رکھتے ہیں۔

''ژ'' کے ان الفاظ کو مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات پاکستان، انجمن ترقی اردو پاکستان اور اردو لغت بورڈ کراچی نے تسلیم کر لیا ہے۔ اس لیے لغت نگاروں سے اپیل ہے کہ وہ اردو لغت مرتب کرتے ہوئے ''ژ'' کے درج بالا الفاظ ضرور شامل کریں۔ میں نے یہ الفاظ نو سال تحقیق کے بعد دریافت کیے ہیں۔

(عبدالعلیم خان، نارتھ ناظم آباد، کراچی)

نسرین جلیل کا انٹرویو

میرے گھر اردو ڈائجسٹ باقاعدگی سے آتا اور تمام افراد شوق سے پڑھتے ہیں۔ کل جب میں نے شمارہ دسمبر ۲۰۱۴ء کا سرورق دیکھا تو میرے اندر غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ یہ اسی تنظیم کی نمائندہ خاتون ہیں جنھوں نے میرا بہترین اوصاف والا بھائی چھین لیا۔ سعد بن ضیا شہید اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم کارکن

www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ انھیں اس تنظیم کے غنڈوں نے بدترین تشدد کر کے شہید کیا۔ یہ واقعہ جب رونما ہوا میں دنیا میں نہیں آئی تھی۔ امی اور خاندان کے دیگر افراد نے سعد بھائی کے بارے میں مجھے جو باتیں بتائی، ان کے باعث میں روحانی طور پر شہید سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ آپ بے شک نسرین جلیل صاحبہ کا انٹرویو شائع کرتے، مگر سرورق پر تصویر شائع کر کے آپ نے مجھ سمیت ان تمام لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جن کے گھروں کے چراغ غنڈوں نے گل کیے ہیں۔

(مریم فاروق، کراچی)

شمارہ دسمبر ۲۰۱۴ء کے سرورق پر نظر پڑتے ہی دل کی حالت عجیب ہوگئی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنے ۲۲ سالہ شہید بھائی یاد آگئے جنھیں ایم کیو ایم نے ۱۹۹۵ء میں بے تحاشا تشدد کے بعد شہید کر دیا تھا۔ وہ شاندار تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ انجینئر بن کر ابھی برسرروزگار ہوا تھا۔ نجانے کتنے قارئین کو اپنے پیارے یاد آگئے ہوں گے۔ کراچی کے چپے چپے پر ان کی جانب سے برپا ظلم کی داستانوں میں سے ایک مثال یہ ہے: جب ایک بار ان کی طرف سے ہڑتال کی کال آئی، تو ایک چائے پراٹھے والے نے دکان کھولنے میں دیر لگا دی۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں گرم توے پر چھاپ کر اسے معذور کر دیا گیا۔ (توقیر عائشہ، کراچی)

شیائیکا کا مرض

شمارہ دسمبر میں محترمہ صبا شفیق نے شیائیکا (عرق نسا) کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے کہ چونکہ اس درد میں زیادہ تر خواتین مبتلا ہوتی ہیں، اسی لیے اسے عرق النسا کہا گیا۔ لیکن محترمہ کو غلط فہمی ہوئی۔ ''عرق النسا'' میں حرف نون پر زبر ہے، اسے نسا پڑھا جاتا ہے نسا نہیں۔ نسا ''نس'' کی جمع ہے۔ چونکہ اس درد کا تعلق انسانی جسم کی نسوں سے ہے۔ اس لیے اسے عرق النسا کہا گیا۔ امید ہے، محترمہ اپنے تحقیقی ماخذات میں بھی مناسب تبدیلی کر لیں گی۔ (نسیم حر، راولپنڈی)

گھریلو تشدد کی روک تھام

صوبہ بلوچستان میں گھریلو تشدد کی روک تھام اور تحفظ کا قانون مجریہ ۲۰۱۴ء (The Balochistan Domestic Violence Prevention and Protection Act, 2014) نافذ کر دیا گیا ہے۔ مذکورہ قانون کا مقصد آئین کے مطابق شہریوں کے بنیادی حقوق کی فراہمی کو یقینی بنانا اور خواتین و بچوں کو گھریلو تشدد اور دیگر معاملات سے تحفظ فراہم کرنا ہے۔ متذکرہ قانون ماسوائے قبائلی علاقوں کے صوبہ بلوچستان میں نافذ کیا گیا ہے تاکہ گھریلو تشدد کا مؤثر تدارک ہو اور مجرم کو قرار واقعی سزا دی جا سکے۔

(قاسم اسلم منہاس، قانون و انسانی حقوق کمیشن پاکستان، اسلام آباد)

قومی المیہ

پاکستانی قوم کا ایک بڑا المیہ یہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد کوئی مخلص اہل اور دیانت دار راہنما میسر نہیں آیا۔ اگر ان کے جانشین بھی بے لوث ثابت ہوتے تو پاکستان آج ترقی یافتہ اور خوشحال ملک ہوتا۔ اب عالم یہ ہے کہ اردو زبان سے

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

سونیلوں جیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ افسوس۔

(سید مختار حسین کاظمی، سیدانوالہ، ضلع جہلم)

اتحاد کی ضرورت

یورپ میں یہود و نصاریٰ نے بھائی چارہ کر لیا ہے۔ اپنے اپنے ملک میں وہ آزادی سے سڑکوں پر چلتے پھرتے اور کام کاج کرتے ہیں۔ ان کے ممالک میں ہر طرف امن و سکون ہے۔ لیکن ہم مسلمان یورپی دنیا میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے ہیں۔ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی گھروں میں محصور ہو چکے۔ ہم اتنے فرقوں میں بٹ چکے کہ اب وہ گنے بھی نہیں جاتے۔ اس خانہ جنگی کا انجام کیا ہوگا؟

(نگہت چودھری، فرینکفرٹ، جرمنی)

راشدہ علوی کی آپ بیتی

شمارہ جنوری اور فروری میں محترمہ راشدہ علوی کی قسط وار آپ بیتی زیر مطالعہ رہی۔ زبان کے اعتبار سے پسند آئی۔ تعجب ہوا، ایک خاتون جو پیدائشی پنجابی ہے اور لندن میں قیام پذیر اتنی بامحاورہ اردو کیسے لکھ سکتی ہیں؟ میں آگرہ کا رہنے والا ہوں۔ ۲۹ سال کی عمر میں پاکستان آیا۔ اردو سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ میں نے آپ بیتی میں ایک بھی غلطی نہیں پائی۔ میری طرف سے انھیں مبارک باد پیش کر دیجیے۔

(عبدالصمد قریشی، کراچی)

☆☆☆

میرا دوست..... اردو ڈائجسٹ

میں ایک خاتون خانہ ہوں۔ تین عدد چھوٹے بچوں کے ساتھ مصروف رہتی ہوں۔ پھر بھی آپ کا یہ رسالہ پڑھنے کے لیے ضرور وقت نکال لیتی ہوں۔ سب ملنے والوں کو اردو ڈائجسٹ کے متعلق بتا کر اس کی تشہیر کرتی ہوں۔ دلچسپ بات یہ کہ جب سب گھر والوں کی ٹی وی پر چینل بدلنے پر جنگ ہو، تو میں اس منظر سے صاف غائب ہو جاتی ہوں۔ ٹی وی پروگراموں میں اب وہ دلچسپی نہیں رہی، وجہ صاف ظاہر ہے، میرے بستر کے سرہانے اردو ڈائجسٹ میرا منتظر ہوتا ہے۔ لمبے سفر پر نکلوں یا کہیں انتظار کرنا پڑے، تو بھی ہینڈ بیگ سے درآمد ہو جاتا ہے۔ یہ میرا تنہائی کا دوست بن گیا ہے۔

خدا آپ کے رسالے کو ترقی دے اور آپ کی کوشش میں آسانیاں پیدا کرے۔ اسلامی تاریخ کے حوالے سے مضامین بہت اچھے ہوتے ہیں۔ کہانیاں بھی عام رسالوں سے ہٹ کر ہوتی ہیں۔

(مسز عنبر جہاں، شبیر لائن، حیدرآباد کینٹ

☆☆☆

معروف صحافی کی وفات

ماہ جنوری کے شمارے میں مشہور شاعر، مجید امجد پر ایک مضمون شائع ہوا۔ اسے میرے بچپن کے دوست، بشیر اصغر چودھری نے تحریر کیا۔ وہ طویل عرصہ روزنامہ نوائے وقت، ملتان سے وابستہ رہے۔ پچھلے سال ریٹائر ہو کر اپنے وطن ساہیوال چلے آئے۔ افسوس کہ ۲ جنوری کو بڑھاپے کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم اردو

نوٹ

قارئین کرام بذریعہ ای میل بھی اپنی آرا اور تجاویز بھیج سکتے ہیں۔ قارئین کے تبصروں سے ہمیں رسالے کا معیار بڑھانے اور بہتری لانے میں مدد ملتی ہے۔ ہمارا ای میل پتا یہ ہے:

editor@urdu-digest.com

(ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk

ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری تھے۔

(چودھری بشیر انور، رحیم یار خان)

☆☆

قرآن پڑھیے اور پڑھائیے

اس وقت امت مسلمہ دین کے میدان میں بہت پیچھے ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت مسلمہ کو دین کا علم دیا جائے۔ اسی سلسلے میں ہر منگل کے دن تین تا چار بجے بعداز دوپہر درس قرآن کا اہتمام شمس آڈیٹوریم، یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز نزد شیخ زید اسپتال، لاہور میں ہوتا ہے۔ اس میں عالم اسلام کی چار مایہ ناز یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ڈاکٹر پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ (ایسوسی ایٹ پروفیسر یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی) درس قرآن دیتے ہیں۔ سبھی قارئین کو شرکت کی دعوت عام ہے۔

(محمد طاہر فاروقی، ناظم قرآن ہاؤس سوسائٹی، لاہور)

حوصلہ بڑھانے والے سندیسے

شمارہ دسمبر کو معیاری اور دلچسپ تحریروں والا پایا۔ نسرین جلیل صاحبہ کا انٹرویو معلومات افروز تھا۔ ''مشورہ حاضر ہے'' کی کمی محسوس ہوئی ہے۔ اسلامی تاریخ سے متعلق تحریریں شائع کیجیے۔ ماضی کے اسپورٹس ہیروؤں پر بھی لکھیے۔

(محمد اویس دانش خان، سرگودھا)

☆☆

شمارہ نومبر میں ''بھائی جی'' کے ذریعے گل حسن مرحوم کے حالات زندگی پڑھے۔ دل کی گداز کیفیت ہو گئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آپا صغیرہ کی وفات پہ بھی بہت افسوس ہوا۔ ان کے مشورے پڑھ کر احساس ہوتا کہ دادی اماں زندگی گزارنے کے گر سکھلا رہی ہیں۔ (نبیہ ثقلین، میانوالی)

☆☆

اردو ڈائجسٹ میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے۔ اس میں ہر موضوع پر مضامین میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ شمارہ جنوری بہت پسند آیا۔ خاص کر سابق چیف جسٹس، سعید الزماں صدیقی کا انٹرویو خوب تھا۔ دیگر تحریریں بھی دل کو بھا گئیں۔

(محمود منور خان، کوٹ سنبلانوالہ، تحصیل بھیرہ)

☆☆

میں اردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ اس میں اسلام اور پاکستان سے محبت پیدا کرنے والی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ یہ رسالہ مجھے بہت پسند ہے۔

(اختر جمال، اچھرہ، لاہور)

☆☆

شمارہ جنوری کا سرورق دل کو بہت بھایا۔ انٹرویو کا سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ ''لندن میں کیا گزری'' آپ بیتی نے مزہ دوبالا کر دیا۔ رسالہ معلومات سے بھرپور تھا۔ کہانیاں زیادہ شائع کیجیے۔

(اویس شیخ، نوبہ ٹیک سنگھ)

☆☆

صغیرہ بانو شیریں کے انتقال پر دکھ ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حکیم عبدالوحید سلیمانی ''مشورہ حاضر ہے'' لکھ سکیں؟ یوں یہ فلاحی سلسلہ جاری رہے گا۔

(ظفر نیازی، کوئٹہ)

☆☆

میں اردو ڈائجسٹ کا نسودِ اولین سے قاری ہوں۔ الحمد للہ پچھترویں سال میں قدم رنجہ فرما چکا۔ اونچ نیچ اور نشیب و فراز کے علی الرغم اردو ڈائجسٹ نے ہماری فکری توانائی اور تعمیری خیال آرائی میں ہر اعتبار سے

www.pdfbooksfree.pk

گراں قدر حصہ ڈالا ہے۔

(سید ریاض حسین زیدی، صدارتی سیرت ایوارڈ یافتہ، ساہیوال)

☆☆☆

اردو ڈائجسٹ کے انٹرویو عمدہ ہوتے ہیں۔ مجھے یہ رسالہ بہت پسند ہے۔ (ناظم بلیغ الرحمان، بہاولپور)

☆☆☆

ماہ جنوری کا شمارہ پسند آیا۔ ممکن ہو تو ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کی آپ بیتی دوبارہ شروع کیجیے۔ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ بزرگوں کے تجربات ہمارے لیے مشعل راہ ہوتے ہیں۔ (محمد خلیل چودھری، دینہ)

☆☆☆

اردو ڈائجسٹ ادبی دنیا کا مقبول رسالہ ہے۔ یہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

(سید جاوید، ایبٹ آباد)

☆☆☆

ہر ماہ باقاعدگی سے ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتا ہوں۔ حقیقتاً معلومات کا خزانہ ہے اور تحریریں دلچسپ ہوتی ہیں۔ (محمد خلیل حجازی، ٹوبہ ٹیک سنگھ والے، تحصیل جہلم)

گوشۂ سوشل میڈیا

☆ میں ایک مصنف ہوں اور اردو ڈائجسٹ میں اپنی تحاریر شائع کرانا چاہتا ہوں۔ کیا آپ اس میں میری مدد کریں گے۔ (سید علی شاہ)

(جی ضرور، بسم اللہ کیجیے۔ آپ اپنی تحریریں اردو ڈائجسٹ کے دفتر بھجوا دیجیے)

☆ السلام علیکم دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اردو ڈائجسٹ کو ہمیشہ آباد رکھے۔ پوچھنا یہ تھا کہ اردو ڈائجسٹ کے پرانے شمارے آپ سے مل سکتے ہیں؟ (بلال اصغر)

(جی بلال اصغر، آپ کو گزشتہ تین سال تک کے شمارے مل سکتے ہیں۔ اس نمبر پر رابطہ کریں: 0300-4005579)

☆ میں اردو ڈائجسٹ کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ میں جناب الطاف حسن قریشی، خالد محی الدین، سید عاصم محمود کی تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔ (راشد عامر)

☆ میں اردو ڈائجسٹ کا ہر ماہ شروع سے آخر تک مطالعہ کرتا ہوں۔ مجھے اس میں آئی ٹی کے حوالے سے تحریریں کم نظر آتی ہیں۔ اگر آپ آئی ٹی کا سلسلہ شروع کریں، تو مجھ جیسے بہت سوں کا فائدہ ہوگا۔

(حمزہ خان وانی)

(وقتاً فوقتاً ہم آئی ٹی پر بھی مواد شائع کرتے رہتے ہیں۔ مزید کوشش کریں گے کہ اس پر زیادہ شائع کریں۔)

☆ سر جی! آپ کا پیج لائک کرنے کے باوجود آدھی پوسٹ ہی پڑھی جاتی ہیں، باقی غائب ہوتی ہیں۔ (شیخ منیب)

(شیخ صاحب! ہم تو مکمل سلامت اور پوری پوسٹ شیئر کرتے ہیں۔ آپ ذرا اپنا انٹرنیٹ چیک کریں، وہ آدھی پوسٹ ہضم کر رہا ہے۔)

☆ آج سے کوئی پانچ چھے سال پہلے آپ نے نعتیں اور منقبتیں شائع کی تھیں۔ کیا وہ مجھے بھیج سکتے ہیں۔

(زینب عبداللہ)

(آپ سال اور مہینا بتا دیں، تو پھر ہم آپ کی کچھ مدد کر سکتے ہیں۔)

☆ میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) میں اردو ڈائجسٹ کیسے حاصل کر سکتا ہوں؟ (محمد اویس)

(وہاں کے بک اسٹال سے رجوع کریں یا ہمیں اپنا ایڈریس بھیجیں، ہم آپ کو بذریعہ وی پی بھیج دیں گے۔)

◆◆◆

http://www.bookstube.net/
http://www.urdutube.net/
www.pdfbooksfree.pk
Copyrighted material